مگو کہ نشۂ صہبا برفت با ساقی
بگو کہ سیرتِ اقبال دولتِ باقی

۱۳۵۶ھ

سیرتِ اقبال

مصنّفہ
محمد طاہر فاروقی ایم اے
لیکچرار شعبہ اُردو۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

ناشر
قومی کتب خانہ۔ لاہور

طبعِ اوّل جنوری ۱۹۳۹ء
طبعِ دوم جون ۱۹۴۴ء
طبعِ سوم ستمبر ۱۹۴۹ء

قیمت
ساڑھے چھ روپے

شیخ محمد نصیر ہمایوں نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں
باہتمام شیخ امین الدین چھپوا کر قومی کتب خانہ لاہور
سے شائع کیا۔

سرکارِ دوعالمؐ
کی
بارگاہ میں

اے وجودِ تو جہاں را نوبہار — پرتوِ خود را دریغ از من مدار

"خود بدانی قدرِ تن از جاں بود (رومی) قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود"

تا ز غیر اللہ نہ دارم ہیچ اُمید — یا مرا شمشیر گرداں یا کلید

فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چُست — تخمِ کردارے ز خاکِ من نرُست

تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من — محنتے دارم فزوں از کوہکن

مومنم از خویشتن کافر نیم
برفسانم زن کہ بد گوہر نیم

اقبالؒ

فہرست مضامین

حامداً و مصلیاً

تعارف

(طبع دوم)

[illegible] اقبال رحمۃ اللہ علیہ ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ علامہ سید جمال الدین افغانی اور علامہ مفتی محمد عبدہٗ رحمۃ اللہ علیہما کے بعد اقبال ہی واحد شخص تھے جنہوں نے عالمِ مشرق کو بیدار کرنے اور انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کے لئے آواز بلند کی۔ اقبال کی موت مشرق کے لئے اس صدی کا سب سے بڑا ناقابلِ تلافی حادثہ ہے، اور یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ؎

فما کان قیسٌ ھلکہٗ ھلکُ واحدٍ
ولٰکنّہٗ بنیانُ قومٍ تھدّما

مگر علامہ کی تصنیفات ان کی الہامی شاعری اور انقلابی پیغام کی مکمل طور پر آئینہ دار ہیں، اور قوم و ملت پر فرض ہے کہ ان تعلیمات سے کما حقہٗ بہرہ مند ہو کر صراط مستقیم پر گامزن ہو۔ اب تک کوئی ایسی تصنیف شائع نہیں ہوئی جسے پڑھ کر علامہ کی تعلیمات کا خاکہ ذہن میں آجائے، اور جو قارئین کو اقبال کی کتابوں کے مطالعہ کی جانب رہنمائی کر سکے۔ میں نے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر "سیرتِ اقبال" لکھی تھی، اور ہر کلیہ و نظریہ کی بابت علامہ کی تصنیفات سے کافی و شافی اسناد و شواہد پیش کئے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ اقبال اور اقبال کی تصنیفات پر ابھی اور بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے، اِس لئے یہ کتاب جامعیت و خاتمیت کی دعوے دار نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے اقبال کے پیغام کو سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اور قارئین کو اندازہ ہو سکے گا کہ علامہ کا تخیل جس انداز سے پیش کیا ہے۔ اِس سے بہت سے شکوک اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا، اور اقبال اپنے اصل خط و خال کے ساتھ ناظرین کے سامنے آ جائیں گے۔

مَیں شکرگزار ہوں جناب پروفیسر عبدالباسط صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ (سابق پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاہور) کا کہ اُنھوں نے میری فرمائش پر علامہ مرحوم کی بابت مفید اور دلچسپ معلومات عطا کیں۔

مَیں نے "سیرتِ اقبال" میں ہر جگہ علامہ کی فارسی اور اُردو دونوں تصنیفات سے مثالیں پیش کی ہیں۔ اِس سلسلہ میں یہ کہنا ضروری ہے کہ توحید اور عمل کے عنوانات ایک سے زائد جگہ پر نظر آئیں گے۔ لیکن ان عنوانات کے ماتحت مضمون اور اشعار سب جُدا ہوں گے۔ البتہ علیحدہ مقامات پر پڑھنے کے بعد پھر ان عنوانات کو ملا کر پڑھا جائے تو اَور زیادہ لُطف اور فائدہ ہوگا۔

جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب (اسلامیہ کالج لاہور) کا مَیں بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے ازراہِ قدر دانی اس کتاب پر دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ اِسی طرح مَیں جناب محمد نصیر صاحب ہمایوں بی اے، پروپرائٹر قومی کتب خانہ لاہور اور جناب محمد احسن صاحب منیجر قومی کتب خانہ کا نہایت شکرگزار ہوں کہ ان حضرات نے اس کتاب کی اشاعت کا بار برداشت کیا ہے۔

"سیرتِ اقبال" جنوری ۱۹۳۹ء میں پہلی بار قارئین کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ گزشتہ چھ ماہ سے پہلا ایڈیشن ختم ہے۔ میری بعض مجبوریوں کے باعث طبع ثانی کی اشاعت میں کافی تعویق ہوگئی، جس کا میں ناشرین اور شائقین سے یکساں عذر خواہ ہوں۔ میں نے اس دوسرے ایڈیشن میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کیا ہے اور اُمید ہے کہ یہ کتاب اب پہلے سے بھی زیادہ قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

دفتر جامعہ اردو آگرہ
یکم جنوری ۱۹۴۷ء

محمد طاہر فاروقی

طبعِ سوم

دو سال ہونے آتے ہیں کہ محترمی محمد احسن صاحب نے مجھے توجہ دلائی تھی کہ طبعِ دوم ختم ہے۔ مگر طبعِ سوم کے لئے نظرِ ثانی کرنے کی آج تک نوبت نہ آئی۔ سیاسی انقلاب، ذاتی تفکرات اور بے اطمینانی کے باعث کام مکمل نہ کر سکا جس پر متاسف ہوں۔ اس تیسرے ایڈیشن میں اور بھی بہت زیادہ اضافے کیے گئے ہیں۔ خدا کرے یہ تاخیر درست آید کی مصداق سمجھی جائے۔

پشاور
۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء

فاروقی

دیباچہ

دُنیا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی باب ایسا ہو گا جو کسی مٹی ہوئی ملت کے دوبارہ عروج کی داستان سُناتا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی طرح اقوام کو بھی ایک ہی دفعہ زندگی ملتی ہے۔ لیکن تباہ ہو جانے والی قوموں میں بھی بہ لحاظ بربادی فرقِ مدارج ہے۔ بعض تو قدیم یونانیوں اور بابلیوں کی طرح یوں نابود ہوئیں، کہ اُن کا سُراغ اب صرف تاریخ دان کے حافظے ہی میں مل سکتا ہے لیکن بعض دوسری موت و حیات کے اُس درمیانی برزخ میں معلق ہو گئیں۔ جہاں اگرچہ وُہ عملاً مُردہ ہیں مگر اُن کے احیاءِ ثانی کا کم از کم منطقی امکان ضرور موجود ہے۔ اسی زُمرے میں بدنصیب ہندوستان کی بسنے والی دونوں قوموں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کا شمار ہے۔ اِس قسم کی نیم مُردہ اقوام میں زندگی کی طرف عود کرنے کا ایک اُمید افزا اشارہ یہ ہے کہ وُہ اپنے ذی مرتبت اکابر کی تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اُن کی قدر و منزلت کا صحیح معیار قائم کرنے کے لئے مضطرب ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصے سے ہماری قوم میں حرکت کے جو آثار پیدا ہو رہے ہیں، ان کا ایک ثبوت اس وقت ملا جب علامہ اقبال رحہ کی وفات پر ہر چہار جانب نہ صرف رنج و غم کی لہر دوڑ گئی بلکہ اُن کے افادات سے کامل واقفیت

حاصل کرنے کا شوق انتہا کو پہنچ گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی کی سعیِ بلیغ جو اس کتاب کی شکل میں ملک کے سامنے آرہی ہے علاّمہ مغفور کی وفات کے بعد اس سلسلے میں پہلی کوشش ہے[1]۔ اس قسم کی تمام کوششیں اس لحاظ سے بھی بہت مبارک ہیں کہ ایسے عظیم الشان شاعر اور حکیمِ اُمّت کی تعلیمات کی شرح کرکے جمہورِ ملک کو ان سے روشناس کرانا دوسرے لفظوں میں قوم کو زندگی اور اقبال وسعادت کی منزل کی طرف دعوت دینا ہے۔

لیکن اس افادی پہلو کے اعتبار سے اقبال کے کلام کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو اس کو تمام دوسرے شعرا سے ممتاز کردیتی ہے۔ بلادِ مشرق میں شاعری کو پیغمبری سے جو روایتی نسبت حاصل رہی ہے اُس کا مظہرِ اتم ہندوستان میں یقیناً علاّمہ اقبال کی ذاتِ گرامی صفات تھی۔ پیغمبر محض شعائرِ اخلاق کا قائم کرنے والا ہی نہیں بلکہ انسان کی تمام حیاتِ عمرانی کا مؤسّس ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی جامع شریعت کا حامل ہے تو قوم کی زندگی کے ہر شعبے کے لئے اس کے احکام موجود ہونے چاہئیں۔ اقبال کی حکمتِ اسلامیہ کا امتیاز یہی ہے کہ وہ تمام قومی و معاشرتی اداروں کو محیط ہے۔ اقبال کا قول قرآنِ کریم کے قائم کئے ہوئے نظامِ حیات کی تفسیر اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کی والہانہ ترجمانی ہے۔ گرامی مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

---

[1] سیرتِ اقبال کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا تھا۔ ناشر

اقبالؔ کا کلام بہ اعتبارِ شاعری قرنِ اوّل کے بہترین محرّکات و عوامل کا گنجینہ دار، اور بہ لحاظِ پیغمبری ہماری آنے والی زندگی کی شاہراہوں پر چمکنے والا نورِ حقیقت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نیم مُردہ قوم کی رگوں میں ایک مدّت کے بعد اقبالؔ کی آتش نفسی نے خونِ حیات دوڑایا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ بہت ضروری ہے کہ اقبالؔ کی محض فنّی حیثیّت پر بحث کرنے کے بجائے اُس کی پیغمبرانہ صفت کو اَور زیادہ نمایاں کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم اقبالؔ کو صحیح جذب و شوق سے پڑھیں، تو اُس کی فنّی آرائشیں خود بخود نظر انداز ہونے لگتی ہیں اور اُس کا پیغمبرانہ اضطراب ہماری توجّہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اقبالؔ کا متن پیغمبری اور حاشیہ شاعری ہے۔ ہم اُسے داؤدؑ و سلیمانؑ کا شریکِ محفل نہیں دیکھتے وہ موسیٰ عمرانؑ کی وادی میں ایک شعلۂ نور کا تعاقب کرتا نظر آتا ہے۔

پچھلے دنوں اقبالؔ کی وفات کے بعد اخبارات میں بعض ایسے خطوط شائع ہوئے جو معاصرین نے مختلف موقعوں پر اقبالؔ کو لکھے تھے۔ ان میں سے ایک خط ایک بہت اُونچے پایہ کے بزرگ کی طرف سے تھا۔ یہ خط اقبالؔ کے کلام کی تحسین سے لبریز تھا۔ لیکن اس تحسین کا بیشتر حصّہ اقبالؔ کے حُسنِ تراکیب اور نُدرتِ تشبیہات پر آفرین کہنے میں صرف ہوا تھا۔ اُن قابلِ احترام بزرگ کا مرتبہ مجھ جیسے عقیدت مندوں کی نظر سے بہت بلند ہے، لیکن بایں ہمہ مجھے اُن کے اس نقطۂ نگاہ کو دیکھ کر افسوس ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت اُنہوں نے وہ خط لکھا کم از کم اُس وقت اُن کے ذہن میں اسلام اور مشرق کے لئے اقبالؔ کی قدر و قیمت کا کوئی صحیح تصوّر نہیں تھا۔

بہ خوں آلودہ دست و تیغِ غازی ماندہ تحسیں
تو اوّل زیب اسپ و زینتِ برگستواں بینی!

یہی وجہ ہے کہ جب مجھے سیرتِ اقبال کا مسودہ دیکھنے کا موقع دیا گیا، تو جس بات سے مجھے خاص مسرت ہوئی وہ یہ تھی کہ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی نے اقبال کے کلام کی نبض پہچانی ہے اور ٹھیک اُس جگہ ہاتھ رکھا ہے جہاں ایک صاحب ذوق اور سخن فہم شارح کو رکھنا چاہئے تھا۔ پروفیسر صاحب نے "اقبال بحیثیت انسان" اور "اقبال بحیثیت شاعر" دونوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جو اقبال کے ایک جامع سیرت نگار کے لئے یقیناً ضروری تھا۔ لیکن کتاب کا بیشتر حصہ اقبال کی تعلیم کی سلجھی ہوئی اور شستہ تشریحات پر مشتمل ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فاضل مصنف نے اقبال کو بالکل اسی طرح سمجھا ہے جس طرح سمجھنے کا حق تھا، خود اقبال کو بھی اسی طرح سمجھے جانے کی تمنّا تھی ؎

"جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟"

اقبال کو سمجھنا اگر مشکل ہے تو سمجھانا اُس سے زیادہ مشکل۔ مگر حق یہ ہے کہ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی نے اِس منزل پر اپنی قدرتِ بیان اور قوتِ اظہارِ مطالب کے جو شواہد پیش کئے ہیں اُن کو دیکھ کر پروفیسر صاحب کے فہم سلیم اور کمالِ انشا دونوں کا یکساں معترف ہونا پڑتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کوئی بات مدعیانہ انداز میں بلا حجت و دلیل پیش نہیں کی۔ پوری کتاب کا انداز علمی اور استقرائی ہے۔ ہر بیان کے لئے خود اقبال کے کلام سے استشہاد کیا ہے۔ اقبال کے اشعار سے جو حوالہ جات دیئے ہیں اُن کی کثرت اور نوعیت

کو دیکھ کر پروفیسر صاحب کے مطالعۂ اقبال کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز کے ثبوت کے لئے اُن کی نگاہ اقبال کے ابتدائی اور آخری، فارسی اور اُردو اشعار پر پڑی ہے۔ حوالہ جات کی یہ کثرت تعلیم یافتہ حضرات کے اُس طبقہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ مفید ہو گی جنہیں اقبال کے پورے کلام کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے افکار کی اچھی شرح ہی نہیں بلکہ کلامِ اقبال کا ایک پاکیزہ انتخاب بھی ہے جس میں اقبال کی زندگی کے کسی دَور اور اُن کی کسی فارسی یا اُردو تصنیف کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ فاروقی صاحب نے عقیدت مندانِ اقبال کے اُس وسیع طبقے پر بڑا احسان کیا ہے جسے اقبال کی تمام تصانیف نظم و نثر تک دسترس نہ تھی محض عنوانات پر نظر ڈالنے تو کتاب کے متعدد و متنوع مباحث کی نوعیت آشکار ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری اور پیغام کے ہر پہلو کی ہمدردانہ اور نکتہ سنجانہ شرح کی گئی ہے۔ شریعت، سیاست، فلسفہ ہر نقطۂ نظر زیرِ بحث لایا گیا ہے، اور اُس پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک "سیاست" ہی کی بحث کے ذیلی عنوانات کو دیکھئے:۔ دین و سیاست، غلامی و آزادی، قومیت، وطنیت، سلطنت، اشتراکیت، سرمایہ و محنت، ملکیتِ زمین، جمعیتِ اقوام، عورت، سیاستِ مغرب۔

جہاں حقائقِ زیرِ بحث کی یہ فراوانی ہو۔ وہاں انفرادی فہم و ذوق کی بنا پر کہیں کہیں اختلافِ رائے کی گنجائش ضرور باقی رہتی ہے۔ میرا اپنا نقطۂ نظر بعض مقامات پر فاضل مصنف سے مختلف ہے۔ مثلاً مرزا بیدل کے دلدادہ ذوقِ سکون ہونے کے متعلق میری رائے بالکل برعکس ہے۔ اِسی طرح اقبال کی شاعری

کے جو دور اُنہوں نے قائم کئے ہیں، اُن سے بھی میں اتفاق نہیں کر سکا لیکن اتنی جامع اور وسیع المبحث کتاب کے سلسلے میں جزئی اختلافات کا ہونا ناگزیر ہے۔

بنیادی طور پر جیسا میں نے اوپر بیان کیا مجھے نہ صرف اُن سے کامل اتفاق ہے، بلکہ میری رائے میں اُنہیں کا زاویۂ نگاہ اقبال کے متعلق صحیح زاویہ نگاہ ہے۔ اُنہوں نے اقبال کو شاعروں کی صف میں ایک پیغمبر کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ اِس لئے اُن کی تشریحات صحتِ نظر اور اصابتِ فکر کے لئے اہل الرائے اصحاب کے نزدیک جا بجا مستحق تحسین ٹھیریں گی۔ اِس پر طرّہ یہ کہ فاضل مصنّف نے ایک مشکل مضمون کو ہر لحاظ سے عام پسند بنانے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو فلسفہ و حکمت کے رموز سے بیگانہ ہیں۔ اِس تصنیف سے بوجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں

لیکن اقبال محض ایک فلسفی شاعر اور حکیم ہی نہیں تھا۔ اُس کی شخصیت کے اور بھی پہلو تھے، جو افسوس ہے کہ اُس کی شاعری میں منعکس نہیں ہو سکے۔ شاید یہ ممکن بھی نہ تھا۔ ظرافت و بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی اور بزم آرائی پیغمبری کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تاہم طاہر صاحب کی محنت قابلِ داد ہے کہ اُنہوں نے اپنی کتاب کے سوانحی حصے میں اقبال کی شخصیت کے متعلق بھی بہت چھان بین کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال کی زندگی کے متعلق کوئی مطبوعہ تفصیل شاید اُن کی نظر سے اوجھل نہیں رہی۔ دقّت یہ ہے کہ اقبال کی زندگی کے یہ خالصۃً شخصی پہلو کبھی پوری طرح معرضِ تحریر و طبع میں نہیں آئے۔ اقبال کو صرف اُس کے کلام میں دیکھئے تو وہ منبر پر عصا تھامے ہاتھ میں صورِ اسرافیل لئے کھڑا نظر آتا ہے۔ خوش نصیب تھے وہ بے شمار لوگ جنہیں کبھی اقبال کی صحبت میں چند گھڑیاں گزارنے کا موقع ملا۔ اِس قسم

کی صحبتوں میں اُنہوں نے دیکھا کہ اقبال بے تکلفی سے کرتے اور دھوتی میں ملبوس آرام کرسی پر پاؤں سمیٹے بیٹھا، حقّے کی نے مُنہ میں لئے ہوئے ہر مقامی و آفاقی محدود و نامحدود مسئلے پر بیغلیر ذہن اور برق وش فراست کی رنگ برنگ روشنیاں ڈالتا چلا جاتا ہے۔ لاہور کے پہلوان اکھاڑوں سے اُٹھ کر چلے آتے تو دنگل کے افسانے اور کُشتی کے داؤں پیچ اقبال کی مبصرانہ گفتگو کا موضوع بن جاتے۔ اتنے میں کسی صاحب علم بزرگ کی موجودگی کے باعث باتوں کا رُخ ذرا پلٹا تو فلسفۂ مغرب کی جدید ترین تحقیقات پر اقبال نے اس انہماک سے گفتگو شروع کر دی۔ گویا یورپی فلسفے کی موشگافیوں کے سوا اُسے اور کسی چیز سے کام ہی نہیں ہے۔ مختلف کھانوں کا ذکر چھڑ گیا تو ہسپانیہ کے ماکولات، افغانستان کے پلاؤ اور لکھنؤ کے دسترخوانوں کے لذائذ سبھی زیر بحث آ گئے۔ بڑے بڑے سیاست دان حکومت کے ایوانوں سے اُٹھ کر آتے۔ بڑے بڑے مُدبّر اور رہنمایانِ قوم کانگریس اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اُتر کر یہاں پہنچتے اور تھوڑی دیر کی مکالمت میں اپنے مخصوص مسائل کے متعلق ایک نئی بصیرت لے کر جاتے۔ کالجوں کے نوجوان آتے تو اس انداز سے کلام اللہ کی تفسیر اور فلسفۂ اسلام کی شرح ہوتی کہ خود اُن کی پیشانیاں نورِ ایمان سے جگمگانے لگتیں۔ غرض گفتگو کا کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس سے اقبال کو عمیق دلچسپی نہ ہو۔ جس قیامت خیز صبح کو ہندوستان شاعر و حکیم اقبال کے لئے سوگوار تھا اُس دن مفلس لاہور اپنی اُس دولت کو پیٹ رہا تھا جسے ایک "فقیر راہ نشین" سرِ راہگزار لٹایا کرتا تھا۔

اقبال اب اورنگ زیب کے زینے کے پاس سوتا ہے۔ ایک موقع پر

اُس نے خود کہا تھا کہ اسلامی فنِ تعمیر کے دَورِ عروج کی خصوصیت اُس کا جلال و جبروت ہے۔ یہی جلال و جبروت خود اقبال کی شاعری نے اپنے لئے پسند کر لیا، اور جب شاعر کا جسدِ عنصری احباب و معتقدین کے کندھوں پر اپنے دُنیوی مکان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا، تو اُس کی منزلِ مقصود شاہی مسجد کی دیوار کا سایہ تھا۔ بلاشبہ اقبال کے لئے ایسی ہی خواب گاہ موزوں تھی۔ ہر روز صبح کو عالمگیر کے تعمیر کئے ہوئے رفیع الشان مینار اپنی سنگِ سُرخ میں لپٹی ہوئی پُرغرور صلابت کے ساتھ اُس شخص کے مرقد پر فاتحہ خواں ہوتے ہیں جس کے کلام کی رفعت و جلال نے اُسے ہمیشہ کے لئے اُن کی ہمسائیگی کا حق دیا ہے۔ مسجد کے صحن کی پُرشکوہ وسعت و عظمت مسجد کے زینے سے اُتر کر اُس تودۂ خاک پر نثار ہونا چاہتی ہے، جس کے آغوش میں اقبال ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ جب اندھیرا ہو جاتا ہے اور سکوتِ شب کے طلسم سے لاہور کے کوچہ و بازار بتدریج مسحور ہونے لگتے ہیں، تو مسجد کے طاق و محراب اور گنبد و مینار سے وہی ترانۂ خاموش بلند ہوتا ہے جسے اقبال کے کان سب سے زیادہ پہچانتے ہیں۔

اقبال کی وفات پر لاہور کے ایک مقتدر انگریز افسر نے اقبال کے ایک عقیدت مند دوست سے کہا "تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپردِ خاک کر دیا" بیشک! مگر مسلمان مرتا نہیں ہے۔ اُس کا اسلام اُسے ہمیشہ زندہ رکھتا ہے اور جس خاک میں اُس کی خاک ملتی ہے، اُس میں سے زندگی کی ہری ہری کونپل پھوٹتی ہے۔

حمید احمد خاں   اسلامیہ کالج لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح حیات

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اقبال

۷۸۶
۹۲

آبا ؤ اجداد

حضرت علامہ سر شیخ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے آبا و اجداد کشمیر سے پنجاب آئے تھے۔ آپ کے اجداد سترھویں صدی عیسوی میں مشرف باسلام ہوئے اور تقریباً اسی زمانہ میں کشمیر سے ترکِ وطن کر کے مختلف اطراف میں پھیل گئے علامہ مغفور کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ نے سیالکوٹ کو اپنا وطن قرار دیا۔ آپ کی گوت سپرو ہے۔ اور آپ کا خاندان کشمیر کے معزز و محترم پنڈتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اپنے برہمن نسل سے ہونے کی جانب علامہ نے خود اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں :ـ

میں اصل کا خاص سومناتی آبا مرے لاتی و مناتی
میر و میرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست
مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسلام سے محبت اور اولیائے کرام سے عقیدت آپ کے آبا کا خاصہ رہا ہے۔ آپ کے والدین بھی مذہب کے سچے پرستار اور محبتِ رسولؐ میں سرشار تھے یہی حُبِ دین اور حُبِ رسولؐ وراثت میں علامہ مغفور تک پہنچی تھی، اور یہاں آتے آتے یہ شرابِ حجازی دو آتشہ سہ آتشہ ہو کر بے حد تیز ہو گئی تھی۔ اپنی والدہ کی

یاد میں اقبالؒ نے جو نظم لکھی ہے اس میں کہتے ہیں :۔ ؎

تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دُنیا کا سبق تیری حیات

آپ کے والدین مکارمِ اخلاق، دینداری، زہد و اتقا سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ آپ کے والد نور محمد صاحب مرحوم اسّی سال کی عمر میں بصارت کھو چکے تھے۔ سو سال کی عمر پائی۔ وہ کسی ایسے افسر کے ملازم تھے جس کی کمائی میں رشوت کا شبہ ممکن تھا۔ حالانکہ خود اُن کی تنخواہ ہر قسم کے اشتباہ سے پاک تھی۔ پھر بھی علامہ کی والدہ ہرگز اس روپیہ کی خریدی ہوئی کوئی چیز اپنے استعمال میں نہ لاتی تھیں۔ آپ کے والدِ ماجد صابر و قانع سادگی پسند مسلمان تھے۔ علماء و صلحا کی ہم نشینی کے شائق تھے۔

عالی جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں "اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ مگر ان کا رنگِ تصوف ایسا نہ تھا کہ ان کو زندگی کے روزمرّہ فرائض سے بے پروا کر دے۔ ساری عمر اپنی دس انگلیوں کی کمائی سے روزی کمائی "دل بہ یار و دست بکار" پر ان کا عمل تھا، دل خدا کی طرف ہاتھ کام پر لگے رہتے تھے"[۱]

اقبال نے رموزِ بے خودی میں اپنے والدِ مرحوم کی خدا ترسی، غریب نوازی اور تدین کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ "ایک دفعہ ایک سائل سوال کرتا ہوا ہمارے دروازہ پر آیا۔ مجھے اس کے اصرارِ سوال پر غصہ آ گیا۔ اور میں نے اسے مارا۔ میرے مارنے پر جو کچھ وہ مانگ کر لایا تھا گر پڑا۔ والدِ مرحوم نے دیکھا تو بے حد متاسف و مغموم ہوئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اور فرمانے لگے کہ "جب اُمتِ رسول اللہ

۱؎ ملفوظاتِ اقبال

صلے اللہ علیہ وسلم میدانِ قیامت میں جمع ہوں گی۔ غازی، شہید، زاہد، عابد، عالم، حافظ سب موجود ہوں گے اور آنحضرت صلعم مجھ سے دریافت فرمائیں گے کہ ہم نے ایک بندۂ مسلم کو تیری فرزندی اور نگہداشت میں دیا، تو اُسے بھی آدمی نہ بنا سکا۔ تو میں کیا جواب دُوں گا" پھر بیٹے کو مخاطب کر کے جو کچھ کہا ہے کس قدر مؤثر اور دلدوز ہے۔ کہتے ہیں :-

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر — اجتماعِ اُمتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر — لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکُن — پیشِ مولا بندہ را رُسوا مکُن

ایک خواب

اقبال رح کی پیدائش سے قبل ان کے والد نے ایک شب خواب دیکھا کہ ایک خوبصورت سفید کبوتر فضائے آسمانی میں پرواز کر رہا ہے۔ پھر وہ کبوتر اُترا اور آپ کے والد کی گود میں آ بیٹھا۔ اُن متقی بزرگ نے اس خواب کی تعبیر یہ سمجھی کہ میرا پیدا ہونے والا بچہ با اقبال ہوگا، اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دے گا۔

پیدائش

الغرض ایسے مردانِ خدا کے آغوش میں اقبال رح ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ

مطابق ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء کو کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔[1] آپ کی والدہ ماجدہ نے محمد اقبال آپ کا نام تجویز کیا۔ نہ معلوم وہ کیسی مبارک ساعت تھی کہ جس میں اس اقبال مند کا اس قدر موزوں نام رکھا گیا تھا کہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ آپ کی والدہ نے خود ہی خاص توجہ و اہتمام سے آپ کی ابتدائی تربیت کی۔ اِس عفت مآب خاتون کی تربیت کا نتیجہ آج عالم کے سامنے ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:-

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہُوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہُوا

تعلیم

گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ مُدت تک آپ نے مکتب میں پڑھا۔ حضرت علامہ کے والدِ ماجد کو مولوی میر حسن[2] صاحب سے خصوصیت تھی اور آپ ان کے فیضِ صحبت اور تبحرِ علمی سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے اقبال کو میر صاحب کے زیرِ سایہ مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہاں پانچویں جماعت میں نمایاں کامیابی کے صلہ میں اقبال نے وظیفہ پایا۔ اسی طرح مڈل کے درجات میں ہمدرسوں میں ممتاز رہے، اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ انٹرنس کا امتحان بھی امتیازی درجہ پا کر پاس کیا اور سرکاری وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔

[1] پیدائش کی یہ تاریخ سیالکوٹ کے رجسٹر ڈی پیدائش سے تصدیق شدہ ہے۔ اس کے مقابلے میں ۱۸۷۶ء والی روایت ضعیف نظر آتی ہے۔ [2] برصفحہ آئندہ

لطیفہ

اقبالؒ کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی۔ اسکول میں تعلیم پاتے تھے۔ ایک

حاشیہ صفحہ گزشتہ ؎۲ شمس العلما مولوی سید میر حسن صاحب مرحوم سے مختصر تعارف کرانے کے لئے "ملفوظاتِ اقبال" سے عبدالواحد صاحب ایم اے کے مضمون سے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے فرماتے ہیں :- "میں ۱۹۱۷ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی انٹرمیڈیٹ جماعت کے سالِ اوّل میں داخل ہوا۔ ان دنوں وہاں عربی کے پروفیسر مولوی میر حسن مرحوم تھے۔ مولوی صاحب کو سیالکوٹ میں ہر چھوٹا بڑا جانتا تھا۔ ان کی خودداری اور وضعداری ضرب المثل تھیں۔ ان کی شخصیت اس قدر پُروقار اور بارعب تھی اور وہ اس قدر معاملہ فہم اور نکتہ شناس تھے کہ گو وہ انگریزی بالکل نہ جانتے تھے مگر پرنسپل صاحب کالج کے انتظامی معاملات میں سب سے پہلے ان سے مشورہ طلب کرتے۔ مولوی صاحب بہت ضعیف تھے۔ ایک لمبا سا عصا ہاتھ میں رکھتے اور اس کے سہارے نہایت آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم لے کر چلتے لیکن پابندیٔ اوقات کا یہ عالم تھا کہ کالج میں وقتِ مقررہ سے نہ کبھی ایک سکنڈ پہلے پہنچتے نہ بعد۔ وہ اپنے مکان سے کالج تک جو کم و بیش دو میل کا فاصلہ تھا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچتے لیکن جاتے ہمیشہ پیدل۔ ایک دن پرنسپل صاحب نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ تانگے پر آیا کیجئے۔ الاؤنس آپ کو کالج دے گا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ٹانگوں میں جو رہی سہی سکت ہے وہ بھی کھو دوں اسی طرح چشمہ لگانے کے سخت مخالف تھے۔ گو بینائی اس قدر کمزور تھی کہ پڑھتے وقت کتاب بلا مبالغہ ناک سے چھو جاتی، ان کا لباس تمام تر سفید ہوتا تھا۔ شاید سفید داڑھی کی مناسبت سے، گرمیوں میں لٹھے کا پاجامہ اور ململ کا لمبا کرتہ اور پگڑی۔ جاڑوں میں پاجامہ اور کرتہ روئی دار

(باقی صفحہ ۲۸)

دن آپ کو اسکول پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ماسٹر صاحب نے دیر کا سبب دریافت کیا، تو

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) کالج میں لڑکے اور پروفیسر سب ان سے اس قدر مرعوب تھے کہ ان کو دور سے آتے دیکھ کر یا تو راستے سے ہٹ جاتے یا جلدی سے سلام کر کے ایک طرف کو ہو جاتے۔ ان کے طالب علم جو اُن سے عربی پڑھتے تھے، کچھ سہمے سے رہتے تھے۔ ہم نے سُن رکھا تھا کہ وہ علم کا سمندر ہیں، لیکن ان سے کچھ حاصل کرنا بڑے دِل گُردے کا کام ہے کیونکہ وہ شروع شروع میں بہت سختی کرتے ہیں، اور بات بات پر ڈانٹ دیتے ہیں۔ جو شخص یہ پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کر لے پھر اس پر اپنا فیض عام کر دیتے ہیں۔"

"اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مولوی صاحب محض خشک عالم تھے۔ ان کی طبیعت کا ایک لطیف پہلو بھی تھا۔ لیکن ان کی ظرافت اور شگفتہ مزاجی خاص خاص موقعوں پر ظاہر ہوتی تھی، . . . . ایک دفعہ مولوی صاحب اسٹاف میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے۔ یہ واقعہ اس قدر خلاف معمول یا یوں کہئے کہ خلافِ عادت تھا کہ کالج میں چرچا ہو گیا۔ ہر ایک یہ کہتا پھرتا تھا کہ مولوی صاحب کل دو منٹ دیر سے آئے۔ مَیں نے اتفاقاً پرنسپل صاحب سے پوچھا "سُنا ہے کہ مولوی صاحب کل وقت پر نہ پہنچ سکے۔ کیا یہ درست ہے؟" پرنسپل صاحب نے کہا "ہاں درست ہے اور مَیں تمہیں مولوی صاحب کا ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ کل جب وہ اسٹاف روم میں داخل ہوئے تو مَیں نے ازراہِ تمسخر گھڑی دکھاتے ہوئے مولوی صاحب سے کہا کہ "دیکھئے مولانا آپ نے ہمیں پورے دو منٹ تک انتظار کرایا۔ مولوی صاحب نے فوراً کہا "بھئی ایسی بھی کیا بات ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس دُنیا میں تمہارا کتنے برس انتظار کیا" (پرنسپل صاحب کی عمر اس وقت کوئی پینتالیس سال تھی)۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودداری، وضعداری اور شگفتہ مزاجی کو ان کے اُستاد کی طبیعت کی بھی خصوصیات سے ایک گہری مناسبت ہے۔"

آپ نے بیساختہ جواب دیا "اقبال دیر ہی میں آتا ہے"

اس عمر میں یہ جواب۔ اس فراست و ذہانت پر ماسٹر صاحب دنگ رہ گئے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں :-

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارہ بلندی

اس "بلندی ستارہ" کو شمس العلما، مولوی سید میر حسن مرحوم کی دُور اندیش نظروں نے شروع ہی سے جان لیا تھا اور اقبال رح ابتدا ہی سے اُن کی مخصوص توجہ کے مرکز بنے رہے تھے۔ اقبالؒ چوتھی جماعت میں تعلیم پاتے تھے۔ ایک دن اُن کے والدِ مرحوم اُن کو لے کر مولوی صاحب کے پاس جو اُن کے خاص احباب میں تھے، آئے اور فرمائش کی کہ "آپ اسے بجائے اسکول کی تعلیم کے دینیات کا درس دیا کریں۔" مولوی صاحب نے تبسم کیا اور جواب دیا "یہ بچہ مسجد کی تعلیم کے لئے نہیں ہے، یہ مدرسہ ہی میں پڑھے گا۔" اس وقت سے ایف اے کی تعلیم ختم کرنے تک اقبال رح مولوی صاحب مرحوم کی تربیت و تعلیم سے مستفیض ہوتے رہے۔ مولوی صاحب شاگرد کی "ہوشمندی" و فراست کو بخوبی جانتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی اِس عرصہ میں عربی و فارسی کے سوا اسلامیات اور حکمت کی مکمل تعلیم دے کر اقبال رح کے زرِ خالص کو کندن دپارس بنا دیا جس کی درخشانی نے بہت جلد سارے عالم کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔

علامہ اقبالؒ ایسے شفیق اور بے مثل استاد کو کبھی نہ بھولے۔ ولایت گئے تو اُن کی یاد کی تڑپ ساتھ تھی اور ہندوستان آئے تو مولوی صاحب کی عقیدت و محبت اُن کے دِل کو گرمائے رہتی تھی۔ اقبالؒ نے ولایت جانے سے قبل دُعا کی تھی :-

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

کالج میں داخلہ

جب اقبالؒ کالج میں داخل ہونے لگے تو آپ کے والدِ مرحوم نے آپ سے عہد لیا کہ تم تعلیمی زندگی میں کامیاب ہونے کے بعد اپنی زندگی اسلام کے لئے وقف کر دینا۔ آپ اس عہد پر تادمِ مرگ قائم رہے اور تمام عالم کو معلوم ہے کہ کس طرح اقبال نے اسلام کی خدمت کی۔

اقبالؒ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے پاس کرکے لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی اور وظیفہ پایا، اور عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے حاصل کرکے ہمدرسوں پر فضیلت پائی۔ اسی زمانہ میں مسٹر ٹامس آرنلڈ ایم اے او کالج علی گڑھ سے قطع تعلق کرکے گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گئے تھے۔ ان کی فلسفہ دانی کی شہرت اور طبعی رجحان نے اقبال کو آمادہ کیا اور آپ نے فلسفہ کے ایم۔ اے میں داخلہ کرا لیا۔ مسٹر آرنلڈ شاگرد کی قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال کو شاگردی سے ترقی دے کر احباب کے زمرے

میں داخل کر لیا۔ آرنلڈ صاحب کہا کرتے تھے کہ "ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے"۔ ۱۸۹۹ء میں اقبالؒ نے ایم اے پاس کیا، اور یونیورسٹی میں اوّل آنے کے باعث طلائی تمغہ کے مستحق قرار پائے۔

ایک واقعہ

اقبال رحؒ کے کالج میں داخل ہونے کے ابتدائی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک مولوی صاحب نے جو عالم دین بھی تھے جھوٹ بولا۔ ایک عالم کے منہ سے جھوٹ یہ ایک ایسی غیر معمولی اور ناقابلِ اعتبار بات تھی کہ اقبال رحؒ بیقرار ہو گئے، اور کئی دن تک بے کیف و بے چین رہے حتیٰ کہ کلاس میں بھی آپ کا جی نہ لگتا تھا۔ مسٹر آرنلڈ نے اقبالؒ کی اس غیر معمولی الجھن کو دیکھا تو سوال کیا۔ آپ نے تمام واقعہ کہہ سنایا، تو آرنلڈ صاحب نے کہا: "تم آئندہ زندگی میں اس قسم کے بہت سے واقعات دیکھو گے"۔

مُلازمت

ایم اے پاس کرنے کے بعد علامہ مرحوم کو اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسری مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اردو میں معاشیات پر ایک کتاب علم الاقتصاد لکھی۔

جس طرح اقبالؒ ایک ہونہار ذہین اور طبّاع طالب علم رہے تھے، اسی طرح آپ اُستادی کے مرتبہ پر بھی ہر طرح لائق و فائق نظر آئے۔ آپ کے شاگرد آپ کے لکچروں کے گرویدہ اور آپ کے افسر آپ کے مدّاح رہتے تھے۔

سفرِ یورپ

اقبالؒ کو ابتدا سے تحصیل علم کا شوق تھا، اور علمی ترقی کے ساتھ یہ ذوق بھی بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۰۵ء میں ولایت کا سفر اختیار کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے فلسفۂ ایران پر ایک تحقیقی اور عالمانہ مقالہ کے صلہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری پائی۔ آپ نے اسی سہ سالہ قیام میں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا، اور لندن کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں بھی کچھ مدّت استفادہ کیا اور سند حاصل کی۔

جب اقبالؒ کا مقالہ ایران کا فلسفہ مابعد الطبیعات انگلستان میں شائع ہوا تو فضلائے یورپ پر آپ کی قابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ اور ماہرانِ فن نے اس کتاب پر بہت عمدہ ریویو لکھے۔ اِس مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ آپ نے اسلام پر چھ لکچر دیئے۔ جنہوں نے آپ کی مذہبی اور فلسفیانہ معلومات کی دھوم مچا دی۔

اسی زمانہ میں پروفیسر آرنلڈ نے چھ ماہ کی رخصت لی، تو لندن یونیورسٹی نے اقبالؒ کو اِس مدّت کے لئے عربی پروفیسر مقرر کیا۔

واپسی

اقبالؒ تین سال یورپ میں رہ کر واپس ہوئے، تو اُس وقت اُن کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ اہل اللہ سے ارادت اور مردانِ خدا سے عقیدت آپ میں بدرجۂ غایت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ جس طرح جاتے وقت آپ حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دے کر عازمِ سفر ہوئے تھے اسی طرح ولایت سے واپسی میں بھی اوّل آپ دہلی آئے، اور آستانہ شریف پر خاک بوس ہونے کے بعد لاہور کو روانہ ہوئے۔ اقبالؒ ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو شام کے وقت لاہور پہنچے تھے۔ اسٹیشن پر اعزہ و احباب کے علاوہ قدر شناسوں کا ایک انبوہِ کثیر جمع تھا۔ آپ کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی ترتیب دی گئی جس میں آپ کے شایانِ شان اہتمامات کیے گئے تھے۔ ایک دن قیام کر کے علامہ اپنے وطن سیالکوٹ چلے گئے۔

سفرِ یورپ نے اقبال کی تشنگیِ علم کو ضرور قدرے سیراب کیا، لیکن دیکھنے والوں کو حیرت تھی کہ مغربی زندگی کا کوئی اثر ان پر کیوں نظر نہیں آتا۔ سچ یہ ہے کہ جس کی تربیت "صاحب نظروں" نے کی ہو، وہ نمائشی باتوں اور فریب کاریوں سے کب متاثر ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ کی ساری زندگی کو دیکھ جائیے وہ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرْ پر عامل تھے۔ چنانچہ "حکیمانِ فرنگ" سے اُنہوں نے "درسِ خرد" لیا اور اس کو "علم و نظر" کی کسوٹی پر کس کر اس کا میل دُور کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سفرِ یورپ نے موصوف پر کوئی ناپسندیدہ اثر نہ کیا۔ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ولایت سے واپس آنے کے بعد اقبال رح گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر اعلےٰ کی خدمات انجام دینے لگے۔ مگر ۱۹۱۰ء میں اس سے سبکدوشی حاصل کرلی اور بیرسٹری کرنے لگے۔ پروفیسری کے زمانہ میں بھی آپ کے ساتھ یہ مخصوص رعایت تھی کہ آپ ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے تھے اور جج صاحبان کو یہ ہدایت تھی کہ آپ کے مقدمات دن کے آخری حصّہ میں پیش ہوا کریں۔

آپ کے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ "جس دن وہ استعفادے کر آئے میں نے پوچھا کہ شیخ صاحب آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی۔ کہنے لگے" علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ مگر انگریز کا نوکر رہ کر انہیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں جو چاہوں کروں اور جو چاہوں کہوں۔ شاید یہ پھانس جو مدّت سے میرے دل میں کھٹکتی ہے اب نکل جائے۔"[1]

۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے آپ کو قانون کی پروفیسری کے لئے حیدر آباد بلانا چاہا تھا اور لکھا تھا کہ آپ کو پرائیویٹ پریکٹس کی بھی اجازت ہوگی، مگر آپ نے انکار کردیا۔

بیرسٹری کا سلسلہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہا۔ ۱۹۳۴ء میں مستقل علالت کی بنا پر اس سے بھی کنارہ کش ہوگئے اور بقیہ عمر گوشہ نشینی اور قناعت میں گزار دی۔

لہ اقبال نامہ

سیاسی سرگرمیاں

در اصل اقبال مرحوم کی تمام زندگی سیاسی و معاشرتی اصلاح ہی میں گزری اور موصوف اپنے اشعار کے واسطہ سے اپنا پیغام تمام عالم کو سناتے ہوئے اس عالم فانی سے چل بسے۔ لیکن عملی طور پر آپ میدانِ سیاست سے دُور نظر آتے تھے۔ آپ نے خود ایک دوست کو لکھا تھا۔

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں ۔۔۔ کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

مگر ۱۹۲۶ء سے آپ نے سیاسیات میں عملی حصہ بھی لینا شروع کر دیا۔ احباب و فائکیش کے اصرار پر آپ لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ لاہور کے گلی کوچوں میں آپ کی حمایت میں جلسے کئے گئے۔ مختلف حلقوں نے آپ کی امداد کا اعلان کیا۔ دو مقتدر اُمیدواروں نے آپ کے حق میں اپنے نام واپس لے لئے اور جمہورِ عام و خاص نے ثابت کر دیا کہ وُہ اقبال رح کے مرتبہ کی قدر و منزلت سے آگاہ ہیں۔ ۲۳۔ نومبر ۱۹۲۶ء کو انتخاب ہوا۔ اور علامہ مرحوم بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے اپنے حریف کے مقابلہ میں بے شمار ووٹوں سے منتخب ہو گئے۔ کونسل میں اقبال رح نے جو کچھ کیا اُس کا تفصیلی تذکرہ ترک کرتا ہوں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ آپ نے کونسل میں اپنے "کردار" سے اپنے ہی اس مقولہ کو غلط ثابت کر دکھایا کہ :۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اور زمانہ کو جتا دیا کہ وُہ جیسے "گفتار کے غازی" تھے ویسے ہی "کردار کے بھی غازی" نکلے۔

۱۹۳۰ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی۔ اس کے بعد آپ مسلم کانفرنس کے صدر بنے۔ یہ زمانہ اسلامیانِ ہند کے حق میں بیحد نازک تھا۔ جن صاحبان کو اس دور کے حالات کی نزاکت سے واقفیت ہے، وہی پورے طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ علامہ نے کس دلیری اور مستعدی سے ایسے دشوار وقت میں قوم کی صحیح رہنمائی کی۔

۱۹۳۱ء میں اقبالؒ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے انگلستان گئے، اور اسی سلسلہ میں آپ نے روما اور مصر کا سفر بھی کیا اور فلسطین کی مؤتمر اسلامی میں بھی شرکت کی۔ روم اور قاہرہ میں آپ نے مختلف ادبی و سیاسی انجمنوں کے اجلاسوں میں لکچر دیئے جو بے حد پسند کئے گئے اور عام و خاص نے علامہ کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے پھر انگلستان کا سفر کیا۔ اور وہاں سے واپسی میں ہسپانیہ جاکر آثار عہدِ اسلام کی سیر کی۔

۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم جدید میں اقبال پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ باوصف مسلسل علالت کے آپ سرگرمی سے مصروفِ عمل رہے۔ جس کا بیّن ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو اسی زمانے میں آپ نے قائدِ اعظمؒ کے نام تحریر فرمائے تھے۔ "نظریۂ وطنیت" کی تردید میں آپ کا عالمانہ مقالہ بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔

سفرِ دکن

دسمبر ۱۹۲۸ء میں اسلام پر چند لکچر دینے کے لئے اقبالؒ کو مدراس مدعو

کیا گیا۔ آپ دسمبر کے آخری ایّام میں مدراس پہنچے۔ تین دن وہاں قیام رہا۔ مدراس کی انجمن ترقی اُردو اور ہندی پرچار سبھا اور دیگر اداروں نے سپاسنامے پیش کئے۔ مذہب، فلسفہ اور سیاست کے اہل الرائے حضرات سے طویل مکالمات رہے۔
۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو آپ بنگلور پہنچے تو اسٹیشن پر استقبال کے لئے ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ مُسلم لائبریری نے ایک عظیم الشان جلسہ میں جس کے صدر میسور کے دیوان سر مرزا اسماعیل تھے اسپاس نامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر سبارائن وزیر تعلیم میسور کی زیر صدارت ایک اور جلسہ علامہ کے اعزاز میں منعقد کیا گیا جس میں بنگلور کے تمام معززین و اہلِ علم جمع تھے۔

مہاراجہ میسور اقبال رح کو میسور آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ چنانچہ علامہ ۱۰ جنوری کو میسور تشریف لے گئے۔ میسور یونیورسٹی نے موصوف کے لکچر کے لئے زبردست جلسہ منعقد کیا، اور ٹاؤن ہال میں مُسلمانانِ میسور کی جانب سے ایڈریس پیش کیا گیا۔ میسور یونیورسٹی کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے تقریر میں کہا تھا " ڈاکٹر سر اقبال کو مُسلمان لاکھ اپنا کہیں مگر وُہ ہم سب کے ہیں، وُہ کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملک نہیں ہو سکتے۔ اگر مُسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے۔ تو ہم کو بھی یہ فخر ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے "

اسی سفر میں علامہ سلطان حیدر علی رح اور ٹیپو سلطان رح کے مزارات پر بھی باریاب ہوئے تھے۔ جس وقت حضرت علامہ ٹیپو سلطان کے مزار پر پہنچے ہیں تو ایک میسوری شاعر نے سلطان شہید رح کی مدح میں ایک نظم سُنائی۔ جب تک وہ نظم پڑھی گئی، علامہ بے حد متاثر نظر آتے تھے، اور آپ کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔

عبدالرشید صاحب طارق "ملفوظات اقبال" میں علامہ کی زبانی سفرِ میسور

کے ذیل میں یہ دلچسپ بیان لکھتے ہیں :۔

"فرمانے لگے : میسور میں جہاں کہیں بھی گیا تو دیکھا کہ لوگوں کی زبانوں پر ایک ہی نام ہے، اور وہ سلطان شہیدؒ کا تھا۔ ہر مقام پر جہاں دو تین آدمیوں کی محفل گرم ہوتی، ایک ہی قصہ تھا۔ ایک ہی رنگین داستان تھی جسے ہر کوئی بیان کرتا اور سارے ادب سے سر جھکائے سنتے، اور وہ سلطان شہیدؒ کی معرکہ آرا زندگی تھی۔ بازاروں میں دوکانداروں کا موضوعِ سخن بھی یہی تھا۔ دو تین مجلسوں میں جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا یہی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے عمداً کئی مرتبہ گفتگو کا رُخ دوسری باتوں کی طرف پھیرا لیکن پھر پھرا کر پھر سلطان ٹیپوؒ کا تذکرہ آجاتا، اور پھر آخیر تک گریز نہ ہوتا۔"

اِس سیاحت کے بعد آپ حیدرآباد گئے۔ آپ ۱۴ جنوری کو حیدرآباد پہنچے تھے۔ اسٹیشن پر مسٹر زین حیدرآباد اور یونیورسٹی کے طلبا اور عوام النّاس کا زبردست ازدحام تھا۔ اور بچے ایک قطار میں کھڑے ہوئے "اقبال کا قومی ترانہ" گا رہے تھے۔ اسٹیشن پر علّامہ کو معلوم ہوا کہ وہ خاص حضور نظام کے مہمان ہیں۔ چنانچہ آپ شاہی مہمان خانہ میں فروکش ہوئے اور ۱۸ جنوری کی صبح کو گیارہ بجے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں مشرّف ہوئے۔

اقبالؒ جامعہ میں

۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی دعوت پر غازی رؤف بے

ہندوستان تشریف لائے اور آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں چھ لکچر دیئے۔ ان محفلوں میں سے ایک کی صدارت علامہ سر محمد اقبال ؒ نے کی۔ علامہ دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مہمان تھے۔ شام کو آپ ڈاکٹر صاحب اور غازی رؤف بے کے ہمراہ جامعہ تشریف لائے۔ جب ہال میں داخل ہونے لگے تو غازی رؤف بے نے آگے بڑھنے سے گریز کیا اور علامہ سے کہا ”آپ ہمارے مقتدا ہیں۔ آپ آگے چلیئے۔“ غازی رؤف بے کی تقریر کے بعد علامہ نے ایک مفصّل و مدلّل تقریر کی۔ جس میں ”اتحادِ اسلامی“ کی اہمیت بتائی اور ”وطنیت“ کے موجودہ تخیّل کی خامیاں بتاتے ہوئے اس کے نقائص پر تبصرہ کیا۔

اگلے دن پھر آپ نے جلسہ کی صدارت کی۔ لوگ پھر ایک فصیح و بلیغ خطبہ سننے کے متوقّع تھے مگر آپ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ قصہ سنا کر بیٹھ گئے۔ فرمایا ”جنگِ عظیم کے ایّام میں ابلیس کے چند مُرید اُس کے پاس گئے، تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ اس سے بیکاری کا سبب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا ”آج کل مجھے بالکل فرصت ہے۔ اِس لئے کہ مَیں نے اپنا سارا کام برطانی وزارت کو سونپ رکھا ہے۔“

اس کے چند ماہ بعد آپ نے جامعہ کو پھر نوازا، اور ”لندن سے قرطبہ تک“ کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ شام کو آپ کے اعزاز میں دعوت تھی۔ دعوت کے بعد جو تقریریں ہوئیں۔ ان میں مولانا اسلم جیراجپوری کی تقریر بھی تھی۔ مولانا نے فرمایا۔ ”مَیں نے عربی، فارسی اور اُردو کے شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ اور مَیں دعویٰ کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ اسلام کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ آپ کا

کلام حقائق اسلامی سے بھرا ہوا ہے۔ اور آپ نے ہمارے نوجوانوں کو صحیح راستے پر لگانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ مغربی تعلیم کے ایک ماہر ہیں۔ پھر بھی اسلامیات کی معرفت رکھنے کی وجہ سے آپ نے مسلمانوں کو وہ پیغام سنایا جس سے انہوں نے ازسرِنو اسلام کی عظمت وحقیقت کو پہچانا، اور خفتہ و غافل نوجوانوں میں پھر حبِ رسول اور محبتِ قرآن تازہ ہوگئی"۔

اپنی تقریر کے سلسلہ میں علامہ نے پیرس میں فرانس کے مشہور فلسفی برگساں سے اپنی ملاقات کا حال بھی بیان کیا تھا۔ مشرق کے اس یکتا فلسفی نے اپنی اس ملاقات کے دوران میں برگساں کو اسلامی فلسفہ کی بہت سی ایسی باتوں سے روشناس کیا جن سے ناواقفیت کی بنا پر وہ اب تک تاریکی میں سرگرداں تھا۔

سفرِ افغانستان

۱۹۳۳ء میں اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی بادشاہِ افغانستان نے علامہ اقبال کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ سر راس مسعود مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہمراہ تھے۔ بادشاہِ افغانستان نے ان اصحاب کو مذہبی اور تعلیمی مسائل پر مشورہ دینے کے لئے طلب کیا تھا۔ براہِ پشاور سفر کر کے آخر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں یہ حضرات کابل پہنچے۔ شاہی مہمان رہے۔ وزراء وامراء سے ملاقاتیں اور دعوتیں رہیں۔ انجمن ادبی کابل نے ایک شاندار دعوت میں تمام فضلا و اکابر افغانستان کو جمع کیا اور معزز مہمانوں کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔

واپسی میں علامہ اقبال غزنی اور قندھار گئے۔ غزنی کے مزارات، عمارات اور آثارِ قدیمہ میں سلطان محمود غزنوی رح، حکیم سنائی رح اور حضرت داتا گنج بخش رح کے والدِ ماجد قدس سرہٗ کے مزارات کی خاص اہتمام سے زیارت کی گئی۔ پھر قندھار پہنچ کر خرقہ شریف کے دیدار میں قلب و روح کے سکون کا سامان پایا۔ مثنوی "مسافر" میں علامہ نے اس سفر کے تأثرات اور کیفیات نظم کی ہیں۔

اعزازات

علامہ اقبال رح کی فارسی مثنویوں میں سے بعض کا انگریزی میں ترجمہ شائع ہوا۔ نیز یورپ میں آپ کے درسِ عمل پر مختلف مضامین شائع ہوئے تو مغربی ممالک میں آپ کی علمی قابلیت کا سکّہ جم گیا۔ چنانچہ حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۲۲ء میں آپ کو نائٹ (سر) کا خطاب پیش کیا۔ یہاں اقبال رح کی فراخ حوصلگی اور بے نیازی کا یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب آپ کو سر کا خطاب پیش کیا گیا۔ تو آپ نے کہا "میں خطاب صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں جب کہ میرے اُستاد کو اوّل شمس العلماء کا خطاب دے دیا جائے"۔ گورنمنٹ کو اس شرط کے ماننے میں تأمّل تھا۔ اس لیے کہ علامہ میر حسن مرحوم باہمہ علم و فضل کسی غیر معمولی شہرت کے مالک نہ تھے۔ لیکن اقبال رح نے اپنی شرط پوری کرا ہی لی، اور اپنی نائٹ ہڈ کے ساتھ مولوی صاحب کو بھی شمس العلماء بنوا دیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ حکومت کے کاسہ لیسوں کو خطابات ملا کرتے ہیں

لیکن یہ خطاب ایک ایسے شخص کو ملا تھا جو ملوکیت کا سخت دشمن، مزدور اور جمہوریت کا زبردست حامی، آزادی کا علمبردار اور انقلاب کا نقیب تھا۔ بدگمانوں کو شکوک کا خاص موقع تھا۔ چنانچہ بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اخبارات نے بھی طنز کئے، ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا: ؎

لو مدرسۂ علم ہوا قصرِ حکومت — افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو سرِ ملّتِ بیضا کے تھے وہ تاج — اب اور سنو تاج کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ — سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

مگر دنیا جانتی ہے کہ اقبال کی شانِ استغنا پر اس خطاب نے کوئی اثر نہ کیا اور وہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے اپنے پیغام کی تبلیغ و تدریس میں مصروف رہے، جیسا کہ موصوف کی بعد کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔

اقبال کے اس اعزاز پر جو عظیم الشان پارٹی مقبرۂ جہانگیر، شاہدرہ لاہور میں باشندگانِ لاہور کی جانب سے دی گئی تھی، وہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے، کہ اقبال ہندوؤں اور سکھوں میں بھی اسی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے جو اُنہیں مسلمانوں میں حاصل تھی۔ اس پارٹی کے داعیوں میں تینوں قوموں کے افراد شامل تھے۔ اس شاندار دعوت میں تمام عمائدِ پنجاب، لاہور و بیرونجات سے شریک ہوئے تھے، اور سرکاری و غیر سرکاری حلقوں کے تمام اکابر ہندوستان کے اس یکتا قومی شاعر کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع تھے۔ اس اجتماع میں سر اقبال رح نے انگریزی میں تقریر کی، اور اسی تقریر سے پہلی دفعہ لوگوں کو آپ کی تصنیف پیامِ مشرق کا علم ہوا۔

علامہ اقبالؔ مرحوم مہاراجہ سرکشن پرشاد کو ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"حضور وائسرائے آجکل لاہور میں رونق افروز ہیں۔ کل اُنہوں نے نئے ہائیکورٹ پنجاب کا افتتاح فرمایا۔ چیف جسٹس سرشادی لال نے جو تقریر اس موقع پر فرمائی۔ اس کے جواب میں حضور وائسرائے نے اقبالؔ کی تعریف بھی کی ہے۔ تقریر نہایت دلکش اور نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کی گئی۔ اقبالؔ کی تعریف سے سب کو تعجب ہُوا کہ اس کی توقع نہ تھی۔"[1]

جناب مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کا جو مقالہ "ملفوظاتِ اقبال" میں شامل ہے۔ اِس سلسلے میں اس کا یہ اقتباس مزید لطف کا باعث ہوگا۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں :۔

"اُنہوں نے اپنے خطاب کے معاملے میں بھی کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں فرمایا۔ خطاب کے ملنے سے کچھ عرصہ پیشتر انگلستان کا ایک مشہور اخبار نویس جو ادبی دُنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا ممالکِ اسلامی کی سیر و سیاحت کے بعد افغانستان کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہُوا اور گورنر پنجاب کا مہمان ہُوا۔ اِسے ترکی سے لے کر افغانستان تک جس اسلامی قلمرو سے گزرنے کا اتفاق ہُوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا نام ہر جگہ اس کے سننے میں آیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس نے ڈاکٹر صاحب کے

---

[1] شادِ اقبال

ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر اربابِ حکومت چونکہ ہمارے ادبی مشاہیر سے بے خبر اور ان کے کارناموں سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس لئے کچھ تعجب نہیں اگر گورنر پنجاب اقبال کی عظمت سے ناواقف نکلے۔ تاہم اخبار نویس نے انہیں مجبور کیا کہ وُہ گورنمنٹ ہاؤس میں چائے پر مدعو کرکے اسے ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ بہم پہنچائے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔ مگر ان کی مثال تو "زمین جُنبد، نہ جُنبد گل محمدؒ" کی سی تھی۔ کہنے لگے یہ کون جائے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں کئی دن سے درد ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس تک جانے میں جانے تکلیف کس قدر بڑھ جائے! میں نے اصرار کیا کہ وُہ ضرور جائیں۔ پہلے تو وُہ اپنی ضد پر اڑے رہے مگر بعد میں چلنے کے لئے تیار ہوگئے اور میں اُنہیں اپنی گاڑی میں سوار کرکے خود گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچا کر واپس آیا۔ واپسی پر وہ سیدھے میرے ہاں تشریف لائے اور متذکرہ بالا واقعہ من وعن سُنایا۔ اس کے چند دن بعد ہی گورنمنٹ کی طرف سے آپ کے رُوبرو خان بہادر کے خطاب کی تجویز پیش کی گئی جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد شمس العلماء کی تجویز ہوئی، اُسے بھی آپ نے رد کر دیا۔ بالآخر نائٹ ہُڈ کی تجویز ہوئی۔ اس کے قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل تھا۔ لیکن نواب سر ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر وُہ اس پر رضامند ہو گئے۔ جب اُنہوں نے خطاب قبول کر لیا، تو اس پر دبی زبان سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی نے کہا "حکومت نے آپ کی زبان بندی کے لئے یہ چال چلی ہے۔" کوئی کہنے لگا "آخر بیچارے اقبال بھی کیا کرتے، حصولِ جاہ سے بے نیاز رہنا کچھ اتنا آسان نہیں۔" کسی اور نے کہا "نہیں، اب اقبال کی فطری بیباکی

کا خاتمہ سمجھو"۔ انہیں خیالات کی ترجمانی ہیں زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے ایک نظم بھی چھاپ ماری۔ ڈاکٹر صاحب بھی عوام کی اس قیاس آرائی سے بےخبر نہ تھے۔ چنانچہ جب اس خطاب کے سلسلے میں آپ کے اعزاز میں شاہدرہ باغ کے اندر ایک بہت بڑی پارٹی دی گئی تو آپ نے گورنر پنجاب کی موجودگی میں وُہ اشعار سنائے جو طلوع اسلام کے ابتدا میں درج ہیں۔ اس میں اُنہوں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ دُنیا کی کوئی طاقت ان کو اعلائے کلمۃ الحق سے نہیں روک سکتی"۔

علی گڑھ یونیورسٹی کئی سال قبل ڈی لٹ کی ڈگری کا ہدیہ علامہ مرحوم کی خدمت میں پیش کر چکی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی نے بھی اپنی جوبلی کی تقریب کے موقعہ پر ۱۹۳۷ء میں اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

ریاست بھوپال کی قدردانی

جب ناسازیِ مزاج کے باعث آپ نے بیرسٹری ترک کردی، اور عزلت گزینی اختیار کی تو اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے ازرہِ قدرشناسی پانچ سو روپیہ ماہوار کا اعزازی وظیفہ مقرر کر دیا، جو آخر وقت تک آپ کو ملتا رہا۔ علامہ کی رحلت کے بعد یہ رقم آپ کے خوردسال بچّوں کی طرف منتقل کر دی گئی تھی تاکہ اُن کی تعلیم و تربیت کی کفیل بن سکے۔

سفرِ حجاز کی تمنّا

اقبال رح کو عرصہ سے آرزو تھی کہ حجاز جائیں اور فریضۂ حج اور زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوں۔ چند سال سے ہر مرتبہ تیاری کرتے تھے مگر علالت کی بنا پر سفر کی نوبت نہ آتی تھی۔ آپ کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" ہے جو آپ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی بابت کہا کرتے تھے کہ "اس کتاب میں چند خلا ہیں جو سفرِ حجاز میں پورے کیے جائیں گے"۔ لیکن افسوس کہ علامہ یہ حسرت دِل ہی میں لے گئے۔

انتقال سے چند روز قبل ایک بار فرمایا: "سہارنپور سے ایک صاحب نے خط لکھا ہے۔ کہ میں حجاز گیا تھا اور طواف میں صدقِ دل سے دُعا کی تھی کہ اللہ تعالےٰ آپ کو بھی حجاز پہنچائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دُعا مقبول ہو چکی ہے"۔ پھر کہنے لگے کہ "بظاہر میرا حجاز جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ صاحب لکھتے ہیں کہ دُعا منظور ہو چکی ہے۔ دیکھئے کیا صُورت پیش آتی ہے"۔

ضعفِ بصارت

اقبال رح دو سال کے تھے کہ اُن کی داہنی آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ لیکن بائیں آنکھ کی بینائی اس قدر قوی تھی کہ تمام العمر کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ دیکھنے والوں کو تو کبھی یہ بھی احساس نہ ہوا کہ داہنی آنکھ بصارت سے محروم ہے۔ مگر عمر کے

آخری برسوں میں ان کی بائیں آنکھ میں موتیا بند کی تکلیف ہو گئی تھی۔ پانی اتر رہا تھا مگر آنکھ اس قابل نہ تھی کہ آپریشن کیا جا سکے۔ ڈاکٹروں کو موتیا بند کے پختہ ہو جانے کا انتظار تھا۔ آخری چند ماہ میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ بمشکل آنے والوں کو پہچان سکتے تھے۔ عموماً حاضرین کو ضرورت ہوتی کہ وہ نام بتائیں۔ علامہ کی بیماری کے امتداد نے اس امر کا موقع ہی نہ دیا کہ آپریشن کی نوبت آئے۔

بیماری

تین برس سے علامہ مرحوم بیمار چلے آتے تھے۔ ابتدا میں سنگِ گردہ کی تکلیف تھی جس میں حکیم نابینا صاحب کے علاج سے فائدہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں آپ عید کی نماز پڑھ کر واپس آئے تو گرم دودھ میں سویاں ملا کر کھائیں۔ اس سے عجیب اثر پیدا ہوا کہ آواز بیٹھ گئی۔ لاکھ ڈاکٹری علاج کیے مگر افاقہ نہ ہوا۔ آخر حکیم نابینا صاحب کی دوا سے اس شکایت میں کافی تخفیف ہو گئی۔ درد گردہ اور نقرس کے دورے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں آپ کی رفیقۂ حیات آپ سے جدا ہو گئیں۔ اُن کی رحلت کا آپ کو بے حد صدمہ ہوا، اور اس سانحہ نے صحت پر اور بھی بُرا اثر ڈالا۔

اس کے بعد کھانسی، ادم کشی، ضعفِ قلب کی تکالیف مستقل طور پر رہنے لگیں۔ تھوڑا سا چلنے پر بھی سانس پھول جاتا تھا۔ رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی جو آپ کے مخلص احباب میں سے تھے اور جن سے گزشتہ ایام میں آپ اکثر

رجوع کیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ "گزشتہ دسمبر سے اُن کی صحت زیادہ گرنا شروع ہوئی سانس کے دَورے ہر رات کو ہونے لگے ضعفِ قلب کی شکایت بھی ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی بائیں شانے میں درد بھی ہو جاتا تھا۔ درحقیقت اُن کا قلب عرصہ سے ماؤف تھا اور اب تدریجاً پھیل گیا تھا۔ اس کے ساتھ جگر بھی بڑھ گیا، اور پاؤں پر ورم بھی آگیا تھا۔۔۔۔"

"ڈاکٹر صاحب کے مرض کی حالت میں مدوجزر ہوتا رہتا تھا مگر یونانی علاج سے انہیں کافی فائدہ ہو گیا تھا، اور درمیان میں تو اُن کی حالت اُمید افزا ہو گئی تھی۔ تاہم اندرونی مرض کے علامات کم و بیش باقی رہتے تھے۔ اسی عرصہ میں مجھے پنجاب طبی بورڈ کے سلسلہ میں راولپنڈی جانا پڑا۔ میرے جانے کے دو روز بعد ڈاکٹر صاحب کی طبیعت یک بیک خراب ہو گئی اور بائیں پہلو پر ورم آگیا۔ اُنہوں نے مجھے واپس آنے کے لئے تار دیا۔ مگر میں دوسرے روز پہنچ نہ سکا۔ میرے پہنچنے سے پہلے لاہور کے معروف ترین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ علاج شروع کر چکا تھا جس سے دو روز کچھ فائدہ محسوس ہوا۔ مگر انیس اپریل کو حالت خراب ہونی شروع ہو گئی تھوک میں خون آنے لگا۔ نبض بہت خفیف (دُبلی) ہو چکی تھی۔ شام کو جب مَیں نے اور تین چار ڈاکٹروں نے دیکھا، تو حالت اطمینان بخش نہیں تھی، تاہم حواس اسی طرح صحیح و سلیم تھے اور ظاہری حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔"

"شفیع صاحب ڈاکٹروں کی تجویز کی ہوئی دوا لے آئے۔ حضرت نے ایک خوراک پی لی۔ پینے کے بعد بہت بے چینی محسوس کی اور فرمانے لگے کہ "مجھے متلی ہو رہی ہے۔ مَیں قے کرنا چاہتا ہوں"۔ چونکہ خون آرہا تھا اور خطرہ تھا کہ قے سے رگ

نہ پھٹ جائے۔ میں نے گرم پانی اور نمک کے غرغرے کرنے اور دانہ الائچی چبانے کے لئے کہا۔ اس سے بے چینی کم ہوئی۔ مگر فرمانے لگے کہ ابھی متلی باقی ہے۔ پھر میں نے اکسیرِ عنبری دی تو اس سے متلی رفع ہو گئی۔"

"اس کے بعد ایک دُوسری ڈاکٹری دوا پینی تھی۔ مگر اس سے انکار کیا اور فرمانے لگے کہ "ڈاکٹری دوائیں خلافِ انسانیت (اِن ہیومَن) ہیں۔ کیونکہ ان میں مریض کے ذوق کا خیال نہیں رکھا جاتا۔" پھر فرمایا کہ "میڈیکل سائنس زندگی کی سائنس معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہے۔" ڈاکٹر قیوم صاحب نے کہا کہ دوسری دوا خواب آور ہے۔ اس لئے اس کا پینا ضروری ہے۔ فرمانے لگے کہ مجھے ان دونوں سے نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس میں شانہ کے درد کو روکنے والے اجزا بھی ہیں۔ تو فرمایا کہ "اگر اس مکسچر میں سے دافعِ درد اجزا کو الگ کر کے دے سکیں تو پی لوں گا۔ کیونکہ خواب آور اجزا سے مجھے نیند نہیں آتی۔"

آخری ارشادات

اقبال رحؒ کو وقتِ موعود کے قریب آ جانے کا احساس تھا۔ چنانچہ آپ نے چند بار اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

۲۰ ؍ اپریل کو شام کے سات بجے آغا مرتضیٰ احمد خاں عبادت کے لئے گئے اور دیر تک حاضری میں بیٹھے رہے۔ اسی دَوران میں علامہ کے صاحبزادے جاوید اقبال جن کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی اندر کمرہ میں آئے تو اُن کو مخاطب کر کے فرمانے

لگے: "بیٹا تم میرے پاس آکر بیٹھا کرو۔ میں شاید چند روز کا مہمان ہوں۔" حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ "ابھی کم عمر ہے۔ آپ کی بیماری سے گھبرایا ہوا رہتا ہے۔" علامہ نے فرمایا: "اسے ہر افتاد کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیئے۔"

اس کے بعد علامہ نے چودھری محمد حسین صاحب سے کہا: "جاوید نامہ کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے میں نے چند باتیں جاوید کے لیئے لکھی ہیں ان میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ عصر حاضر میں قحط الرجال ہے، اور مردان باخدا کا ملنا سخت مشکل ہو رہا ہے۔ اگر تم خوش قسمت ہوئے تو تمہیں کوئی صاحب نظر مل جائے گا۔ اور اگر نہ ملا تو تم میری ہی نصائح پر عمل کرنا۔" پھر کہنے لگے کہ "میرے مرنے کے بعد جب جاوید جوان ہو تو اُسے اِن اشعار کا مطلب سمجھا دینا۔"

کچھ دیر بیٹھ کر آغا مرتضیٰ احمد خاں واپس آنے لگے تو علامہ مغفور نے مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھایا۔ مرتضیٰ احمد خاں صاحب کہتے ہیں کہ گزشتہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں علامہ نے کبھی رخصت ہوتے وقت ہاتھ نہ ملایا تھا۔ نہ میں نے کبھی اس کی ہمت کی تھی۔ اس لیئے میں لرز گیا کہ آج یہ غیر معمولی بات کیوں ہو رہی ہے۔

اسی شام کو ایک شخص کی مزاج پرسی کے جواب میں آپ نے فرمایا: "ان تکلیفوں سے اب بہت جلد نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" بیماری کا اثر قلب پر مہلک حد تک پہنچ چکا تھا، ایک روز بیتاب ہو گئے اور کہا:

تہنیت گو بُت پرستاں را کہ سنگِ محتسب
بر دلِ ما آمد و ایں آفت از مینا گزشت

رحلت سے چند روز قبل کئی بار مختلف موقعوں پر آپ نے اس خیال کا

اظہار کیا تھا کہ مسلمان موت کا خوشی سے استقبال کرتا ہے۔ انتقال سے ایک ہی دن پہلے آپ کے ایک جرمن دوست ملنے آئے تھے۔ آپ نے اُن سے بھی یہی کہا تھا "میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا۔ جب موت آئے گی تو مجھ کو مسکراتا ہوا پائے گی۔"

۲۵ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں یوم اقبال میں تقریر کرتے ہوئے علامہ سر عبدالقادر صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

"علامہ کی اس دنیوی زندگی کے آخری دن نیٹال (جنوبی افریقہ) کے ایک انگریزی اخبار کا تراشہ کسی نے آپ کو بھیجا تھا جس میں درج تھا کہ مسلمانانِ نیٹال نے ایک جلسہ کیا جس میں اقبال، جناح اور کمال اتاترک کی درازیِ حیات کے لیے دُعا مانگی گئی۔ جب حضرت علامہؒ کو یہ تفصیل پڑھ کر سُنائی گئی تو آپ نے فرمایا: میں تو اب اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ مسٹر جناح کو ابھی اپنی زندگی کا مشن پورا کرنا ہے، اِس لئے مسلمانوں کو اُن کی درازیِ حیات کی دُعا مانگنی چاہیے۔"

رحلت

راجہ حسن اختر صاحب کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم نے انتقال سے تقریباً دس منٹ قبل حسب ذیل قطعہ پڑھ کر وقت آجانے کا اعلان کر دیا تھا:-

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے   دِگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبالؒ کا ایک شعر ہے:-

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ‏ ‏ ‏ ‏ چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہی ہُوا۔ صبح کے سوا پانچ بجے کا وقت تھا۔ آپ کا دیرینہ ملازم علی بخش جسم دبا رہا تھا۔ آپ نے دِل پر ہاتھ رکھا اور کہا: "اب درد اِدھر آ گیا ہے"۔ ایک آہ کھینچی اور تبسّم بر لب، روح جان آفریں کو سپرد کر دی۔ آپ پر سکراتِ موت کی کوئی کیفیّت طاری نہ ہوئی اور آخر تک کامل ہوش میں رہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

انتقال کے وقت آپ کی عمر عیسوی حساب سے ۶۰ سال ایک مہینہ اُنتیس دن اور ہجری سن سے ستر سٹھ سال ایک مہینہ چھبیس دن کی تھی۔ رحلت کی اطلاع شہر میں ہوئی تو تمام سرکاری یا غیر سرکاری دفاتر، عدالتیں، کالج اور تمام اسلامی ادارات بند کر دیئے گئے، اور صبح سے ہی احباب اور شیدائیوں کے انبوہ جاوید منزل پر سوگواری کے لئے آنے شروع ہو گئے۔

مدفن

انتقال کے بعد چودھری محمد حسین صاحب ایم اے اور ڈاکٹر مظفر الدین صاحب نے طے کیا کہ بادشاہی مسجد کے کسی حجرہ میں مرحوم کو جگہ دی جائے۔ مگر سر سکندر حیات خاں صاحب وزیرِ اعظم پنجاب کلکتہ سے واپسی میں راہ میں تھے۔ اِس لئے دشواری تھی۔ چنانچہ دیگر اکابر سے مشورہ کیا گیا۔ سید محسن شاہ صاحب، خلیفہ شجاع الدین صاحب، خانصاحب سعادت علی خاں صاحب میاں نظام الدین

صاحب، میاں امیر الدین صاحب، مولانا غلام مرشد صاحب، مولانا عبدالمجید صاحب سالک، چودھری محمد حسین صاحب اور مولانا مہر صاحب شاہی مسجد کو روانہ ہوئے تاکہ مدفن کا تعین کیا جاسکے۔ مسجد کے دروازہ کی بائیں جانب جو قطعہ زمین تھا وہ زیادہ موزوں معلوم ہوا۔ اس لئے اندر حجرہ کا خیال ترک کر کے اس جگہ کے لئے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

پانچ آدمیوں کا ایک وفد اس مقصد کے لئے ہز ایکسیلنسی سر ہنری کریک گورنر پنجاب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ جگہ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے، اس لئے دہلی سے اجازت منگوانی ضروری تھی۔ گورنر صاحب نے انتہائی ہمدردی سے کام لیا اور بارہ بجے تک دہلی سے اجازت منگوا دی، اور چار بجے تک اجازت کے ضروری کاغذات بھی ترتیب پا گئے۔

جنازہ

جاوید منزل میو روڈ پر واقع ہے۔ وہاں سے شام کو پانچ بجے جنازہ روانہ ہوا۔ لمبے لمبے بانس چارپائی میں لگا دیئے گئے تھے۔ ورنہ ہجوم کی اس قدر زیادتی تھی کہ کندھا دینا ناممکن ہو جاتا۔ جب جنازہ اُٹھا تو عجب کہرام برپا تھا۔ ہر مسلمان زار و قطار رو رہا تھا۔ پنجاب کے تمام عمائد و اکابر بلا امتیاز دین و ملت جنازہ میں شامل تھے۔ وکلاء، بیرسٹر، شعراء، اخبار نویس، کالجوں کے اساتذہ و طلبہ، تجار حتیٰ کہ وزراء اور حکام سب حسرت و یاس کے پیکر بنے ہوئے ہمراہ تھے۔ ہز ایکسیلینسی

گورنر پنجاب کی جانب سے چیف سکرٹری نے اور نواب صاحب بہاول پور کی طرف سے اُن کے سکرٹری نے پھولوں کی چادریں جنازہ پر چڑھائیں ۔

جلوس کے آگے سوار اور پیدل پولیس کی بھاری تعداد تھی نیلی پوش رضاکار مجلسِ احرار کے سرخ پوش رضاکار، خاکساروں کا باوردی جیش، کامریڈ مسلم جیش کے باوردی رضاکار، الہلال پارٹی کے رضاکار، غرض باوردی رضاکاروں کی کثیر جماعت ہمراہ تھی۔ اس "عاشقِ رسُول" کا جنازہ ایسی "دھوم" اور شان سے ریلوے سٹیشن اور ریلوے روڈ پر ہوتا ہُوا اسلامیہ کالج کے وسیع میدان میں پہنچا۔ نمازِ جنازہ پڑھنے کے خیال سے یہاں پہلے سے ہزارہا مخلوق جمع تھی لیکن منتظمین نے یہاں نماز نہ پڑھی اور جلوس برانڈرتھ روڈ سے ہوکر دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہُوا جنازہ کے ساتھ کم سے کم ساٹھ ہزار ہندو، مسلمان، سکھ شریک تھے۔ جلوس سات بجے کے بعد شاہی مسجد پہنچا۔ شاہی مسجد میں نمازیوں کی کثرت کے باعث صفیں مرتّب کرنے میں بہت دیر لگی۔ آٹھ بجے شب کو نماز ادا کی گئی اور پونے دس بجے رات کے قریب شاہی مسجد کے باہر ملحقہ باغ میں یہ شاعرِ مشرق ہمیشہ کو آرامگاہِ لحد میں جا سویا۔

سدا رہے نام اللہ کا!

تاریخیں

علاّمہ اقبال رح کی رحلت نے ہندوستان بھر کی ادبی محفلوں میں قیامت کی سی ہلچل ڈال دی۔ اصحابِ قلم نے آپ کی زندگی اور پیغام پر مضامین لکھے۔

شعرا نے نظمیں اور قطعات کہے اور مادہ ہائے تاریخ نکالے۔ جگہ جگہ انجمنیں اور ادارے آپ کی یادگار میں قائم کئے جانے لگے۔

الحاج جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے علامہ ہی کے مشہور قطعہ کے چوتھے مصرعہ "دگر دانائے راز آید کہ ناید" پر ایک مصرعہ بڑھا کر تاریخ نکالی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ قادری صاحب نے اوّل اوّل اس قطعہ کو جس جگہ دیکھا وہاں "آید نہ آید" لکھا ہوا تھا۔ بعد میں آپ کو صحیح نسخہ "آید کہ ناید" معلوم ہوا۔ آپ پہلے نسخہ کے مطابق تاریخ نکال چکے تھے بعد کو صحیح نسخہ کے مطابق مادہ پیدا کیا۔ دونوں تاریخیں درج کرتا ہوں[1]۔ مولانا قادری صاحب کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل ہے۔ یہ مادے بھی بے مثل نکالے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

(۱)

برفت اقبال و رفت از جاں قرارے	قرارِ جاں نواز آید کہ ناید
برفت اقبال و رفت از دیں بہارے	"نسیمے از حجاز آید کہ ناید"

---

[1] پروفیسر قادری صاحب نے بعد کو ان دونوں قطعاتِ تاریخ کو ایک قطعہ میں منسلک کر کے رسالہ اُردو کے اقبال نمبر میں شائع کرایا تھا۔ میں نے دونوں قطعات اصلی صورت میں باقی رکھے ہیں۔ یکجائی صورت میں دیکھنا ہو تو انجمن ترقی اُردو کی شائع کردہ کتاب "اقبال" میں دیکھئے۔ اسی کتاب میں قادری صاحب کی بعض اور بھی مثل تاریخیں بھی درج ہیں جن سے آپ کے فنی کمال کا ثبوت ملتا ہے۔

پروفیسر صاحب ممدوح نے میری فرمائش پر فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی جو سیرتِ اقبال کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری اشاعت میں یہ مثنوی حذف کر دی گئی تھی۔ اس اشاعت میں "مثنوی حملہ ئے خودی" کے عنوان سے آخر کتاب میں درج ہے۔

برفت اقبال و رفت از شعر نغمہ — "سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید"
دگر آید کہ ناید حسن در نظم — دگر آں سوز و ساز آید کہ ناید
دگر آید کہ ناید عشق در شعر — حقیقت در مجاز آید کہ ناید
دگر آید کہ ناید مشربِ ناب — نگاہِ پاکباز آید کہ ناید
دگر از کاروانِ مُشتِ غبارے — بشوقِ اہتزاز آید کہ ناید
خدا را بندگاں بسیار باشند — "خودی" را کارساز آید کہ ناید
سرے دارند و ہم سودا و ہم درد — سراں را سرفراز آید کہ ناید
سرِ نازِ خودی در کعبۂ دل — بآئینِ نیاز آید کہ ناید
در میخانہ امید باز است — کسے از در فراز آید کہ ناید
زشعرش ساختم تاریخِ رحلت — بگفتوائے جواز آید کہ ناید

برفت اقبال آں عرفاں نوائے — ۱۳۳۵
دگر دانائے راز آید کہ ناید — ۶۰۳

۱۹۳۸

(۴)

برفت اقبال ہند و شرق و اسلام — اگر خواہی کہ باز آید نہ آید
دگر در جانِ اسلام آتشِ عشق — بآں سوز و گداز آید نہ آید
دگر در سازِ مشرق نغمۂ شوق — بآہنگِ حجاز آید نہ آید
دگر در جامِ ہند آں بادۂ غرب — بگفتوائے جواز آید نہ آید
زرفت اقبال اندا اسلام دل رفت — دگر ہم دل نواز آید نہ آید
زرفت اقبال از شرق آبرو رفت — دگر با عزّ و ناز آید نہ آید

زفت اقبال از ہند آں شان فت — وگر کس عشوہ ساز آید کہ نہ آید

زشعرش یافتم ہم سالِ ہجری — بشانِ امتیاز آید کہ نہ آید

سر آمد روزِ آں علامۂ ہند ۷۷۴

دگر دانائے راز آید نہ نابد ۵۸۳ — ۱۳۵۷ھ

مولانا قادری صاحب قبلہ نے ایک تاریخ اور کہی ہے۔ عیسوی وہجری مادے کس خوبی کے ساتھ ایک ہی مصرعے میں نکالے ہیں۔ دیکھئے فرماتے ہیں:۔

یگانہ با خدا، او باخودی وزخویش بیگانہ

زہے اقبال فرزانہ، خوشا اقبالِ دیوانہ

برآمد سالِ رحلت ہم زہجری وزمیلادی

چو افزودم بہ "المغفور" "انار اللہ برہانہ"

۵۸۱ + ۱۳۵۷ھ

۱۹۳۸ء

جناح، ٹیگور، حسرت

ملک بھر کے تمام رہنماؤں نے آپ کی موت پر اپنے غم و افسوس کا اظہار کیا۔ ان لاتعداد اور بے شمار بیانات میں سے چند دیکھئے:۔

قائدِ اعظم حضرت محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:"...... وہ عالمگیر شہرت رکھنے والے بے مثل شاعر تھے۔ ان کی تصانیف تا ابد زندہ رہیں گی جو خدمتیں انہوں نے ملک اور قوم کی کی ہیں، اُن کو بڑے سے بڑے ہندوستانی کے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے...... ان کی وفات اس وقت عام طور پر تمام

مُلک کے لئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے زبردست نقصان ہے۔"

نیو یونیورسٹی ہال لاہور میں ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو یوم اقبال کی صدارت کرتے ہوئے حضرت قائدِ اعظم نے فرمایا: "اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہوں، اور اگر اُس وقت مجھ سے کہا جائے کہ تم اقبال کی تصنیفات یا اسلامی ریاست کے حاکم اعلےٰ بننے میں ایک چیز کا انتخاب کرو۔ تو مَیں اوّل الذکر کا انتخاب کروں گا۔"

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور نے کہا تھا: "سر محمد اقبال کی موت نے ہماری ادبیات میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جو ایک مہلک زخم سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کے پُر ہونے کے لئے مدت مدید درکار ہے۔ ہندوستان کا مرتبہ دُنیا میں بے حد محدُود اور تنگ ہے، اِس لئے ایک ایسے شاعر کی مَوت کا صدمہ جس کی شاعری عالمگیر اہمیت رکھتی ہے، مُلک کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔"

مکاتیبِ اقبال کے دیباچہ میں ڈاکٹر محمد عباس علی خاں صاحب لمعہ حیدر آبادی کے نام ٹیگور کا جو خط درج ہے، اس کا یہ اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہیں :۔

"اقبال کی نظموں کو جو شہرت اور قبولیت نصیب ہوئی ہے، اس کی بنا پر مجھے یقینِ واثق ہے کہ اقبال کے اِن جواہر پاروں میں ادب جاوداں کی عظمت تابناکی موجود ہے۔ میرے لئے یہ خیال بارہا باعثِ اذیت ہوا ہے کہ بعض نقاد میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کاوشوں کو حریفانہ اور رقیبانہ میزان پہ جانچ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس ادب کے متعلق جس کا خطاب جملہ بنی نوع

انسان سے ہو یہ روش حد درجہ مذموم ہے، کیونکہ ادب عالمگیر کی مملکت میں بلالحاظ زمان و مکان، شعرا و اصحابِ فنون کی ایک انسانی برادری معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں حسن و صداقت کے دو خدمتگذار ہیں اور ہم اس سرحد پر مل جاتے ہیں، جہاں سے انسانی دل و دماغ اپنا بہترین و جمیل ترین ہدیۂ جاوداں عالمِ انسانیت کے حضور میں پیش کرتا ہے۔"

رئیس الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی جاوید اقبال کے نام کے تعزیت نامے میں فرماتے ہیں: "آج کے اخباروں میں اقبال مرحوم کے انتقال پُرملال کا حال پڑھ کر جس قدر صدمہ ہوا اس کا اظہار بذریعہ الفاظ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اپریل ۳۷ء میں بیگم حسرت کا انتقال ہوا تھا، اس سانحہ ہوشربا کے بعد فقیر کا دل مشغلۂ شعر و سخن سے سرد ہو چکا تھا کہ اب اقبال کے اس حادثۂ عظیم نے بیدلی و افسردہ مزاجی کی تکمیل کر دی۔" پھر یہ پانچ شعر لکھے تھے:

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہیں باوصفِ عزم
بر بنائے بیدلی انکار ہے تیرے بغیر

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہو تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہ مباہات و شرف
بہرِ حسرت موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

احباب پر جُدائی کا اثر

رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور جو آپ کے مخصوص اور مخلص احباب میں سے تھے۔ آپ کی جُدائی کا حسرتناک نقشہ اِن جگر پاش الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

"ڈاکٹر صاحب کی موت کا ہم میں سے کبھی کو یقین نہیں آتا تھا جب رات کو گیارہ بجے تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو سب کو خیال تھا کہ ہم سب جاوید منزل جائیں گے۔ چودھری محمد حسین صاحب ان کو دن بھر کے واقعات سنائیں گے۔ جو اُن کے جنازہ کے پُرعظمت جلوس، جمہور کی اشک باری اور شاہی مسجد کے باغ میں اُن کی تدفین کے انتظامات پر مشتمل ہوں گے۔ راجہ حسن اختر صاحب مزار کے نقشے اور مجلسِ اقبال کی تشکیل کے متعلق اُن سے مشورہ کریں گے۔ سید نذیر نیازی صاحب اُن کو بغداد کا کوئی ایسا خواب آور افسانہ سنائیں گے جس سے وہ ہمیشہ کے لئے سُکھ کی نیند سو جائیں۔ میاں محمد شفیع اور میاں علی بخش اُن کے کندھے کو اِس طرح دبائیں گے کہ پھر وہ کبھی درد کی شکایت نہ کریں گے اور میں اُن کی نبض دیکھ کر ایسی خوشگوار دوائیں اور لذیذ غذائیں تجویز کروں گا کہ اُن کے کام و دہن جنت کے لذائذ و نعائم کا سا لطف محسوس کرنے لگیں۔"

"اب بھی صبح کی نماز کے وقت جب کوئی جگانے کے لئے آواز دیتا ہے، تو مَیں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو پھر کچھ تکلیف ہو گئی ہے۔ جو صبح ہی صبح اُنہوں نے یاد فرمایا ہے۔ شفیع صاحب دوسرے

تیسرے روز مطب میں آتے ہیں، اور اُن کو دیکھ کر بدن میں کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی حالت بتانے کے لئے آئے ہیں۔ مگر جب وہ کہتے ہیں کہ شیخ عطا محمد صاحب (ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی) بخار میں مبتلا ہیں۔ علی بخش کو سینہ میں درد ہے، عزیز جاوید اقبال کو کھانسی ہے۔ تو مَیں کھو سا جاتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں چھوڑ کر بادلوں سے بھی پرے بہت دُور کسی ایسے مقام پر چلے گئے ہیں جو اُن کے تخیّل کی طرح بلند و بے پایاں ہے، اور جہاں دوستوں کے آہ و بکا اور عزیزوں کے نالہ و شیون کا گزر نہیں ہے۔"

مشاہیرِ ہند سے مراسم

علّامہ شبلی مرحوم، مولانا حالی مرحوم، حضرت اکبر مرحوم آپ کے بے حد مداح و معترف تھے۔ ان بزرگوں سے خط و کتابت کے ذریعہ مراسم دوستانہ قائم تھے۔ چونکہ ان حضرات کے اصلاحی پروگرام سے اقبال کو عملی اتفاق تھا۔ اِس لئے یہ اقبال کے کارناموں کو خاص عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور پسند کرتے تھے۔ موجودہ صدی کے مشاہیر میں سب اہلِ نظر علّامہ کے درس و پیغام کا احترام کرتے تھے۔ جناب سر شیخ عبدالقادر، جناب نواب سر ذوالفقار علی خاں، جناب مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب سابق صدرِ اعظم دولتِ آصفیہ، نواب مسعود یار جنگ بہادر سر راس مسعود مرحوم، علامہ مولانا سید سلیمان ندوی، جناب میاں سر محمد شفیع مرحوم اور جناب میاں سر فضل حسین مرحوم سے علّامہ کے مخصوص تعلقات تھے۔ اور یہ حضرات اقبال کے

صحیح رتبہ کو جانتے ہوئے ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ مولانا گرامی مرحوم اعلیٰ حضرت تاجدارِ دکن خلد اللہ ملکہ کے اُستاد اور یگانہ عصر تھے۔ علامہ اقبال سے آپ کے خاص مراسم تھے۔ علامہ کی فضیلت و کمال کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ "مجدّدِ عصر" کے الفاظ سے مخاطب کیا کرتے تھے۔

شیرازہ (لاہور) نے لسان العصر اکبر الہ آبادی کے دو خط سر اقبال مرحوم کے نام شائع کئے تھے۔ ان خطوط میں سے بعض اقتباس درج کرتا ہوں۔ اِس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ایسے ایسے با کمال مصلحین علامہ کی بابت کیا خیالات رکھتے تھے۔

لسان العصر لکھتے ہیں :۔

"...... آپ کی نظم میں نے پڑھی[1]۔ ماشاء اللہ چشم بد دُور ..... بعض اور بزرگوار بھی تھے۔ سب نے نہایت تعریف کی۔ منشی صاحب نے تو نقل مانگی ہے لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اثر باعثِ سکونِ خاطر ہے۔ مَیں افسوس کرتا تھا، اور صرف ایک آپ کے ہونے سے وُہ افسوس کم نہیں ہوا کہ قوم کیوں بے بصیرت ہو گئی ہے۔ اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیرِ ہلاکت کی کیوں مؤید ہے ...... اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دُنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقائق کی طرف ہے:۔

کافروں کی مُسلم آئینی کا نظارہ بھی کر!

کس قدر بلیغ و صحیح و لبریزِ معنی ہے۔ اگرچہ یہ لطیف و خوبصورت و بلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ خیال مرتب و

---

[1] جس نظم کا ذکر ہے وہ ہلالِ عید کے عنوان سے بانگِ درا میں شائع ہو چکی ہے۔

باوقعت ہوکر کس کے دماغ کو نصیب ہوتا ہے "گرم گفتاری اور خودداری" کے قوافی بھی حقائق کے مضامین سے مزین ہیں "شکست رشتہ تسبیح" اور "پختہ زناری" آپ کا حصہ ہے۔ الغرض جملہ اشعار لاجواب ہیں۔ میری مدح سے بجز اس کے کہ آپ خوش ہوں اور کچھ ہونا نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن کبھی آپ سے ملاقات ہو اور زبانی گفتگو ان اشعار کے معانی پر ہو تو گوناگوں فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ جو آیندہ طریق عمل کے لئے کار آمد ہوں . . . . . "

دوسرے خط میں لکھتے ہیں :-

" . . . . . میں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا۔ اب تو شکستہ حالی۔ اب کیا ہمیشہ دل کے لئے شکستہ حالی اچھی رہی ہے آب رواں، املی کا درخت، قمری کی آواز، جنگل کا سماں، مسجد کا صحن بہت زیادہ دل کش ہے نصیب نہیں ہوتا۔ ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں ؎

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو

نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ درد سر اپنا

کسی کا پرانا شعر ہے۔ دیکھا کہ وہ بار غم جو میرے دل پر مستولی تھا۔ آپ کے دل نے اُٹھا لیا۔ وہی درد تھا، وہی سمجھ اور بصیرت تھی جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن تشنوادی۔ یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں، اور آپ تو ماشاء اللہ ابھی کم عمر ہیں۔ آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ سوسائٹی اچھی ہو یا بری، خواہ مخواہ اس کا ممبر ہو کر حق الوسع زندگی کو شیریں کرنا ہے . . . . . میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ آپ کبھی ملیں تو مجھ کو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہوگی۔ لیکن آپ

بھی بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی۔ حسن نظامی کی تحریر سے آپ کی مشغولی طاعت و قرآن خوانی کا ذکر دریافت کر کے خوش ہوا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ پس آپ شہداء علی الناس میں داخل ہیں، یا انشاء اللہ داخل ہو جائیں گے میرے حق میں بھی دعا فرماتے رہئے . . . . جب قوم تھی تو سب کہہ سکتے تھے خیر جو کچھ ہو، اب آپ کے سپرد چارج ہے۔ ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت کو مول لینے پر مستعد ہیں۔ آپ کا مصرعہ:۔

در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند

ہم کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ بیدل نے کہا ہے:۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

لیکن آپ کا مصرعہ بلیغ تر ہے۔ آپ نہ مانیں تو میں توضیح کر دوں گا . . . . .“

حال میں ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب زور قادری نے شاد اقبال کے نام سے وہ خطوط مرتب کر کے شائع کئے ہیں جو مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب اور علامہ اقبال نے باہم لکھے تھے۔ ان کے مطالعہ سے ہر دو اکابر کی دلی محبت اور خصوصی تعلقات کا حال معلوم ہوتا ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کا شمار اس وقت کے ہونہار شعرا میں تھا۔ حضرت علامہ ان کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۴ء کے خط میں مہاراجہ صاحب کو سفارش لکھتے ہیں۔“ یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی

لکھنوی کی معرفی کے لئے لکھتا ہوں - یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں - مَیں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے - اِس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے - مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظرِ عنایت فرمائیں گے - اور اگر اُن کو کسی امر میں سرکارِ عالی کے مشورے کی ضرورت ہو گی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے سرکارِ والا کی شرفا پروری کے اعتماد پر اِس درخواست کی جرأت کی گئی ہے[1] -

اقبال کے مزار پر

برسرِ تربتِ ما چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود (حافظ)

علامہ اقبال مرحوم کی حیات کا یہ حصہ کہ آپ کا روحانیت سے کیا اور کیسا تعلق تھا اور آپ کن مدارج پر فائز تھے، اب تک پردۂ خفا میں رہے ہیں خیال کرتا ہوں کہ آیندہ اِس امر پر روشنی پڑے گی، اور بہت سے عجیب عجیب واقعات جو اب تک ہم سے پوشیدہ ہیں، آپ کے ملنے والوں اور آپ کے حالات و کیفیات کے دیکھنے والوں کے ذریعہ دُنیا پہ آشکارا ہوں گے - جناب محمد اشرف خاں صاحب عطا رکن ادارہ احسان نے ایک مضمون میں آپ کی رحلت کے بعد کے چند رُوح پرور واقعات نقل کئے ہیں - مَیں موصوف کے الفاظ میں ۲۷ اپریل ۳۸ء کے احسان سے

---

[1] شاد اقبال

نقل کرتا ہوں :۔

"آقائے مرتضیٰ احمد خاں مدیر و سر و بیر احسان کی زبانی معلوم ہوا کہ چند احباب رات کے وقت علامہ مرحوم کے مزار پر گئے، تاکہ تسکینِ قلبی حاصل کر سکیں جب یہ لوگ مزار پر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک گدڑی پوش فقیر علاّمہ مرحوم کے مزار پر تلاوت قرآن حکیم میں مصروف ہے۔ اس نے قرآن حکیم کا ایک سیپارہ تلاوت کرنے کے بعد ذیل کی آیۂ کریمہ تلاوت کی :۔

اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ o اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ o

(ترجمہ) "بیشک اولیاء اللہ کو کوئی ڈر کی بات نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ لوگ وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے۔ اُن کو دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی"

اس کے بعد یہ گدڑی پوش بابا کھڑا ہو گیا اور اس نے ذیل کا شعر پڑھا اور نہایت خاموشی سے اپنی راہ چلتا بنا۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

ایک آدمی اس فقیر کے پیچھے گیا۔ لیکن اس فقیر نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی، اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا"

"یہ واقعہ پہلی رات کا ہے۔ کل رات کا واقعہ ہے کہ آقائے مرتضیٰ احمد خاں اپنے ایک گورداسپوری دوست کی معیت میں علامہ مرحوم کی قبر پر تشریف لے گئے۔ ایک فقیر گیروے کپڑے پہنے ہاتھ میں دست پناہ (چمٹا) لئے مراقبہ میں بیٹھا

کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دُعا مانگی۔ جاتی دفعہ عربی کا یہ شعر پڑھا۔

فَطُوبیٰ لِبَیْتٍ کَبَیْتِ الْعَتِیْقِ   حَوَالَیْہِ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقِ

(ترجمہ: کیسا عمدہ ہے وہ گھر جو بیت العتیق (خانہ کعبہ) کی مانند (مبارک) ہے جس کے گرد (زیارت کرنے کے لئے) دُور دُور سے تمام نشیب و فراز (کے مقامات) سے لوگ آتے ہیں۔")

اس شعر نے آقائے محترم کو حیرت میں ڈال دیا۔ کیونکہ فقیر کی شکل و شباہت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ بالکل اَن پڑھ ہے۔"

"رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے یکایک دِل میں ایک ٹھیس لگی اور بیقراری میں اضافہ ہو گیا۔ مَیں چارپائی سے اُٹھا۔ کپڑے پہنے اور حضوری باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ناقابلِ بیان کشش مجھے علامہ مرحوم کی قبر پر لیے جا رہی تھی۔ جب مَیں قبر پر پہنچا تو لاہور کا ایک مجذوب بزرگ جسے مَیں ذاتی طور پر جانتا ہوں، قبر پر بیٹھا ہُوا بُڑبڑا رہا تھا۔ مَیں نے فاتحہ پڑھا تو وُہ قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔ میرے دِل پر خوف طاری ہو گیا۔ مجذوب کی آنکھیں سُرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ مَیں فاتحہ خوانی سے فارغ ہُوا تو اُس سے پُوچھا: "بابا ایوب! تم اِس وقت یہاں کہاں چکر لگا رہے ہو؟"

اس نے جواب کڑکتی ہوئی آواز میں دیا: "تجھے معلوم نہیں، کہ آج حضور نبی کریم صلعم کی سواری اس طرف سے گزر رہی ہے اور مَیں یہاں پہریدار مقرر ہوا ہوں۔" مجھے اس مجذوب کی ان باتوں سے خوف آ رہا تھا اور باوجود ہوا کے تیز جھونکوں کے میرا تمام بدن پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا اور جسم بیدِ مجنوں کی طرح

کانپ رہا تھا۔ میں نے چپلی ہاتھ میں پکڑی اور بھاگ نکلا۔ گھر پہنچا لیکن صبح تک میرے حواس درست نہ ہوئے۔ لیکن میرے دِل کو پوری تسکین حاصل تھی!"

اولاد

علامہ نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے مسٹر آفتاب اقبال بیرسٹر ایک صاحبزادہ موجود ہیں۔ دُوسری بیوی سے دو بچے ہیں۔ جاوید اقبال اور منیرہ بانو۔ جاوید اقبال دسمبر ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی بہن منیرہ بانو ان سے عمر میں تقریباً چار سال چھوٹی ہیں۔ علامہ مرحوم نے رحلت سے کئی سال قبل ایک وصیت کے ذریعہ سے اپنے بعد چار حضرات کو ان کا نگراں مقرّر کر دیا تھا۔ اِس وصیت کی رجسٹری ہو چکی ہے اور رجسٹرار کے پاس محفوظ ہے۔ دیگر ضروری ہدایات بعد کے کاغذات میں محفوظ ہیں۔ اِن چار حضرات میں سے ایک خواجہ عبدالغنی صاحب جو اِن بچّوں کے حقیقی ماموں تھے علامہ سے قبل انتقال کر چکے تھے۔ باقی تین صاحبان یہ ہیں چودھری محمد حسین صاحب ایم اے سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پریس لاہور۔ شیخ اعجاز احمد صاحب سب جج (برادرزادہ اقبالؒ) اور حکیم منشی طاہر الدین صاحب۔

عجیب اتفاق

علامہ مرحوم دو بھائی تھے۔ آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب

۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے اور آپ سے تیرہ سال بڑے تھے۔ . . . . . .
. . . . شیخ صاحب گورنمنٹ سے پنشن یافتہ
تھے۔ . . . . یہ شیخ صاحب نقل کرتے ہیں کہ اُن کے دادا اور
والد بھی دو دو بھائی تھے، اور دونوں اپنے بھائیوں میں بڑے تھے لیکن دادا سے
قبل اُن کے چھوٹے بھائی اور والد سے قبل اُن کے برادرِ خورد نے رحلت کی۔
شیخ عطا محمد صاحب کو اس قیاس پر برابر اندیشہ رہا کہ کہیں یہی صُورت تیسری
پشت میں پیش آئے۔ فطرت کا یہ عجیب اتفاق کہ علامہ اقبال چھوٹے تھے۔
اِس لئے آبا و اجداد کی تقلید میں اپنے بڑے بھائی سے پہلے رحلت فرما گئے،
موجبِ حیرت و استعجاب ہے۔

عجیب واقعہ

علامہؒ جس کوٹھی میں قیام فرما رہے تھے، وہ آپ نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ
کی مِلک قرار دی تھی، اور اسی مناسبت سے اس کا نام جاوید منزل رکھا گیا تھا۔
اقبالؒ اِس کوٹھی کے تین کمرے استعمال میں لاتے تھے اور تینوں کمروں کا کرایہ
پچاس روپیہ ماہوار پیشگی ہر مہینہ کی ۱۲ر تاریخ کو بینک میں جمع کرا دیتے تھے۔ ۲۱ر
اپریل کی صبح کو آپ کا وصال ہُوا۔ دن نہ نکل چکا تھا کہ آئندہ ماہ کا کرایہ واجب الادا
قرار پاتا اور آپ اس خود ساختہ فریضہ سے سبکدوش دُنیا سے تشریف لے گئے۔

حلیہ

"شروع عمر میں جسم فربہ، رنگ سرخ و سفید اور رخساروں پر گوشت تھا اس لئے آنکھیں نیم وا معلوم ہوتی تھیں۔ اعضا متناسب اور قوی تھے۔ ورزشی اور کشمیری النسل ہونے کی وجہ سے بہت وجیہ اور شکیل تھے۔ میانہ قامت، فراخ سینہ، تنومند، چہرہ بارعب اور سنجیدہ، داڑھی منڈی رکھتے تھے۔ مونچھیں چھوٹی تھیں۔ آخر عمر میں امراض میں مبتلا رہے۔ جگر، قلب اور پھیپھڑے خراب ہو گئے تھے۔ عرصہ تک گلے کی خرابی سے بول بھی نہ سکتے تھے۔ ان وجوہ سے جسم نحیف و نزار ہو گیا تھا۔ خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ گوشت گھل جانے کی وجہ سے ٹھوڑی کے نیچے، گردن کے پیچھے، سینہ، شکم، ران، پنڈلی سب جگہ کھال لٹک گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو گھس گئی تھیں اور چھوٹی چھوٹی معلوم ہوتی تھیں۔ سرخی تقریباً غائب ہو چکی تھی۔ مگر چہرہ کا رعب، وقار اور متانت آخر دم تک باقی رہی[1]۔"

لباس

"علامہ مرحوم کا لباس ہمیشہ بالکل سادہ اور معمولی ہوا کرتا تھا۔ لباس کے

---

[1] یہ عنوان نیز آیندہ تین عنوان لباس (پہلا پارہ)۔ ملاقات (اوّل چار پارے) اور مسکن (ابتدائی تین پارے) مجھے پروفیسر عبدالباسط صاحب کی عنایت سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس لئے وا دین میں انہی کے الفاظ میں درج کئے گئے ہیں۔ اس نوازش کے لئے میں جناب ممدوح کا ممنون ہوں۔

لئے کبھی کوئی اہتمام نہ کرتے تھے۔ عام طور سے گھر پر شلوار اور قمیص پہنا کرتے تھے۔ عدالت جاتے وقت کوٹ پتلون اور سُرخ رنگ کی سخت ترکی ٹوپی پہنتے تھے کبھی کبھی سیاہ رنگ کی کلپاک استعمال کرتے تھے۔ گرمیوں میں گھر پر سفید کناری دار دھوتی پانچ گزی جس کو دُہرا کر کے بطور تہ بند کے باندھتے تھے۔ اور صرف ایک بنیان پہنے رہتے تھے۔ جاڑوں میں شلوار اور قمیص ہوتی تھی اور ٹانگوں پر کمبل ڈالے رہتے تھے۔ جب جلسوں میں یا اور عام مجلسوں میں شرکت فرماتے تو عموماً شلوار اور ایک شارٹ کوٹ پہنتے تھے اور سر پر ترکی ٹوپی یا کلپاک ہوتی تھی"۔

جناب مرزا جلال الدین صاحب "ملفوظاتِ اقبال" میں لکھتے ہیں:۔

"سادہ پسندی کی وجہ سے انہیں غیر ملکی لباس سے نفرت تھی۔ گو ہائیکورٹ میں انہیں کوٹ پتلون پہن کر جانا پڑتا، اور اکثر معاشرتی تقریبات کے سلسلے میں بھی وُہ انگریزی لباس ہی بہ مجبوری تمام پہن لیا کرتے۔ لیکن موجب تکلف سمجھ کر وہ ہمیشہ اسے بارِ خاطر سمجھتے رہے۔ وہ اکثر شلوار اور چھوٹا کوٹ پہنتے۔ عیدین کی نماز کے موقع پر کبھی کبھی بند گلے کا کوٹ بھی پہن لیا کرتے۔ اسی طرح وہ دیسی جوتی اور رومی ٹوپی کو پسند کرتے۔ کبھی کبھی صافہ بھی باندھ لیتے"۔

مُلاقات

"آنے جانے والوں کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وزیٹنگ کارڈ اور اطلاع کی کبھی چنداں ضرورت نہ ہوتی تھی۔ طالب علموں سے لے کر ہائی کورٹ کے

بجوں تک سب کے ملنے اُن کا دربار کھلا رہتا تھا۔ کسی بڑے آدمی کی ملاقات کے لئے کوئی اہتمام نہ کرتے تھے۔ آخر عمر میں جب کہ اُنہوں نے وکالت کا سلسلہ بالکل ترک کر دیا تھا اور ہمیشہ گھر ہی پر رہتے تھے، تو صبح سے شام تک معتقدین اور احباب کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور وہ اپنا حُقّہ لئے کبھی کُرسی پر، کبھی صوفے پر اور کبھی پلنگ پر معمولی وضع میں بیٹھے ہوئے ملتے رہتے تھے۔"

"جب کوئی ملنے والا آتا تو اُن کا قدیم وفادار ملازم علی بخش اُن کو اطلاع کر دیتا، اور آنے والوں کی تعداد کے مطابق اُن کے پلنگ کے پاس کرسیاں بچھا دیتا۔ وکالت کی حیثیت اُن کی نظر میں ہمیشہ ضمنی رہی۔ اِس لئے وہ مؤکلوں کی آؤ بھگت میں کوئی سرگرمی نہ دکھاتے تھے۔ ملنے والوں کے سامنے کبھی تو وہ خود کسی موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے تھے اور کبھی کسی سوال کے جواب میں تقریر فرمانے لگتے تھے۔ آپ کی تقریر ایسی پُرمغز اور دلچسپ ہوتی تھی کہ سُننے والا کبھی نہ اُکتاتا تھا۔ نسبتاً کم بولتے تھے، مگر جب گفتگو فرماتے تو وہ ٹھوس، برمحل، مدلّل اور سامعین کی فہم کے مطابق ہوتی تھی۔"

"ہر شخص سے اُس کی حیثیت، علمیت، مزاج اور مرتبہ کے مطابق گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ طلبہ کے ساتھ اُن کا انداز ناصحانہ، مشفقانہ، بزرگانہ اور بعض اوقات معلمانہ ہوا کرتا تھا۔ زائرین و مشتاقین کے ساتھ ہمیشہ سنجیدگی اور متانت سے پیش آتے تھے، اور اُن کی تمام باتوں کا مسکت و شافی جواب دیتے جاتے تھے۔ علّامہ مرحوم کی صحبتوں میں جو خاص بات میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی رسم و رواج کے برخلاف آنے جانے والوں سے ان کے ذاتی اور

خاندانی احوال کی بابت بے وجہ استفسارات نہ کرتے تھے۔ چونکہ ہر حیثیت اور ہر قماش کے لوگ شوقِ زیارت میں آیا کرتے تھے، اس لئے علامہ بھی ہر طرح کی گفتگو کے عادی تھے۔ نہ اُکتاتے تھے اور نہ اکتاتے تھے۔"

"بے تکلف دوستوں کے ساتھ اُن کا انداز اور برتاؤ مختلف ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ خوش طبعی، ظرافت اور مزاح بھی فرماتے تھے اور بے تکلفانہ انداز سے ہنستے اور ہنساتے تھے۔ اجنبیوں اور غیروں کے ساتھ بھی بڑے تپاک اور شائستگی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ ہر شخص کے جذبات کا پاس کرتے تھے اور کبھی اظہارِ شخصیت کے لئے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ ملاقاتوں کے دوران میں بھی کبھی کبھی بحرِ فکر میں غوطہ زن ہو جاتے تھے۔ بشرِ سخن تو اس حالت میں بھی جاری رہتی تھی۔ اکثر گھنٹوں خاموش رہا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ مسلسل چار پانچ گھنٹے تک تقریر فرماتے رہے اور نہیں تھکے۔"

جناب میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر مدیر ہمایوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جیسے اقبال ۱۹۳۸ء میں اپنے سالِ وفات میں تھے ویسے ہی وہ سترہ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں تھے۔ وہی حقہ، وہی ان کا نوکر علی بخش، اسی طرح شلوار اور قمیص پہنے چارپائی پر بیٹھے ہیں قمیص کے گلے کا اوپر کا بٹن کھلا ہے۔ عموماً پنجابی میں باتیں کرتے تھے اور دنیا بھر کی باتیں، بڑے سے بڑے مضمون پر، چھوٹی سے چھوٹی بات پر ہو رہی ہیں، جو آئے آ جائے، جو چاہے کہے، جو اُن کا خیال ہے وہ بیان کر رہے ہیں۔ بے تکلفی ہے بات چیت جاری ہے۔ معلومات کا خزانہ ہے کہ سب کے لئے کھلا ہے۔ لیکن کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا

کہ عقلمندی کے موتی بکھر رہے ہیں۔ ادھر ان کا بھی کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ یہ نوعِ انسان کے اور بالخصوص اپنی قوم کے شیدائی ہیں۔ لوگ بُرے ہوں یا بھلے انہیں کیا، وہ بھی انسان ہیں یہ بھی۔ ان کا وقت اُن کا وقت ہے، پھر شکایت کیسی اور رعونت کیوں۔ ایسے ہوتے ہیں بڑے آدمی۔ کسی قسم کا شہنشاہی یا سادھوانہ دکھلاوا بھی نہیں۔ جو ہیں سو ہیں، تشہیر کی ضرورت نہیں، خلوص کی ایک تصویر ہیں۔ حکومت پر، انگریزوں پر، سیاسی لیڈروں پر، نیک نیتی سے تنقید کر رہے ہیں۔ کسی کا ڈر خوف نہیں، کیونکہ کسی کی خوشامد منظور نہیں۔ کسی کا کھائیں تو اُس کا گائیں۔ کسی سے غرض نہ مطلب۔ لیکن یوں واسطہ اور تعلق ہر کسی سے، جو ملے مل جائے۔[۱]"

جناب ڈاکٹر سعید اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"میں عمومیت کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا اپنا تجربہ یہی ہے، کہ جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، سلام کا جواب ہمیشہ ہاتھ اُٹھا کر دیا۔ رسمی گرمجوشی نہیں ہوتی تھی، اس کی جگہ خندہ پیشانی ہوتی۔ جن لوگوں کو ان سے پہلی دفعہ ملنے کا اتفاق ہوتا، ان پر یہ طریق ملاقات کسی قدر گراں گزرتا۔ مگر جو ڈاکٹر صاحب کی راہ و رسم سے واقف تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسی بڑی شخصیت گزری ہو جس کا دروازہ اِس طرح ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا رہے۔ صلائے عام تھی جس کا جی چاہتا چلا آتا۔ گھنٹوں بیٹھتا، باتیں کرتا، انہیں کبھی ناگوار نہ گزرتا۔ دو چار ملنے والے چلے جاتے تو دو چار اور آجاتے۔ صبح سے شام تک یہ دھارا یوں ہی بہتا چلا جاتا۔ اکثر دل میں سوال پیدا ہوتا کہ

[۱] ملفوظاتِ اقبال

ڈاکٹر صاحب کس وقت کھانا کھاتے ہیں، کب پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ لوگ بھی ہر طرح کے ملاقات کے لئے آتے۔ ہم ملاقات کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ کوئی حکیم صاحب تشریف فرما ہیں، اُن سے طب کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ حکیم صاحب گئے تو اخبار نویس آگئے اور سیاسیات کی بحث شروع ہوگئی۔ سیاسیات کی بحث چل رہی تھی کہ ایک اور بزرگ آگئے، اور ڈاکٹر صاحب نے سیاسیات سے گریز کیا، تو خوش طبعی اور لطیفہ گوئی شروع ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض عقیدت مند ایسے بھی تھے جنہیں وہ بنایا کرتے تھے، دوسری دفعہ جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جرمن سیاح ملنے کے لئے آیا ہوا ہے، اور فلسفہ خودی اور زمان و مکان پر بحث ہو رہی ہے۔ وہ صاحب اُٹھ کر گئے تو ایک پہلوان آگئے۔ ان سے پہلوانی کی باتیں ہوتی رہیں۔ بات کسی قسم کی ہو، سر اقبال کا اپنا رنگ قائم رہتا تھا[1]۔"

جناب محمد حسین صاحب عرشیؔ "ملفوظاتِ اقبال" میں لکھتے ہیں: "۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو حاضرِ خدمت ہوا۔ میرے ساتھ حکیم طالب علی صاحب تھے۔ ہمارے حاضر ہونے سے پہلے مشہور شاعرہ اور نائدہ مسز سروجنی نیڈو اور میاں بشیر احمد آف ہمایوں موجود تھے۔ ان سے انگریزی میں بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے شاعرہ کو پہلی اور آخری دفعہ دیکھا۔ اور یہ بات بھی ایک ہی دفعہ دیکھی کہ علامہ شاعرہ کو رخصت کرنے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کوٹھی کے برآمدے تک تشریف لائے[1]۔"

مسکن

"لاہور کے طویل قیام کے زمانہ میں علامہ نے مختلف مکانوں کو اپنی

[1] ملفوظاتِ اقبال

سکونت سے عزت بخشی۔ طالب علمی کے زمانہ میں اور اس کے فوراً بعد جب کہ وہ
اورینٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے، اُس وقت اُن کا قیام اُس مشہور
معروف تاریخی مکان میں رہا جس میں علامہ شبلی نعمانی رح کے اُستاد اور مشہور فاضل اجل
مولانا فیض الحسن رح سہارن پوری عرصہ دراز تک قیام فرما رہے تھے۔ یہ وسیع مکان
جو آپ رائے بہادر ملا رام سرن داس کی ملکیت ہے بھاٹی دروازہ کے اندر لب سڑک
واقع ہے۔"

"جب علامہ بیرسٹری پاس کر کے انگلستان سے واپس آئے تو ٢٤ جولائی
١٩٠٨ء سے آپ نے انارکلی بازار میں اس مکان میں سکونت اختیار کی جس میں
لاہور کے مشہور بیرسٹر میاں سر محمد شفیع مرحوم نے اپنا وکالت کا کام شروع کیا تھا۔ تقریباً
پندرہ سال کے بعد ١٩٢٢ء میں انارکلی سے منتقل ہو کر آپ میکلوڈ روڈ پر ایک کوٹھی
میں آگئے۔ اور تقریباً دس سال تک اسی کوٹھی میں مقیم رہے۔ اسی کوٹھی پر سب
سے پہلے ١٩٢٧ء میں خاکسار کو پہلی بار آپ سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع
ملا۔ اور اس وقت سے لے کر انتقال سے چند روز قبل تک برابر اس شرف کی
تجدید ہوتی رہی۔ ١٩٣٥ء میں علامہ نے جاوید منزل میں سکونت اختیار کی اور
وہیں انتقال فرمایا۔ یہ کوٹھی انہوں نے خود زمین خرید کر اپنے آرام کے لئے
تعمیر کرائی تھی، اور اپنے چھوٹے بیٹے جاوید اقبال کے نام پر اس کا نام رکھا تھا
اسٹیشن سے جاتے ہوئے میو روڈ پر بائیں جانب یہ کوٹھی واقع ہے۔"

"جاوید منزل میں منتقل ہونے کے کچھ دن بعد ہی اُن کی اہلیہ محترمہ
نے ہمیشہ کے لئے مفارقت اختیار کی۔ خاکسار اُس دن جنازہ میں شامل تھا

علامہ کے چہرہ پر انتہائی رنج و غم کے آثار نمایاں تھے، اور آپ ایک سفید قمیص اور شلوار پہنے ہوئے جنازے کے ہمراہ تھے۔ قبرستان اُن کی کوٹھی سے قریب ہی تھا۔ بعد مغرب وہاں پہنچے۔ لیکن قبر کی تیاری میں دیر تھی۔ اس لئے تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں علامہ مرحوم زمین پر بالکل ساکت و صامت اکڑوں بیٹھے رہے۔ بوجہ علالت کمزور ہو رہے تھے۔ پھر اس صدمہ جانکاہ نے اور بھی مضمحل کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہی دن اُن کو بھی اس قدر جلد پیش آنے والا ہے۔"

جناب عبدالواحد صاحب ایم اے "جاوید منزل" کی بابت اپنے تاثرات "ملفوظات اقبال" میں یوں لکھتے ہیں:-

"اس کوٹھی کو دوران تعمیر میں اور تکمیل کے بعد کئی دفعہ دیکھا تھا۔ اس کوٹھی کی طرز تعمیر سے مجھے ہمیشہ مایوسی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے رواق کے ستونوں پر نظر پڑتی ہے۔ یہ ستون پست قد، نازک اور سپاٹ ہیں اور ان کی کرسی مقابلتہً بھاری ہونے کے باعث غیر متناسب معلوم ہوتی ہے۔ صحن میں دائیں اور بائیں جانب جو کمرے بنے ہوئے ہیں وہ بھی قطعاً ناموزوں ہیں۔ کوٹھی کے کمروں کی چھتیں بہت نیچی ہیں۔ اگر عمارت اقبال کی پسند کی ہوتی تو اس میں وسعت، رفعت، اور جبروت کی خصوصیات ہونا چاہئیں تھیں۔ لیکن موجودہ عمارت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں حسن ضرور ہے لیکن یکسانی ہے۔"

حُسنِ اخلاق

حضرت اقبالؒ اخلاق کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ خلیق اور ملنسار تھے۔ ملنے والوں کو آپ کے دروازہ پر دیر تک انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی۔ ہر کہ و مہ سے آپ بے تکلف خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے تھے۔ آپ کے دوستوں کا بیان ہے کہ آپ ہمیشہ متبسم نظر آتے تھے۔ ہم نے کبھی آپ کو غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ کوئی ناگواری ہوتی تو آپ ضبط کرتے۔ تحمل اور ضبطِ نفس لغایت تھا۔ عزم، حوصلہ، ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے مالک تھے۔ جس کام کی نیت فرماتے اس کو تکمیل تک پہنچائے بغیر باز نہ رہتے۔ جھوٹ سے انتہائی نفرت تھی۔ صداقت اور حق گوئی کو پسند کرتے تھے، اور خود بھی کبھی راہِ حق و جادۂ صدق سے عدول نہ کیا۔ تسلیم و رضا کا مجسمہ نظر آتے تھے۔ تکبر، ریا، جاہ پسندی اور ہوسِ دنیا نام کو بھی آپ میں نہ تھی۔ تواضع و انکسار آپ کی خو تھی اور نمود و نمائش سے گریز کرتے تھے۔

بزرگوں سے عقیدت سے ملتے تھے اور چھوٹوں سے محبت سے پیش آتے تھے۔ اپنے والد مرحوم اور بڑے بھائی کی بے حد عزت و حرمت کرتے تھے، اور ان کے آرام و آسائش کا لحاظ فرماتے تھے۔ ملازمین سے مساوات برتتے تھے۔ جب ولایت سے واپسی پر علی بخش (آپ کا قدیم ملازم) ملا تو اس سے معانقہ فرمایا۔ جب آپ ولایت میں تھے تو ایک دفعہ علی بخش کے یہاں چوری ہوگئی، اور اس کا تمام اثاثہ جاتا رہا۔ اسی پریشانی میں اس نے اپنا دردِ دل آپ کو لکھ بھیجا۔ آپ نے کچھ ایسے الفاظ میں اس کی دل دہی اور تشفی کی کہ اس کی تمام پریشانی جاتی رہی۔[1]

[1] اقبال نامہ

جناب میاں بشیر احمد صاحب فرماتے ہیں: "مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک روز میں عشا کے وقت کوٹھی پر گیا تو علی بخش نے مجھے روکا۔ یہ پہلی بار تھی کہ اس بھلے مانس نے مجھے روکا ہو۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دمہ کا دورہ سخت پڑتا ہے اور ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے کہ وہ کسی سے بات کرنے نہ پائیں۔ یہ سن کر مجھے بے چینی ہوئی اور میں نے وعدہ کیا کہ میں بات چیت نہیں کروں گا۔ میں اندر گیا ــــ پوچھا کون ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ فرمایا بیٹھ جائیے۔ میں نے عرض کیا۔ براہِ کرم آپ نہ بولیئے۔ آپ کو تکلیف ہو گی۔ میں نے چند باتیں کیں اور چپ ہو کر بیٹھ رہا۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کہہ دیتے "اچھا" "ہونہہ" ــــ "کہیئے" آخر آدھ گھنٹہ کے بعد میں نے معذرت چاہی فرمایا آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔ دِل بھر آیا کہ اس سخت تکلیف کے عالم میں بھی کس طرح دلجوئی کرتے ہیں[1]۔

خوش طبعی

جناب ڈاکٹر سعید اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ ڈاکٹر صاحب کو ان کی شاعری کے ذریعہ جانتے ہیں، ان کو اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں مزاح اور خوش طبعی کس شدت سے تھی۔ کسی قسم کا موضوع ہو، مزاح کا پہلو وہ ہمیشہ نکال لیا کرتے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حکایات سنانے میں انہیں ویسا ہی کمال حاصل تھا جس طرح فلسفہ

[1] ملفوظاتِ اقبال

کے مسائل بیان کرنے ہیں[1]؟

جناب میاں بشیر احمد صاحب ۱۹۱۴ء کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں" ایک روز میں بار روم گیا تو دونوں دوست (علامہ اقبال اور میاں شاہ نواز صاحب بیرسٹر) بیٹھے تھے۔ اقبال نے مجھے دیکھ کر کہا" آئیے مولانا بشیر!" یہ سُن کر مجھے بے حد شرم آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بائیس سال بعد پچھلی سردیوں میں جب میں اُن سے اکثر ملتا رہا، چند بار اُنہوں نے اسی مولانا سے مجھے مسکرا کر خطاب کیا۔ دُوسری تیسری دفعہ میں نے بھی مسکرا کر ذرا احتجاج کیا کہ ڈاکٹر صاحب میں کہاں کا مولانا ہوں۔ مسکرا کر فرمانے لگے" واہ مولانا کوئی بُری بات ہے، اور کیا مولاناؤں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ آخر کچھ عربی جانتے ہی ہو نا! وغیرہ وغیرہ[2]

علامہ سر شیخ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں:۔

" جو لوگ ان سے ملتے رہے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی ظرافت اور ہنسنے ہنسانے کی عادت کے ساتھ ان میں یہ عجیب صفت تھا کہ سنجیدگی اور متانت بیٹھے بیٹھے ظرافت پر غالب آجاتی تھی اور چہرے پر یکا یک غم آمیز اثرات نظر آنے لگتے تھے[3]

جناب ڈاکٹر سعید اللہ صاحب علامہ اقبال کی زبانی لکھتے ہیں:۔

" نادر خاں سے جب اوّل مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ کابل جاتے ہوئے لاہور میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ میری صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے۔ آپ اقبال ہیں میں تو سمجھتا تھا کہ آپ لمبی داڑھی والے بزرگ صورت ہوں گے میں نے کہا" آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہے۔ آپ تو جرنیل ہیں۔ میں سمجھتا تھا

[1] ملفوظات اقبال

آپ دیوہیکل ہوں گے۔ مگر آپ میں جرنیلی کی کوئی شان نہیں۔ اِس قدر دُبلے پتلے"

بعض دوسرے لطائف کے لیئے عطیہ فیضی صاحبہ کی انگریزی کتاب "اقبال"

کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سادگی

علامہ کی زندگی سادگی کا ایک مجسّم نمونہ تھی۔ باوجود اس کے کہ بڑے بڑے افسران وحکام اور اربابِ علم وفن آپ کے پاس آتے رہتے تھے۔ پھر بھی آپ کے یہاں کوئی ساز وسامان اور شان وشوکت نہ تھی۔ عموماً نواڑ کی چارپائی پر تکیہ لگائے لیٹے ہوئے حُقّہ پیتے رہتے تھے۔ اکثر جسم پر صرف بنیان اور تہمد ہوتا تھا اور اسی طرح مغرب ومشرق کے فضلا وحکما و اُمرا سے ملاقات کرتے تھے۔ آپ کے پاس جانا بیحد آسان تھا۔ نہ دروازہ پر کوئی دربان تھا اور نہ کسی تعینِ وقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہر شخص آزادی سے جب چاہے آپ کے حضور میں باریاب ہوسکتا تھا۔ کسی سے ملتے وقت کبھی تو چارپائی پر چوزانو ہو کر بیٹھ جاتے اور کبھی تکیہ کے سہارے کروٹ سے لیٹے لیٹے گفتگو کرتے رہتے۔

مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں :-

"معاشرتی بحثوں میں وہ ہمیشہ سادہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین فرمایا کرتے۔ بلکہ حضور رسالت مآبؐ کی سادہ زندگی کو اپنا اسلوب بنانا چاہتے۔ جب وہ میری درخواست پر انارکلی سے میکلوڈ روڈ پر اٹھ آئے تو میں نے ان سے مکان

لہ ملفوظاتِ اقبال

کی آرائش کے لئے کہا کہ وُہ اس کے مردانہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائننگ کی صُورت میں تقسیم کر دیں۔ مگر اس پر اُنہوں نے یہی فرمایا کہ وُہ کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے کے باوجود اُنہوں نے اپنا معاشرتی اسلوب وہی رکھا جو انارکلی بازار کے قیام کے دوران میں تھا۔[1]

ذیل کا واقعہ آپ کے سادگی کے نظریہ پر نمایاں روشنی ڈالتا ہے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں: "پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بُلایا، اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً اُن کے دِل میں یہ خیال آیا کہ جس رسولِ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، اُس نے بوریے پر سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا اُن کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دِل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بُلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانہ میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔"[2]

---

[1] ملفوظاتِ اقبال ۔ [2] جوہرِ اقبال۔

انکسار

جس شخص میں اِس قدر سادگی ہو وہ کیا کچھ منکسر المزاج نہ ہوگا۔ علامہ کی بے مثل شخصیت پر نظر ڈالئے اور پھر اِس خط کو دیکھئے جو مرحوم نے "اقبال ملٹری اسکول" قائم کرنے کی تجویز کے جواب میں ارسال کیا تھا اور جسے مسلم لائبریری خورجہ کے تعزیتی جلسہ میں اقبال محمد خاں صاحب نے جو میجر سعید محمد خاں صاحب رئیس جمال پور کے صاحبزادہ ہیں، پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا۔

"محترمی میجر صاحب۔

ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ مَیں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اِس فوجی اسکول کا نام "ٹیپو فوجی اسکول" رکھیں ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے اِس قدر جلد فراموش کر دیئے ہیں بڑی نا انصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ مَیں نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ اِس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زیادہ زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔

نیازمند محمد اقبال"

قناعت

علامہ مغفور کو اپنی ذات کے لئے کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ بے نیازی قناعت اور توکل آپ کا خاصہ تھا۔ باوجودیکہ آپ کے مزاج میں نفاست پسندی بدرجۂ اتم موجود تھی اور لطیف و خوش ذائقہ غذائیں مرغوب تھیں۔ مگر آپ کے ملازم خاص علی بخش کا بیان ہے کہ "اب تو میں خدا کے فضل سے اچھا خاصہ باورچی ہوں لیکن اس زمانہ میں مجھے کچھ واجبی ہی کھانا پکانا آتا تھا۔ پھر بھی جیسا کچھ پکا رہندہ کر سامنے لا رکھتا، ڈاکٹر صاحب صبر و شکر کرکے کھا لیتے تھے۔"

ایک زمانہ میں اکثر احباب کی کوشش تھی کہ حضرت علامہ کو قلمرو آصفیہ میں کوئی مناسب عہدہ مل جائے۔ آپ خود بھی حیدرآباد جانا چاہتے تھے مگر قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ اِس مقصد کے حصول کے لئے کبھی تگ و دو نہ کی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کو لکھتے ہیں "میں نے اب تک اپنے معاملات میں ذاتی کوشش کو بہت کم دخل دیا ہے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو حالات کے اُوپر چھوڑ دیا ہے، اور نتیجہ سے خواہ وُہ کسی قسم کا ہو، خدا کے فضل و کرم سے نہیں گھبرایا۔ اس وقت بھی قلب کی کیفیت یہی ہے کہ جہاں اس کی رضا لے جائے گی جاؤں گا۔ دل میں یہ ضرور ہے کہ اگر خدا کی نگاہِ انتخاب نے مجھے حیدرآباد کے لئے چُنا ہے تو اتفاق سے یہ انتخاب میری مرضی کے بھی عین مطابق ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر بندہ و آقا کی رضا اس معاملے میں کُلّی طور پر ایک ہے۔"

سر راس مسعود مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کوئی امیرانہ زندگی کا

عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے[۱]۔

سکونِ قلب

اقبال نامہ میں علی بخش کی زبانی آپ کی طمانیتِ قلب کا یہ عجیب اور دلچسپ واقعہ درج ہے۔ علی بخش کا بیان ہے کہ :۔

"کانگڑے کے زلزلہ میں لاہور پر بھی بڑی آفت آئی۔ شہر میں بہت سے مکان گر پڑے۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ کبھی گھبرا کر کوٹھے پر چڑھ جاتا، کبھی نیچے آجاتا۔ جب زلزلہ آیا، ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے۔ لیکن جس طرح لیٹے تھے اسی طرح لیٹے رہے۔ ذرا ہلے جلے تک نہیں۔ ہاں میری بدحواسی دیکھ کر ایک دفعہ کتاب پڑھتے پڑھتے مسکرائے اور کہنے لگے "علی بخش! یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو۔ سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ" یہ کہہ کر پھر اسی اطمینان سے کتاب پڑھنے لگے"۔

حضرت علامہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو بھی یہی تعلیم دیتے ہیں، اور یہ شعر لکھتے ہیں :۔

[۱] مکاتیبِ اقبال

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر | از نبی تعلیم لا تحزن بگیر
این سبق صدیق راصدیق کرد | سرخوش از پیمانہ تحقیق کرد
گر خدا داری ز غم آزاد شو | از خیالِ بیش و کم آزاد شو[1]

غیرت

مسلمان کی شان "فقرِ غیور" آئی ہے۔ علامہ نے بھی اپنے کلام میں جابجا اس کی جانب اشارے کئے ہیں۔ حالانکہ آپ کی تمام عمر فکرِ معاش میں گزری۔ مگر آپ میں غیرت مندی کا مادہ بحدِ کمال پایا جاتا تھا۔ اس لئے کبھی آپ نے شیشۂ غیرت پر ٹھیس نہ آنے دی اور "فقرِ غیور" کے ساتھ "فقرِ مستغنی" کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ۷ مارچ ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ سرکشن پرشاد کو جن سے آپ کے مخلصانہ مراسم تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں "انشاءاللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے۔ اللہ نے اس کو نگاہِ بلند اور دلِ غیور عطا کیا ہے، جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے۔"

ایک دفعہ سر اکبر حیدری صدرِ اعظم حیدرآباد دکن نے آپ کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپیہ کا چیک بھیجا۔ چونکہ یہ دوستانہ تحفہ نہ تھا، بلکہ یہ روپیہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا جس کا لینا علامہ کی غیرت کسی طرح منظور نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے آپ نے چیک واپس کر دیا اور یہ شعر لکھ بھیجے ؎

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز | دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

[1] شادِ اقبال

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

مَیں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات
(ارمغانِ حجاز)

آپ نذرانہ کے معاملہ میں کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس خط سے بھی ہو سکتا ہے جو آپ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا ہے۔ تحریر کرتے ہیں:-

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ مؤکلین وکلا کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لئے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں۔ یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں، اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں، کیا یہ مال مسلمان کے لئے حلال ہے[1]"

گوشہ نشینی

جب سے آپ نے وکالت کم کر دی تھی، باہر آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ کبھی کوئی مقدمہ ہوتا تو ہائی کورٹ چلے جاتے ورنہ کچہری جانا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ جب سے آواز بیٹھ جانے کی شکایت پیدا ہوئی آپ نے عدالت جانا بالکل بند کر دیا۔ کوئی شدید ضرورت ہوتی تو گھر سے باہر نکلتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے ابتدا میں جب اعلیٰ حضرت نواب صاحب بہاول پور لاہور آئے اور انہوں نے موصوف سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو علامہ نواب صاحب کی ملاقات اور قیام دار الاختا

[1] مکاتیب اقبال

کی بابت مشورہ دینے کے لئے باہر آئے تھے۔ غالباً اِس واقعہ کے بعد سے آپ پھر جاوید منزل کی حدود کے باہر نہ نکلے۔

قلندری

مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں "اقبال آخر انسان تھے پیغمبرانہ اعجاز رکھنے کے باوجود پیغمبر نہ تھے۔ اِس لئے ان کو ایسی باتوں سے معرّا سمجھنا جو بشریت کا لازمہ اور انسانیت کا خاصہ ہیں، ایک ایسا تمسخر انگیز دعویٰ ہے جس میں نہ تو حقیقت کو دخل ہے، نہ خود ڈاکٹر صاحب کی روح کے لئے مسرت کا سامان موجود ہے۔ اقبال زاہدِ خشک تھے نہ ریاکار صوفی۔ اس میں شک نہیں کہ آخری ایام میں وہ گوشہ نشینی اور درویشانہ زندگی کی وجہ سے دُنیا اور اس کے افراد سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو گئے تھے اور ان کی کیفیت اِس مردِ فقیر کی سی تھی جو اس مادی دُنیا سے بے نیاز ہو کر کسی اور ہی عالم میں کھو یا رہتا ہو لیکن ان کے چہرے پُر تقدس کا جو ہالہ ہر وقت نظر آتا تھا، اس سے یہ کسی طور پر لازم نہیں آتا کہ اُنہیں ان کے اصلی مرتبے سے محروم کر کے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے زمرے میں شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ ان سے علیحدہ رہ کر بھی اقبال کی عظمت و وقار میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہو سکتی"۔[1]

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب فرماتے ہیں "پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لئے تہمد باندھے آگیا۔

[1] ملفوظات اقبال

میں کرسی پر بیٹھا تھا ، میری ٹانگیں دبانے لگا ۔ میں مزے سے بیٹھا رہا اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا ۔ آخر میں نے پوچھا آپ کس طرح آئے ہیں ۔ اس فقیر نے کہا ، میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اُنہوں نے کہا کہ تمہارے علاقہ کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کر دیا گیا ہے ۔ تم اُن کے پاس جاؤ ۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے تو ابھی تک کوئی اطلاع اس قلندری کے بارے میں نہیں پہنچی ۔ میری بات کو اس فقیر نے قلندری کے کوچہ کی کوئی رمز سمجھا ۔ ٹانگیں دباتا رہا ۔ اتنے میں چودھری محمد حسین صاحب تشریف لائے ۔ اور آتے ہی سر سکندر کے بارے میں گفتگو شروع کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا ۔ چودھری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجئے ، آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں ۔"

"اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ۔ جن دنوں میں انارکلی میں رہا کرتا تھا ، ایک دفعہ جاڑے کے موسم میں ایک فقیر نے رات کے دو بجے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ علی بخش نے دروازہ کھولا ۔ میں نے علی بخش سے پوچھا ۔ کون ہے ، اس نے کہا ، ایک فقیر ہے ، آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔ میں بستر سے اُٹھا ، فقیر میرے پاس آکر بیٹھ گیا ۔ میں نے پوچھا ۔ آپ کس طرح تشریف لائے ۔ کہنے لگا ۔ مجھے دوسری جگہ جانے کا حکم ملا ہے ۔ میں جا رہا ہوں ۔ اس لئے آپ سے ملنے آ گیا ۔ میں نے پوچھا ۔ آپ اس دنیا کے لئے کیا کر رہے ہیں ۔ کہنے لگا ، اب امام مہدی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے ، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ اگرچہ شدت کی سردی تھی مگر اس فقیر نے رات کے دو بجے دہی کی لسی پینے کی خواہش ظاہر کی ۔ علی بخش گیا ۔ کسی دکاندار کو جگا کر لسی بنوا کر لایا ۔ اس فقیر نے

پی اور کہا۔ اب میں چلتا ہوں۔ میں نے کہا۔ اس وقت تو ریل نہیں ملے گی۔ اس نے کہا۔ فقیر کو ریل سے کیا غرض"۔ . . . .

. . . . "ایک بزرگ تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نووارد سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہو چودھری جی! آپ کے پیر صاحب کیا کہتے ہیں۔ چودھری صاحب بولے ڈاکٹر صاحب آپ کو کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک دیگ پلاؤ کی پکا کر غریبوں کو کھلا دیں، آپ کا حلق ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: نہ چودھری جی! یہ بات غلط۔ پہلے صحت اس کے بعد ایک کی جگہ دو دیگیں۔ چودھری صاحب نے کہا تو آپ کی مرضی۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ ذرا سے وقفہ کے بعد کہا "ہوں" اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرنے لگے۔ پھر یکایک یا اللہ کی ضرب لگائی۔

غذا

علامہ مرحوم نفیس مزاج اور لطافت پسند تھے۔ اس لئے آپ کو غذا بھی اچھی اور خوش ذائقہ ہی پسند تھیں۔ کئی برس سے آپ دوپہر کو صرف ایک وقت کھانا کھایا کرتے تھے۔ رات کو اکثر کچھ نہ کھاتے۔ خواہش ہوتی تو کوئی ہلکی سی غذا مثلاً دودھ میں دلیہ ڈال کر کھا لیتے۔ جاڑوں میں رات کے وقت سبز چائے کا سماور ملا کر ضرور پیتے تھے۔

رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور فرماتے ہیں:

لے ملفوظاتِ اقبال

"ڈاکٹر صاحب کو پلاؤ اور کباب بے حد مرغوب تھے۔ اور اسے وہ اسلامی غذا کہا کرتے تھے۔ (مرض الموت میں) ان کے لئے بے حد اصرار تھا، اور جب لطائف الحیل سے میں انہیں ٹالتا رہا۔ تو راولپنڈی جانے سے پہلے دو تین مرتبہ اصرار کیا کہ ایک روز آپ کی دعوت یہاں ہو اور آپ میرے سامنے پلاؤ کھائیں۔ تاکہ اگر میں پلاؤ کھا نہیں سکتا تو کم از کم کھاتے دیکھ لوں۔"

نیز لکھتے ہیں (مرض الموت میں) غذا کے متعلق ان کی حس اور بھی لطیف ہو چکی تھی۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اس امر کی خواہش کرتے تھے کہ ان کی غذا کی فہرست میں اضافہ کیا جائے۔ "اگر پلاؤ کی اجازت نہیں ہے تو کھچڑی میں کیا حرج ہے۔ یہ تو سادہ غذا ہے۔" "آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجئے۔" "ہاں تو کھچڑی بھنی ہوئی ہونی چاہیے، جس میں گھی کافی ہو۔" "گھی کم ہونا چاہیے۔ کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے۔" "تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہوگی۔ اچھا کم از کم اس میں دہی تو ملا لیا جائے۔" "مگر آپ کو کھانسی اور تولید بلغم کی شکایت ہے جس میں دہی مضر ہے۔" "تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھاتا اچھا ہے۔"

علامہ بد ذائقہ دوا تک پسند نہ کرتے تھے۔ آپ چاہتے تھے، کہ دوا خوش ذائقہ کم مقدار اور زود اثر ہو۔ اسی لئے آپ حکیم نابینا صاحب کی دواؤں کو بہت پسند کرتے تھے۔ جناب مہر صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت علامہ ڈاکٹروں کی دواؤں کو ویسے بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ کرنل امیر چند صاحب کی تجویز کردہ دوا کا ذائقہ شاید بہت برا تھا۔ اس کے پیتے ہی طبیعت سخت خراب ہو گئی، اور حضرت مرحوم نے یہاں تک

فرما دیا کہ "میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا" جب عرض کیا گیا کہ حضرت! اپنے لئے نہیں تو دوسروں کے لئے تو آپ کا زندہ رہنا ضروری ہے" تو جواب میں ارشاد ہوا کہ میں اس دوا کے استعمال پر زندگی کا خواہاں نہیں ہو سکتا" اس کے بعد حکیم محمد حسن صاحب قرشی نے کوئی دوائی کھلائی جس سے منہ کا ذائقہ اچھا ہو گیا

میووں میں آپ کو انگور اور آم سب سے زیادہ مرغوب تھے۔ آموں کی فصل میں احباب باہر سے آموں کے پارسل بھیجتے۔ مقامی دوست دعوت آم خوری دیتے اور آپ احباب کے ان تحفوں اور دعوتوں کو بہت خوشی کے ساتھ قبول کرتے۔ کہا کرتے تھے کہ میوے ترقی پاتے پاتے انگور بن گئے۔ اور پھر بھی جو کمی باقی رہ گئی، وہ آموں نے دور کر دی۔ یہاں یہ اتفاق بھی قابل داد ہے کہ ہندوستان کا ایک دوسرا زبردست شاعر غالبؔ بھی آموں پر بے حد فریفتہ تھا، اور جس قیمت پر بھی ہو ان کے حصول میں کوشاں رہتا تھا۔

علمی صحبتیں

جب تک علامہ کی صحت سازگار رہی آپ کے احباب و نیاز مند جاوید منزل میں جمع ہو جاتے تھے، اور مرحوم کی حکیمانہ و عالمانہ تقریروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ خرابی صحت کے بعد بھی یہ صحبتیں جاری تھیں۔ ڈاکٹروں کی سخت ہدایات کے باعث حاضرین حتی المقدور ایسی باتوں سے گریز کرتے جن سے اقبال کی طبیعت پر بار پڑے۔ لیکن مرحوم ادنیٰ ادنیٰ باتوں سے

حکیمانہ و عارفانہ نکات پیدا کرتے، اور علم و حکمت کے موتی لُٹانے سے باز نہ رہتے تھے۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ ہر موضوع پر خواہ وہ کسی علم و فن سے تعلق رکھتا ہو، بے تکلف و تأمل ایسی مدلّل و مبسوط تقریر فرماتے کہ سامعین پر وُہ مسائل روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتے۔ آخری ایام تک علامہ نے ان علمی مذاکرات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

خدا شناسی

ایک بار ایک درویش علامہ اقبالؒ کے پاس آیا۔ آپ نے اُس سے دُعا کی درخواست کی۔ پوچھا "دولت چاہتے ہو؟" جواب دیا "میں درویش ہوں، دولت کی ہوس نہیں۔" پوچھا "عزت وجاہ مانگتے ہو؟" جواب دیا "وہ بھی خدا نے کافی بخش دی ہے۔" پوچھا "تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟" جواب دیا "سائیں جی! کیا کہہ رہے ہو۔ مَیں بندہ وُہ خدا۔ بندہ خدا سے کیونکر مل سکتا ہے۔ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ مَیں قطرہ کی حیثیت میں قائم رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں۔"[1] یہ سُن کر اس درویش پر خاص کیفیت طاری ہوئی اور کہا "بابا! جیسا سُنا تھا ویسا پایا۔ تُو تو خود آگاہِ راز ہے، تجھے کسی کی دُعا کی کیا ضرورت ہے۔"

---

[1] صائب کے اس شعر میں بھی یہی مضمون ہے:

وصل جاوید حجاب نظر آگاہ است   قطرۂ ما سفرے کاش ز دریا می کرد

حُبّ قرآن

رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی لکھتے ہیں: "قرآن حکیم سے اُن کو بے حد شغف تھا۔ وہ بچپن سے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کے عادی تھے۔ قرآن حکیم پڑھتے ہوئے وُہ بے حد متاثر معلوم ہوتے تھے۔ آواز بیٹھ جانے کا انہیں سب سے زیادہ قلق یہ تھا کہ وُہ قرآن حکیم بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے بیماری کے دنوں میں بھی جب کبھی کسی نے قرآن حکیم کو خوش الحانی سے پڑھا تو اُن کے آنسو جاری ہو گئے، اور اُن پر لرزش و اہتزاز کی کیفیت طاری ہو گئی"

آپ کلام پاک خاص دل سوزی اور شغف کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔ پڑھتے جاتے اور روتے جاتے حتیٰ کہ اوراقِ مصحف تر بتر ہو جاتے، اور ان کو دھوپ میں سکھایا جاتا۔ آپ کی تلاوت کا خاص قرآن پاک اسلامیہ کالج لاہور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور اس روایت کا عینی ثبوت فراہم کرتا ہے۔

مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر فرماتے ہیں: "مطالب قرآنی پر اُن کی نظر ہمیشہ رہتی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ایک نماز کے دوران میں جب وہ بآوازِ بلند پڑھتے تو وہ آیات قرآنی پر فکر کرتے اور اُن سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک خاص کشش تھی۔ جب وہ قرآن پاک کو بآواز پڑھتے تو سننے والوں کا دل پگھل جاتا"[1]

---

[1] ملفوظات اقبال

حُبِّ رسولؐ

آپ سرکارِ دو عالم کی سیرتِ پاک کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ حضور کی ذات بابرکات مجمع ہے تمام کمالات ظاہر و باطن کا۔ اور سرچشمہ ہے تمام مظاہر حقیقت و مجاز کا۔ اقبالؒ کا کلام شاہد ہے کہ وہ جگہ جگہ اس امر کا بیانگِ دُہل اعلان کرتے ہیں :۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

علاّمہ کی طبیعت میں اس قدر سوز و گداز تھا ، اور آپ حُبِّ رسولؐ میں اس قدر سرشار تھے کہ جب کبھی حضورؐ کا ذکرِ خیر ہوتا بے تاب ہو جاتے اور دیر تک روتے رہتے۔ اگر کسی وقت آپ سرکارِ دو عالمؐ کی سیرتِ پاک کے کسی عنوان پر تقریر فرمانے لگتے تو ایسی عام فہم ، سیر حاصل اور شگفتہ بحث کرتے کہ ہر موافق و مخالف حضورؐ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اگر آپ کے سامنے کوئی مسلمان "محمد صاحب" کہتا تو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ایک بار کسی نے سرورِ دو عالمؐ کی شانِ مبارک میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے تو آپ نے فوراً اس کو محفل سے نکلوا دیا اور بے حد برہم ہوئے۔

مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں :۔

"خواجہ حالی مرحوم کے مسدس کے تو عاشق تھے۔ میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مذاق ملازم تھا۔ اسے ستار بجانے میں خاص دسترس تھی اور وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز کے ساتھ سنایا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے

ساتھ پھر دوسرے تیسرے اس سے مسدس سُننے کی خواہش کرتے۔ حضور سرورِ کائنات کی تعریف میں وہ بند جو "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" سے شروع ہوتے ہیں، جو مسدس حالی کے آخر میں ہیں، انہیں بطورِ خاص مرغوب تھے۔ ان کو سنتے ہی ان کا دل بھر آتا، اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے۔ اسی طرح اگر کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو ان کی آنکھیں ضرور پُرنم ہو جاتیں۔[1]

حضرت علامہ کے نزدیک عشقِ رسول سرِّ دین بھی ہے اور وسیلۂ دُنیا بھی۔ اس کے بغیر انسان نہ دین کا نہ دُنیا کا۔ فرماتے ہیں:-

ہر کہ از سِرِّ نبی گیرد نصیب — ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب
در دلِ مُسلم مقامِ مصطفیٰ است — آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است
ہستیٔ مُسلم تجلّی گاہِ او — طورہا بالد ز گردِ راہِ او
می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ است
زندہ تا سوز او در جانِ تست — ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تست

فارسی اور اُردو کے کلام میں بکثرت اشعار آپ کے ان جذباتِ عقیدت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں بارگاہِ ربّ العزّت میں عرض کرتے ہیں کیسی والہانہ شیفتگی ہے:-

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست — سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

---

[1] ملفوظاتِ اقبال

بیعت

عرصہ تک اس امر کا کسی کو علم نہ تھا کہ علامہ کسی سلسلہ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں۔ عام طور پر خیال کیا گیا تھا کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ لیکن سب سے پہلے اس راز کی عقدہ کشائی امیرِ ملت اعلےٰحضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری نے مئی ۱۹۳۵ء میں فرمائی تھی۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ "اقبال نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے والدِ مرحوم سے بیعت ہوں"۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے۔ وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا"۔

مکاتیبِ اقبال کے خط نمبر ۳۵ میں جو مولانا سلیمان ندوی کے نام ہے علامہ اقبال فرماتے ہیں "یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں"۔

عطیہ فیضی صاحبہ اپنی انگریزی کتاب "اقبال" میں لکھتی ہیں کہ "ان کے والد نے ایک ولی اللہ کی ہدایت کے مطابق مہینوں ریاضت اور چلہ کشی کی تھی، اور اقبال کو لڑکپن ہی میں علومِ باطن خود سکھائے تھے"۔ عطیہ فیضی صاحبہ کا بیان ہے کہ اقبال نے اپنے والد کے کشف و کرامت کی بابت یہ واقعہ خود انہیں سنایا تھا کہ "ایک روز اندھیری رات میں آہٹ سے اقبال کی آنکھ کھل گئی تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی والدہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ اقبال بھی ان کے پیچھے لگے تو دیکھا کہ ان کے والد صاحب صحن میں بیٹھے ہیں اور ان کے گرد نور

کا ایک ہالہ قائم ہے۔ اقبال لڑکے تو تھے ہی، چاہا کہ قریب جائیں۔ مگر ان کی والدہ نے روکا اور بہلا پھسلا کے سونے کو بھیج دیا۔ صبح اٹھ کر اقبال اپنے والد صاحب کے پاس گئے تاکہ ان سے رات کا قصّہ دریافت کریں۔ ان کے والد صاحب نے اقبال اور اُن کی والدہ کو یہ قصہ سنایا کہ کابل سے ایک قافلہ آرہا تھا۔ وہ لوگ سخت پریشان ہیں اور ان کے ساتھ ایک مریض ہے، جس کی حالت بے حد خطرناک ہے۔ ایسی حالت میں وہ سفر نہیں کر سکتے اور قیام پر مجبور ہوئے ہیں۔ ضرور ہے کہ میں فوراً ان کی مدد کے لئے جاؤں۔ چنانچہ وُہ کچھ اشیا لیکر تانگہ میں تیزی سے اس طرف روانہ ہو گئے۔ اقبال بھی ہمراہ تھے۔ قافلہ والے مریض کی نازک حالت کے باعث سخت پریشان تھے۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ قافلہ کسی بڑے رئیس کا ہے جو مریض کو علاج کے لئے کسی بڑے شہر میں لئے جارہا ہے۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد صاحب نے رئیسِ قافلہ سے ملاقات کرکے مریض کے دیکھنے کی فرمائش کی۔ وہ لوگ اُن کی آمد سے حیران تھے۔ اس لئے کہ ان کو گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ بستی سے دُور اس طرح کوئی اُن کی پرسش کو اس قدر جلد آسکتا ہے۔ مریض کی حالت واقعی خطرناک تھی، اس لئے کہ موذی مرض نے اس کے جسم کے بعض اعضا کو بالکل کھا لیا تھا۔ شیخ نور محمد صاحب نے کچھ راکھ سی اس کے ماؤف جسم پر لگائی اور اہلِ قافلہ کو اطمینان دلایا کہ مریض یقیناً زندہ رہے گا اور خدا نے چاہا تو اس کے جو اعضا مرض سے ضائع ہو گئے ہیں وہ بھی پھر سے اچھے بھلے ہو جائیں گے۔ کسی کو شیخ صاحب کے کہنے کا یقین تو کیا آتا۔ مگر وُہ لوگ اس وقت کر بھی کیا

سکتے تھے۔ لیکن چوبیس گھنٹہ ہی میں مریض کی حالت اتنی سدھر گئی کہ اس کے مرنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ چند روز میں قافلہ آگے بڑھ گیا اور شہر پہنچتے پہنچتے مریض قطعاً صحت یاب ہو چکا تھا۔"

علامہ مرحوم دوسرے سلسلے کے مشائخ سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی رح، حضرت داتا گنج بخش رح، حضرت سلطان المشائخ رح اور دیگر رہبرانِ کامل کا ان کی تصنیفات میں اکثر ذکر ہے، جن سے والہانہ عقیدت شیفتگی ظاہر ہوتی ہے، اور آپ ان سے استناد اور ان کے اتباع کی پُر زور تعلیم دیتے ہیں۔

اقبال بیعت کی اہمیت کے کس قدر قائل و معترف تھے، اس کا ثبوت اس خط سے بھی ملتا ہے جو آپ نے ۶ مارچ ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھا ہے۔ اس خط میں آپ اپنے صاحبزادہ آفتاب اقبال صاحب کی بابت لکھتے ہیں: "لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طباع ہے، مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں۔ یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے ۔؎

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز[۱]

آپ نے اپنے صاحبزادہ جاوید اقبال کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں ان میں جا بجا ایسے اشارات پائے جاتے ہیں جن میں آپ نے ان کو ہدایت کی کہ مردانِ خدا کا دامن پکڑو۔ "جاوید نامہ" کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" سے سمجھئے

[۱] شاد اقبال

بہ زبانِ نو، میں "مردانِ خدا کے پوشیدہ ہونے اور ان کی تلاش میں سرگرم رہنے کی بابت واضح الفاظ میں فرماتے ہیں :-

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں | در بدن غرق است وکم داند زجاں
چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود | مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیابد جستجو آں مرد را | گرچہ بیند روبرو آں مرد را
تو مگر ذوقِ طلب از کف مدہ
گرچہ در کارِ تو افتد صد گرہ

نیز فرماتے ہیں :-

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر | جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا | اللہ کی شان بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا | بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

سحر خیزی

آپ کے خادم علی بخش کا بیان ہے " جن دنوں ہم بھاٹی دروازہ میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ پورے دو مہینہ بڑی باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے۔ ان کا عجب حال تھا۔ قرآن اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے کہ جی چاہتا تھا، کہ بس سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انہی کے پاس بیٹھا رہوں۔ اس زمانے میں کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے، خدا

جانے اس میں کیا رمز تھی۔

علی بخش کا یہ بیان سفرِ انگلستان سے پہلے زمانہ کی بابت ہے۔ میرے ایک دوست نے جو حضرت علامہ سے بارہا شرفِ نیاز حاصل کر چکے تھے اور جن کا قیام علامہ کے مکان کے بالکل مقابل میں تھا۔ بیان کیا ہے کہ "میری تو جس وقت بھی رات میں آنکھ کھلی، مَیں نے یہی منظر دیکھا کہ علامہ اقبال نماز پڑھ رہے ہیں یا تلاوت کر رہے ہیں۔ اتفاق سے میرا ان کا کمرہ بالمقابل تھا۔ درمیان میں وسیع سڑک تھی۔ اِس لئے ہر حرکت کا علم تو میرے لئے ممکن نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اب وہ کیا کر رہے ہیں۔"

اقبال کی سحر خیزی اور شب بیداری کا ثبوت ان خطوط سے بھی ملتا ہے جو آپ نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھے تھے جنہیں ڈاکٹر زور نے شادِ اقبال کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

۱۳؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں: "لاہور کے حالات بدستور ہیں۔ سردی آ رہی ہے۔ صبح چار بجے کبھی تین بجے اُٹھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد نہیں سوتا سوائے اس کے کہ مصلے پر کبھی اونگھ جاؤں۔"

۱۱؍ جون ۱۹۱۸ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں: "اِنشاءاللہ کل صبح کی نماز کے بعد دُعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ آج رمضان المبارک کی پہلی ہے۔ بندۂ رُوسیاہ کبھی کبھی تہجّد کے لئے اُٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجّد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دُعا کروں گا کہ اس وقت عبادتِ الٰہی میں بہت لذّت پیدا ہوتی ہے۔"

لے اقبال نامہ

کیا عجب کہ دعا قبول ہو جائے"۔

اولیاء اللہ سے عقیدت

علامہ اقبالؒ خاصانِ خدا اور اہل اللہ سے بہت محبت و عقیدت رکھتے تھے، اور ان سے بہت عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ لاہور کے ایک بڑے عام جلسہ میں علامہ ذرا دیر کر کے پہنچے۔ کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ فرش پر بھی لوگ بیٹھے تھے۔ ایک طرف حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری مدظلہ العالی کرسی پر بیٹھے تھے۔ آپ ان کے سامنے فرش پر آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "اولیاء اللہ کے قدموں میں جگہ پانا بھی موجب فخر ہے"۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور کہا "اور اقبال جس کے قدموں میں آجائے اس کے فخر کا کیا ٹھکانا!" ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے کہ ایک صحبت میں حضرت پیر صاحب قبلہ نے علامہ سے کہا۔ "آپ کا ایک شعر تو ہمیں بھی یاد ہے"۔ یہ کہہ کر یہ شعر پڑھا۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

علامہ یہ سُن کر بے حد مسرور ہوئے اور کہنے لگے "تو میری نجات کے لئے اتنا ہی کافی ہے"۔

جناب مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر فرماتے ہیں :-

"حضور رسالت مآبؐ کے ساتھ انہیں جو دلی بستگی تھی اس کی وجہ سے انہیں اولیائے کرام سے بھی خاص عقیدت تھی، اور وہ ان کے مزارات پر گاہ

حاضر ہوا کرتے۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخشؒ) اور شاہ محمد غوثؒ کے مزارات پر اکثر جاتے اور اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار فرماتے۔ وہ پیشہ ور پیروں کے ہمیشہ خلاف رہے۔ لیکن اگر انہیں کوئی مردِ کامل نظر آجاتا تو وہ ضرور اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ ایک مرتبہ پانی پت کے چند اشخاص نے مجھے اپنے مقدمہ میں وکیل کیا۔ یہ اصحاب حضرت خواجہ غوث علی شاہ صاحب قلندرؒ پانی پتی کے سجادہ نشین حضرت سید گل حسن شاہ صاحبؒ مصنف تذکرۂ غوثیہ کے مرید تھے۔ اس زمانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کا بہت شہرہ تھا۔ میرے مؤکل جب لوٹنے لگے تو میں نے شاہ صاحب کو سلام بھیجا، اور کہلا بھیجا کہ کبھی پانی پت کی طرف آنے کا موقعہ ملا تو ضرور حاضرِ خدمت ہوں گا۔ دو تین ماہ بعد ایک دن اچانک اُنہیں اصحاب میں سے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے: "لو شاہ صاحب خود ہی تشریف لے آئے ہیں۔ ان دنوں وُہ امرتسر میں مقیم ہیں۔ اگر تم ان سے ملنا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔" میں نے شاہ صاحب کے جائے قیام کا پتہ دریافت کر کے انہیں تو رخصت کیا۔ اور خود ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئے۔ اتنے میں سر ذوالفقار علی خاں تشریف لے آئے اور ہم تینوں ٹرین پر سوار ہو کر امرتسر پہنچے۔ شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد ہم چلنے کی نیت سے اُٹھنے لگے تو اقبال نے شاہ صاحب سے کہا کہ وہ عرصہ سے سنگِ گردہ کے مریض ہیں۔ وہ ان کے لئے دُعا کریں کہ انہیں اس شکایت سے نجات ملے۔ شاہ صاحب کہنے لگے "بہت اچھا! لیجیئے میں آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ آپ بھی ہاتھ اٹھائیں۔" دُعا کے بعد ہم نے اجازت لی اور لاہور کی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ راستے میں ڈاکٹر

صاحب پیشاب کی نیت سے غسل خانے میں تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو ان کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے "عجب اتفاق ہوا ہے پیشاب کے دوران میں مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک چھوٹا سا سنگریزہ پیشاب کے ساتھ خارج ہو گیا ہے۔ مجھے اس کے گرنے کی آواز تک سنائی دی، اور اس کے خارج ہوتے ہی طبیعت کی ساری گرانی جاتی رہی"[1]

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"تصوف کی بحث "کرامات"، "دستِ غیب" اور "بخشش" کے سوال کو لے آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ قصے سمجھ میں تو نہیں آتے مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کبھی سمجھ میں آ جائیں۔

"دستِ غیب سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین صاحب سلیم رحمہ نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندر رح نے مولانا وحید الدین سلیم رح کو بلایا اور کہا کہ "تمہارا باپ ہمارا دوست تھا۔ ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں۔ جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا، پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے" پیر صاحب رح سے رخصت ہو کر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں، نہ آٹا نہ دال۔ وظیفہ پڑھا گیا۔ تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ کر تعلیم حاصل کی۔ جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ بند کر دیا۔ سر سید رحمہ سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے سر سید سے کہا کہ آپ نیچری ہیں مگر ہمارے وظیفہ کے بارے

[1] ملفوظات اقبال

میں آپ کیا فرماتے ہیں؛

کرامت کی بھی ایک مثال ڈاکٹر صاحب نے سُنائی۔ فرمایا سرسید احمدؒ کی طرح ان کے باپ کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے، اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے، اس کا کچھ علاج کیجئے۔ پیر صاحب نے کہا۔ دیکھیں۔ سرسیّد کے والد نے سر آگے بڑھایا۔ پیر صاحب نے ان کی داڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا۔ بھئی! ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی۔

بخشش کی بھی مثال سنائی۔ فرمایا۔ ایک سب انسپکٹر پولیس ہے وہ سانپ کے کاٹے کا دم کرتا ہے اور شفا ہو جاتی ہے۔ کئی سو میل سے بھی دم کا اثر ہو جاتا ہے۔[1]

جناب محمد حسین صاحب عرشی لکھتے ہیں: ایک صحبت میں مَیں نے علاّمہ ابن جوزی کی تلبیسِ ابلیس کا ذکر کیا۔ اس میں مصنف نے کامل جرأت اور پاک دلی سے ابلیس کے ہتھکنڈوں اور مقدس مذہبی جماعتوں پر اس کے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں صوفیہ کے معائب بھی دِل کھول کر بیان کئے ہیں۔ مَیں نے اس حصّے کا کچھ ذکر کر کے حضرت علاّمہ کی رائے دریافت کی۔ آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ مَیں نے کہا۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی روش بھی تصوّف کے خلاف ابن جوزی رہ سے کچھ کم نہیں۔ آپ نے اِس پر بھی کچھ ایسے الفاظ فرمائے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ بعض لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور نظرِ بظاہر عیب چینی شروع کر دیتے ہیں۔[1]

---

[1] ملفوظاتِ اقبال

حق گوئی و بیباکی

علامہ اقبال کو زندگی میں ایسے بہت مواقع پیش آئے کہ جب حیات کی ملمع کاریاں اور علائق دُنیا کی طلسم بندیاں آپ کو اپنی راہ پھلانا چاہتی تھیں۔ لیکن آپ نے راستبازی اور حق گوئی کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا اور نہایت بیباکی سے اپنے پیغامِ عمل کو دُنیا اور ملت کے سامنے پیش کرتے رہے بعض مندوں کو شکایت ہوئی۔ عیب جو حضرات نے الزام تراشے اور نکتہ چینوں نے تہمتیں باندھیں۔ مگر اس مردِ حق آگاہ و حق گو کے پائے ثبات نے لغزش نہ کی۔ خود فرماتے ہیں:۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
مَیں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اِک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

اِس سلسلے میں آپ کو مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر آپ دل شکستہ نہ ہوئے!۔

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
مَیں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوقِ شکرخند

جب علامہ کو سر کا خطاب ملا تھا تو آپ کے مخلصوں تک کو شک ہو چلا تھا کہ شاید اس کے بعد آپ کی حق گوئی و بے باکی میں کمی آ جائے۔ لیکن جیسا کہ ابتداً ذکر کیا جا چکا ہے، آپ نے جلسۂ عام میں بھی اپنی مشہور انقلابی قومی نظم طلوعِ اسلام

کے اشعار سنا سنا کر حکومت کے سامنے سنا کر اس کا عملی ثبوت دیا تھا کہ آپ "زہر ہلاہل" کو کبھی قند نہ کہہ سکیں گے۔ اس ذیل میں آپ کے ایک خط سے یہ اقتباس پُرلطف نظر آئے گا۔

جناب میر غلام بھیک صاحب نیرنگ کو لکھتے ہیں:- "میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا مگر جس دنیا کے ہم اور آپ رہنے والے ہیں، اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آئے اور آرہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاءاللہ"[1]

یہی جذبہ اور خلوص اور جوش عمل تھا جس نے پیام اقبال کو صور اسرافیل کا اثر بخشا، اور خود اقبال کو "چشم جہاں" میں مشرف و ممتاز بنایا۔ فرماتے ہیں:-

ہے میری بساط کیا جہاں میں ۔۔۔ بس ایک فغان زیر بامی
اک صدق مقال ہے کہ جس سے ۔۔۔ میں چشم جہاں میں ہوں گرامی

خلوص خدمت

یوں تو حضرت علامہ کی تمام تر تصانیف آپ کی محبت قوم اور خلوص

[1] مکاتیب اقبال

خدمت کے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن آپ کے اِس جذبے میں کس قدر جوش اور خلوص تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی فرماتے ہیں کہ "جب تک ان کو قریب سے نہ دیکھا جائے، اس شیفتگی اور عشق کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو ان کو اسلام اور حضرت پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا۔ ایک رات میں ان کو نہایت اچھی حالت میں چھوڑ کر آیا۔ نبض کی رفتار امید افزا تھی۔ مگر جب میں نے صبح جا کر نبض دیکھی تو وہ بہت خفیف تھی۔ میں بہت پریشان ہوا۔ شفیع صاحب کو الگ لے جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات کو مسلمانوں کے متعلق سوچتے رہے اور پھر شدت سے روتے رہے۔ اس وقت ان پر دیر تک موت کی سی کیفیت طاری رہی، اور خطرہ تھا کہ ان کے قلب کی حرکت نہ رک جائے۔"

خود حضرت علامہ سر سید راس مسعود مرحوم کو لکھتے ہیں، "چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآنِ حکیم کے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں، جو تھوڑی سی ہمت و طاقت مجھ میں باقی ہے، اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد، حضور نبی کریمؐ کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا۔"[1]

لیکن باوصف اس بے پناہ جوشِ خدمت اور اس کے روشن نتائج کے آپ کے خلوص اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ نہ ستائش کی تمنا رکھتے تھے، اور نہ "صلے کی پروا"۔ عشرت رحمانی صاحب کو ایک خط میں تحریر فرمایا ہے: "رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پہ باندھنا چاہیئے، اس کے متعلق کیا عرض

[1] مکاتیب اقبال

کروں مقصود تو بیداری سے تھا۔ اگر بیداریِ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں۔ لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کے "تذکرہ" کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں محمد علیؒ، شوکت علیؒ اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی ہے۔ لیکن اگر کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں[۱]۔"

دنیوی نام و نمود سے آپ کی بے غرضی اس حد تک تھی کہ میاں بشیر احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں "ایک روز میں نے کہا کہ افسوس ہے، قوم نے آپ کی پوری قدر نہ کی۔ بانگِ درا یا دوسری کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بک جاتیں۔ میرے دوسرے فقرے کو انہوں نے پسند نہ کیا۔ کہا کہ قوم غریب ہے اور نا قدری کا یہ جواب دیا کہ جب کوئی غریب آدمی شہر سے آ کر میری مٹھی چاپی کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں، کہ ساری دنیا میری قدر کر رہی ہے۔ اِک روز میں نے بعض سیاسی لیڈروں کا ذکر کیا جوش میں آ کر فرمانے لگے کہ یہ لوگ سب خود غرض ہیں اور ایثار نہیں کر سکتے۔ لیڈر امیروں کی جماعت میں موجود ہی نہیں۔ مسلمانوں کے لیڈر عوام میں سے پیدا ہوں گے۔ تم دیکھ لینا ایسا ہو کر رہے گا۔ پھر وہ لوگ رہنمائی کر سکیں گے[۲]۔"

---

[۱] مکاتیبِ اقبال۔ [۲] ملفوظاتِ اقبال

عمل کی ترغیب

"ایک بار ایک بے روزگار جوان العمر شخص علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی ناکامی و نامرادی اور بدقسمتی و بے روزگاری کا دکھڑا رونے لگا۔ آپ اس کو تسکین دیتے رہے اور ثابت قدمی و حوصلہ مندی کا سبق سکھاتے ہوئے فرمایا: "انسان دنیا میں عمل کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں جہاں یہ آیا ہے کہ جن و انس عبادت کے لئے پیدا کیے گئے ہیں، وہاں عبادت سے بھی عمل ہی مراد ہے۔ ہر انسان ادنیٰ پیمانہ پر خود ایک خالق ہے، اور ان تخلیقی قوتوں کو ضائع کرنے کا نام گناہ ہے۔ تم کامیابی اور ناکامی پر نظر نہ کرو، اپنے مقصد تخلیق کو جانو اور جد و جہد کیے جاؤ۔"[1] اسی فلسفہ سے علامہ کی تمام تصنیفات لبریز ہیں: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عملی زندگی

ایک بار بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں آیا۔ مختلف سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ وفد کے ایک ممبر نے کہا کہ "آپ کی تعلیمات نے مدت کی سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا۔ اور آپ نے انسانیت اور اسلام کے تمام اسرار و رموز ہم کو سکھا دیئے۔ لیکن ہمیں شکایت ہے کہ آپ نے خود نمونہ

[1] شیرازہ لاہور، اقبال نمبر

عمل پیش نہیں کیا۔" سر اقبال رح نے جواب میں فرمایا۔" کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے، اور تمہارے سامنے "عمل" کی شاہراہ پیش کر دی ہے میرا کام ہے درس دینا، آگے یہ تمہارا ذمہ ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کرو، اور میدانِ زندگی میں جہاد کرتے رہو۔" پھر آپ نے کہا۔" دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی اصولی نظریہ قائم کیا ہو اور خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو۔ کیا آپ تاریخِ عالم میں کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں؟" اس کے بعد کچھ دیر سکوت کر کے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا اور فرمانے لگے "البتہ دُنیا میں صرف ایک ہی ایسی ہستی گزری ہے جس نے ایک درس اور پیغام پیش کیا اور پھر خود ہی اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ آپ لوگ جانتے ہیں وہ شخصیت کون تھی۔ وہ ذات محمد عربی صلعم کی تھی۔ . . . یا پھر مثال میں حضرت موسیٰ کا نام لیا جا سکتا ہے"+

طلبہ کو پیغام

جناب پروفیسر عظیم الحق صاحب جنیدی ایم اے۔ بی ٹی، علیگ فرماتے ہیں کہ "میں ۳۴-۱۹۳۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پاتا تھا۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کے پہلے ہفتے میں یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے طلبہ تعلیمی تجربات کے مطالعہ کے لئے لاہور گئے تھے۔ اسی سلسلہ میں شاعرِ مشرق، ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر اقبال رح کی قدم بوسی کی سعادت بھی نصیب ہوئی"+

"اسلامیہ کالج کے بورڈنگ سے جس وقت ہم لوگ علامہ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو ہمارے قلوب میں متضاد جذبات موجزن تھے ہم سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ سعادت ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور اکثر نگاہِ شوق ناکام ہی واپس آتی ہے۔ اس کا تصوّر کرکے جب اپنی بے بضاعتی پر غور کرتے، تو اس کا یقین ہو جاتا تھا کہ ہمارے نصیب ایسے کہاں کہ شرفِ باریابی حاصل ہو۔

"بہرحال اُمید و بیم کا یہ تکلیف دِہ احساس دِل میں لئے ہوئے روانہ ہوئے۔ نگاہیں بے تابانہ سڑک کے دونوں طرف منزلِ مقصود کی متلاشی تھیں۔ خیال تھا کہ کوئی عالی شان کوٹھی ہوگی۔ خوش نما چمن، سرسبز روشیں، نظر فریب کیاریاں اور رنگ برنگ کے پھول اس کی زینت ہوں گے۔

"ایک دفعہ جو اپنی طرف کو نگاہ اُٹھی تو ایک بوسیدہ سے پھاٹک پر "محمد اقبال بیرسٹر" کا سائن بورڈ آویزاں نظر آیا۔ اور اس سے متّصل ایک لوہار کی دُکان تھی۔ مکان اور اس کے غیر شاعرانہ ماحول کو دیکھ کر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ مکان کے اندر دو سُرخ و سپید بچے اینٹوں کے وکٹ بنائے گیند بلا کھیلنے میں مصروف تھے۔ جنہوں نے اپنی مشغولیت میں ہماری طرف توجّہ بھی نہ کی۔ مکان اندر سے اپنے مکین کی بے نیازی کا زبانِ حال سے گلہ کر رہا تھا۔ ایک ملازم کو تعارفی خط دیا۔ جس کو لے کر وہ علامہ کے کمرے میں گیا۔ اِس کے جانے کے بعد ہماری وہی کیفیت تھی جو نامۂ شوق دے کر نامہ بر کی رخصت کے وقت ایک ہجراں نصیب بدبخت عاشق کی ہوتی ہے۔ ابھی ہم اِسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ

آدمی واپس آیا اور یہ مژدۂ جانفزا لایا کہ علامہ ملاقات کے لئے تیار ہیں۔ ہم اُن کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ایک وجیہ سُرخ و سپید فلسفی شاعر جس کی صُورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وُہ قوم کی تباہ حالت اور انسانیت کی پستی کو دیکھ کر بے چین ہے چادر اوڑھے ایک کرسی پر بیٹھا تھا، سلام کیا اور مصافحہ شروع ہُوا۔ علامہ نے جس جوش اور خلوص سے مصافحہ کیا، اس سے اسلامی اخوت کی شان جھلکتی تھی، ہم سب خاموش تھے۔ ہم نے کمرے پر نگاہ ڈالی، تو جا بجا کتابوں کے ڈھیر تھے۔ کچھ کتابیں کھلی ہوئی تھیں، کچھ بے ترتیب پڑی تھیں۔ فرش کا قالین، کُرسیاں، کمرے کی دیواریں اور صرف دو تصاویر (جن میں ایک خود علامہ کی تھی) اس کی شاہد تھیں کہ ان کا مالک ظاہر پرستی سے متنفر ہے، اور جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کا قائل نہیں۔ علامہ نے خود ہی مُہرِ سکوت کو توڑا اور دریافت فرمایا کہ ہم نے تعلیمی کام کیوں پسند کیا ہے۔ علامہ جیسے شخص کو اس کا جواب دیتے ہوئے ہر شخص نے تامل کیا۔ آخر علامہ نے خود ہندوستان کے طریقۂ تعلیم اور اس کے مُضر اثرات پر روشنی ڈالی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "ہماری تعلیم دماغی ترقی کے لئے کوئی ذریعہ مہیا نہیں کرتی اور نہ وسیع النظر بناتی ہے۔ ہر علم کی تعلیم اس قدر ناقص دی جاتی ہے کہ ہم اس علم سے متعارف بھی نہیں ہو سکتے۔ روحانیت کی طرف ترغیب تو کیا ہوتی، مذہب اور ہم سے دُور ہو جاتا ہے۔"

"اس قدر گفتگو نے ہماری ہمتوں کو بلند کر دیا تھا۔ چنانچہ علامہ سے درخواست کی گئی کہ وہ ہمیں اُردو میں اپنا پیغام دیں، اور ایک بیاض اور قلم پیش کیا گیا۔ آپ نے مسکرا کر لے لیا، اور فکر میں سرنگوں ہو گئے، اور چند منٹ کے

بعد مندرجہ ذیل شعر بیاض میں تحریر فرمایا:۔

صحبتِ پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہُوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

"وقت زیادہ گزر چکا تھا، اِس لئے اجازت طلب کی گئی۔ اس مختصر صحبت میں ہم میں سے ہر شخص پر ایک بیخودی کی سی کیفیت طاری رہی۔ ایک سحر تھا جو ہم کو بے خود بنائے رہا۔ زندگی کے چند لمحات جو ایسی جلیل القدر ہستی کی صحبت میں گزرے، قابلِ صد فخر و انبساط ہیں۔"

اسلام میں کوئی ذات نہیں

ایک بار طلبہ کی ایک جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ میں آپ کو صرف ایک نصیحت کرتا ہوں۔ اور آپ میری رائے کو عام شہرت دے دیجئے ہر ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے کہ وُہ ذات پاک کی لعنت کو یکسر ترک کر دے۔ آپ کی ذات صرف اسلام ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس امر پر اصرار کریں کہ ہماری ذات صرف مسلمان ہے اور کچھ نہیں۔ اسی طرح ہر مسلمان کو خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو بیکار نہ رہنا چاہیئے، اور اپنے دست و بازو کی امداد سے کمانے میں سعی کرنا چاہیئے"

اقبالؒ اس طرح اسلام میں کہتے ہیں:۔

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ افغانی نہ ایرانی

اسلامی افسانے

ایک مرتبہ علامہ کی صحبت میں افسانہ نویسی کا تذکرہ چھڑ گیا تو آپ نے فرمایا "افسانوں کے نفسیاتی پہلو کے لطف کا میں ضرور قائل ہوں لیکن اگر ان کی جگہ ایسی شے پیش کی جائے جو افسانے کا افسانہ ہو اور سبق کا سبق تو بہتر ہوگا۔ اسلام کے اولوالعزم فرزند ایسے ایسے کارنامے انجام دے چکے ہیں کہ ان کا تذکرہ بہتر سے بہتر افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ میری مدت سے خواہش ہے کہ کوئی ادیب یا مؤرخ اس سلسلہ کو شروع کرے۔ تاریخ اسلام میں اس کے لئے بہت مواد موجود ہے۔ صوفیائے اسلام، علمائے اسلام، مجاہدینِ اسلام، شعرائے اسلام، فلسفیانِ اسلام وغیرہ ہر عنوان پر ایک دلچسپ تذکرہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔"

الدُّنیا سجنُ المومن

جب ۱۹۲۲ء میں مولانا عبدالمجید سالک قیدِ فرنگ سے رہا ہو کر ملنے آئے، تو آپ آبدیدہ ہو کر بغلگیر ہوئے۔ خیریت، جیل کے حالات، خوراک وغیرہ کی تفصیلات دریافت کرتے رہے اور فرمایا "مومن دُنیا کے تعیّشات کے لئے نہیں بنایا گیا۔ بندۂ مومن کو دُنیا میں محنت و مشقت میں بسر کرنی چاہئے۔ مذہب کے حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہئے۔ دُنیا کافروں کے لئے ہے ان کو یہیں جنّت ملتی ہے۔ مومن کے لئے تمام عیش و نعم جنّت میں مہیّا کئے گئے ہیں۔ وہاں ابدی

کسی قسم کی پابندی و مشقت نہ ہوگی۔ جو شخص اِس قیدِ دُنیا سے اِس حقیقت تک پہنچ جائے، اس کے لئے یہی تپ، باعثِ فلاح اور نعمتِ الٰہی ہے۔"

طبِّ اسلامی

علامہ اقبال مرحوم شروع میں طبِ یونانی کی نسبت کوئی اچھا خیال نہ رکھتے تھے، اور اس طریقِ علاج کے معتقد نہ تھے۔ جب پنجاب طبی کانفرنس کی صدارت کے لئے آپ کو دعوت دی گئی تو اسی وجہ سے آپ نے صدارت قبول کرنے سے گریز کیا۔ آخر حکیم محمد حسن صاحب قرشی کچھ اور اطباء کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور علامہ سے دو تین گھنٹہ طبِ یونانی پر بحث کی جس سے علامہ پر اچھا اثر ہوا۔ اور آپ نے صدارت قبول کر لی، اور خطبہ صدارت میں طبِ یونانی کی حقیقت و اہمیت کے متعلق حوصلہ افزا الفاظ کہے۔

اس کے بعد اپنی اہلیہ کی علالت کے سلسلہ میں آپ نے حکیم محمد حسن صاحب قرشی سے رجوع کیا۔ پھر خود اپنی بیماریوں میں حکیم نابینا صاحب اور حکیم قرشی صاحب سے علاج کراتے رہے۔ گزشتہ چند سال میں آپ طبِ یونانی سے بے حد خوش اعتقاد ہو گئے تھے اور ایلوپیتھک سے زیادہ یونانی علاج کو پسند کرتے اور ترجیح دیتے تھے۔ علامہ فرمایا کرتے تھے کہ درحقیقت یہ طبِ اسلامی ہے۔ لوگ غلطی سے اس کو طبِ یونانی کہتے ہیں۔

اسلامی نشان

چاند اور ستارہ یا محض ہلال اسلامی نشان سمجھا جاتا ہے۔ اس کے آغاز کے متعلق مختلف نظریے ہیں۔ اس مسئلہ میں علامہ کی رائے کا معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ آپ نے غازی عبدالرحمان صاحب کو لکھا تھا:۔

"نشان ہلال کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، یہ نشان نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے عہد میں مروج نہ تھا۔ بعض مغربی مؤرخین نے لکھا ہے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔ میرے خیال میں ترکوں کو اس کی ترویج سے کوئی تعلق نہیں غالباً صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں اس کی ترویج ہوئی۔ (صلیبی جنگوں کے تذکرے میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے) اور کچھ عجب نہیں کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ صلاح الدین ایوبی ترک نہ تھے کرد تھے۔ سُنی دنیا اس نشان کو اپنا قومی نشان تصور کرتی ہے۔ ایران کا نشان اور ہے۔ میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاقی طور پر شروع ہوا۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کیا۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے، اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ تاریخی پہلو سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے موجد نے اس کے نمو کے خیال سے جاری کیا یا چاند سورج سے اپنا سلسلۂ نسب کے ملانے کے خیال سے۔ مگر تمام اُمّت کا اس پر

صدیوں سے اجماع ہوچکا ہے۔ جن اسلامی قوموں کا نشان اور ہے، وہ اس نشان پر کبھی معترض نہیں ہوئیں اور حدیث صحیح ہے کہ میری اُمّت کا اجماع ضلالت پر نہ ہوگا اس واسطے اس کو ضلالت تصوّر کرنا ٹھیک نہیں۔[۱]

ادارۂ اسلامیات

جناب مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر فرماتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں علومِ اسلامی کی نشر و اشاعت کا خیال ہمیشہ رہا۔ وہ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر حالات مساعدت کرتے تو وہ ایک اسلامی دارالاشاعت کی طرح ڈالتے۔ جو اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی سعی کرتا۔ وہ کہا کرتے کہ علومِ اسلامی کے متعدد اَوراق ایسے ہیں جن کی اشاعت اس زمانے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ ایک ایسی اسلامی لائبریری کی ضرورت کو بھی شدّت سے محسوس کیا، جہاں مذہب کے متعلّق تمام ضروری کتابیں مہیّا ہوں۔ اس طرح وہ ایک ایسے اسلامی ادارے کے قیام کے بھی خواہشمند تھے جس کے توسط سے علومِ اسلامی کا احیا ہو۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ اگر کہیں سے زمین اور اخراجات کا انتظام ہوسکتا، تو وہ اپنی دیرینہ آرزو کو عملی شکل دیتے۔ ملّاؤں کے طائفہ نے اسلامی ترقی کو ہندوستان میں جس قدر ضعف پہنچایا ہے، اسی پر ان کا دل ہمیشہ جلتا۔ وہ ان کی سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے اپنے ذہن میں ایک اسکیم تیار کر رہے تھے بلکہ آخری دنوں میں اُنہوں نے اعلیٰ حضرت

۱۔ مکاتیبِ اقبال

سرکار بہاول پور کی خدمت میں اس سکیم کے بارے میں ایک خط بھی ارسال کیا۔ ان کے اس ادارے کی تجویز نے خود مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میں نے بہاول پور میں اس کی سرپرستی کا انتظام کرنا چاہا۔ بلکہ بہاول نگر کے گرد و نواح کو اس کام کے لئے اپنے ذہن میں منتخب بھی کر لیا۔ جن دنوں وہ بیمار تھے، میں کرنل مقبول حسین قریشی وزیر بہاولپور کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچا اور میں نے انہیں بتلایا کہ میں کرنل موصوف کے توسط سے سرکار بہاول پور کی خدمت میں ان کے ادارے کی سرپرستی کے لئے درخواست کرنے والا ہوں۔ اس خبر سے وہ بہت خوش ہوئے مگر اُن کی بے وقت موت نے اس کام کو وہیں روک دیا۔¹"

یہ ادارہ کس قسم کا ہونا چاہئے تھا، اس کی بابت حضرت علامہ کا وہ خط جو مرزا صاحب کے مسطورۂ بالا بیان کے مطابق نواب صاحب بہاول پور کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا ابھی شائع نہیں ہوا ورنہ اس سے علامہ کی پوری اسکیم سامنے آ جاتی، اور آج دولتِ خداداد پاکستان اس کی طرف توجہ کر سکتی۔ لیکن علامہ کے ایک عربی خط کا ترجمہ اسی طرح کی ایک تجویز کی بابت مکاتیبِ اقبال میں حضرت علامہ المصطفٰی المراغی الشیخ جامعۃ ازہر (مصر) کے نام شامل ہے۔ اس کا اقتباس دلچسپی کے لئے درج ذیل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل

¹ ملفوظاتِ اقبال

حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں، اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیبِ حاضرہ کے شور و شغب سے دُور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں، جو کہ ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو، اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتاب موجود ہو، اور ان کی رہنمائی کے لئے ایک ایسا معلّم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصارتِ تامہ رکھتا ہو، اور نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو مقرّر کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنّت رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی روح سے واقف کرے، اور تفکّر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدّنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں"۔

ایک خط میں علّامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا،

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اِس قسم کے تعلیمی اسلامی ادارے کی اہمیّت کا کس قدر احساس تھا۔ فرماتے ہیں "میرے نزدیک عوام کی زندگی میں "قدیم" ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ "جدید"۔ بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علومِ اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے معنوی استیلا کا اندیشہ ہے جس کا سدِّ باب ضروری ہے۔ میرا ایک مدّت سے یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالکِ اسلامیہ

کی کوئی مدد نہیں کرسکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کرسکتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ندوہ، علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔

جدید تعلیم یافتہ مسلمان

حضرت علامہ اسلامی ممالک اور مسلمانانِ ہند کے احوال سے سخت مضطرب رہتے تھے۔ جدید تعلیم اور اُس کے نتائج ان کے نزدیک بیحد خطرناک تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ مسلمان علومِ اسلامی اور تعلیماتِ دینی سے دُور ہوتا جاتا ہے اور اس کی تربیت جس ماحول اور جس انداز میں ہو رہی ہے وہ اس کے مستقبل کو تاریک بنا رہا ہے۔ اسی لئے وہ اسلامی تعلیمات کے لئے ایک ایسا اصلاحی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جو "تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد" کرسکے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں: "مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اَور راہ اختیار نہ کرے۔ حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"[1]

ایک اَور خط میں انہی کو تحریر کرتے ہیں: "مَیں خود مسلمانوں کے انتشار

[1] مکاتیبِ اقبال

سے بے حد دردمند ہوں۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔[۱]

نیاز احمد صاحب کو لکھتے ہیں: "مذہبی مسائل بالخصوص اسلامی مذہبی مسائل کے فہم کے لئے ایک خاص تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی نئی پود اس سے بالکل کوری ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تعلیم کا تمام غیر دینی ہو جانا اس مصیبت کا باعث ہوا ہے۔"[۲]

خواجہ عبدالوحید صاحب کا بیان ہے کہ حضرت علامہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فرمایا "میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بیکار ہیں، بالخصوص ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان، ان کا خیال تھا کہ اگر کبھی کام آسکتے ہیں تو غریب مزدور پیشہ یا دوکاندار مسلمان، جن کے لئے ان کے دل میں محبت اور عزت ہے اور جن سے مل کر انہیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ ان کے نزدیک مستحق التفات نہیں۔"[۱]

علامہ کا یہ اضطراب اور دل شکستگی ہمارے احوال و کردار کے باعث تھا اور درست تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مرض کو لاعلاج سمجھتے تھے۔ انہیں بے چینی اس لئے تھی کہ راہ رو نہ صرف یہ کہ منزل کی راہ و رسم سے ناواقف ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ راہ سے بھٹک گیا ہے، اور بدقسمتی سے راہ نما اور راہ بر ناپید ہے ورنہ وہ بخوبی احساس رکھتے تھے کہ ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

[۱] مکاتیب اقبال [۲] ملفوظاتِ اقبال

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام کے خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔ "آپ مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف اور بالخصوص اسلام کے خلاف اس وقت عمل کر رہی ہیں مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام کے لئے تڑپ ہے۔ لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔"

"لاہور کانگریس نے آزادیٔ کامل کا اعلان کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں آزادی کے لئے ایک ولولہ موجود ہے مگر ؎

مشکل این نیست کہ بزم از سر ہنگامہ گزشت
مشکل این است کہ بے نقل و ندیم اند ہمہ[1]"

حکیم الامت کو جوانانِ ملت کی طرف سے جو خطرات اس وقت تھے، آج کے حالات اُن سے مختلف نہیں ہیں۔ دل کی وہی "نامحکمی" اب بھی ہے، اور آج بھی "بزم بے نقل و ندیم" ہے۔ "کافرادا" کا "غمزۂ خوں ریز" اب بھی "متاعِ دین و دانش" کے لوٹنے میں مصروف ہے۔ کیا اب بھی "غیرتِ ملی" جوش میں نہ آئے گی؟ کیا دلوں میں اب بھی "سوزِ آرزو" پیدا نہ ہوگا؟ حکیم الامت نے جس "غوغائے رستاخیز" کی پیشگوئی کی تھی اس کا ایک انقلابی پہلو سامنے آچکا، مٹی نم ہوگئی لیکن ابھی اس مٹی کو "زرخیز" ہونا باقی ہے ؎

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

[1] مکاتیب اقبال

دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!
وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دِل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

"آبِ نشاط انگیز" کے اس علاج کی تشریح خود علّامہ سے سنیئے۔ سید الطاف حسین صاحب بیان کرتے ہیں "ایک عرصہ کے بعد ان سے پھر ملنے کا اتفاق ہوا۔ میرے علاوہ ایک پروفیسر صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ سلسلۂ کلام شروع تھا، جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ" ہمارے نوجوان اگر آج بھی اپنے اخلاق درست کرلیں تو میں اُمید کرتا ہوں کہ ان کا مستقبل خوشگوار ہوگا" دورانِ گفتگو میں پروفیسر صاحب نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! آج تک کوئی قوم یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہوئی۔ کہنے لگے۔ "یہ خیال صحیح نہیں۔ مختار قومیں عام طور پر اپنے محکوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اِس لئے مسلط کر دیتی ہیں کہ ان میں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہ ہوسکے۔ اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے۔ آپ محض ایک قوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ نہیں ہوسکتی۔ مگر خیال فرمایئے قرآن تو قیامت کا قائل ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم کیا ساری دُنیا مر کے ایک بار پھر زندہ ہو جائے گی"[1]

نیاز احمد صاحب کے نام کے خط میں حضرت علّامہ لکھتے ہیں: "میرے

[1] ملفوظاتِ اقبال

خیال میں آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ آپ کو اسلام، اس کی مذہبی اور سیاسی تاریخ، اس کے کلچر اور اس بحران کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں مغرب کے افکارِ جدیدہ کے اسلامی زندگی اور افکار پر اثر نے پیدا کر دیا ہے۔ آپ عیسائیوں کی تبلیغی طرز سے زیادہ اسلام پر کتابیں لکھ کر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اسلام میں تنخواہ دار مبلّغین کی انجمنیں کبھی نہیں تھیں۔ تبلیغ کا کام انفرادی کوشش اور سرگرمی پر موقوف رہا ہے۔ افریقہ کا حلقہ بگوش اسلام ہونا ایسے مسلمانوں کی انفرادی کوششوں کا مرہونِ منت ہے جن کے پاس اس خدمت کے ظاہری وسائل موجود نہ تھے۔ ہندوستان میں بھی اشاعت اسلام کا کام شخصی اور انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔[1]

حافظ محمد فضل الرحمٰن صاحب انصاری کو تحریر فرماتے ہیں: "جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لئے یورپ جانا بے سود ہے: ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مصر جائیے۔ عربی زبان میں مہارت پیدا کیجئے۔ اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوّف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمد عربی صلعم کی اصلی روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے۔ پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمت اسلام

[1] مکاتیب اقبال

کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے"[1]

مسلمان اور اُردو

جناب میاں بشیر احمد صاحب فرماتے ہیں :- "گزشتہ سال اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد میں اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ وہ پنجاب لیگ کے صدر تھے۔ اکثر اُن سے سیاسی معاملات پر گفتگو رہتی۔ کئی بار میں نے مُسلم قوم اور اُردو زبان کے مستقبل کی بحث چھیڑی۔ اُردو زبان کے متعلق میں نے گاندھی جی کے مخالفانہ رویّہ کی شکایت کی اور کہا کہ تعجّب ہے کہ قومیّت اور ہندوستانیت کا نام لے کر ہمارے کلچر اور مشترکہ زبان کو یوں ملیامیٹ کیا جا رہا ہے۔ ایک روز میں ذرا جوش میں آ گیا اور پھر مایوسی کا اظہار کرنے کو تھا کہ مسکرا کر فرمانے لگے کہ "ڈرو مت۔ تمہاری قوم اور زبان اس طرح مٹانے سے مٹیں گی نہیں"[2]۔

لوحِ مزار

ممنون حسن خاں صاحب کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے اپنے کتبۂ مزار کے لئے خود رُباعی لکھی تھی۔ لیکن سر راس مسعود مرحوم کے انتقال پر وہ رُباعی ان کے مزار کے لئے بھیج دی۔ تحریر فرماتے ہیں :-

[1] مکاتیب اقبال [2] ملفوظاتِ اقبال

"مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لئے میں نے مندرجۂ ذیل رباعی انتخاب کی ہے:

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل — ز بند این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمے چند — گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

یہ رباعی میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لئے لکھی تھی۔ لیکن تقدیرِ الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ اُن کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔ لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع اُن کے سنگِ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہوگا:-

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں[1]

علامہ کے دو خط

(۱)

"میرے نام"

جب حکومتِ ایران نے فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی منانے کا اعلان کیا تو علامہ اقبالؔ مرحوم کو بھی دعوت دی تھی۔ میں اس زمانہ میں حلیم مُسلم ہائی سکول کانپور میں ہیڈ مولوی تھا۔ دِل چاہتا تھا کہ کسی کا ساتھ نصیب ہو جائے تو میں بھی اس

[1] مکاتیبِ اقبال

موقع پر ایران ہو آؤں۔ علامہ مرحوم سے بہتر اور کس کی ہمرکابی ہو سکتی تھی۔ اس لئے میں نے مرحوم کو خط لکھا اور اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ علامہ ان ایام میں علیل تھے۔ پھر بھی آپ نے جلد جواب دیا اور لکھا:۔

"مکرمی! السلام علیکم۔ میں کچھ عرصہ سے علیل ہوں، ناسازیِ طبع کے باعث سفر کا ارادہ ملتوی کر چکا ہوں۔ آپ کا قصد ہے تو ضرور جائیں۔ قنصل جنرل ایران سے خط و کتابت کر کے جزئیات معلوم کر لیں"

نیاز مند محمد اقبالؒ

افسوس ہے کہ یہ قیمتی خط میرے پاس سے تلف ہو گیا۔ اپنی ڈائری میں سے نقل کر کے یہاں شامل کرتا ہوں کہ یادگار رہ جائے۔

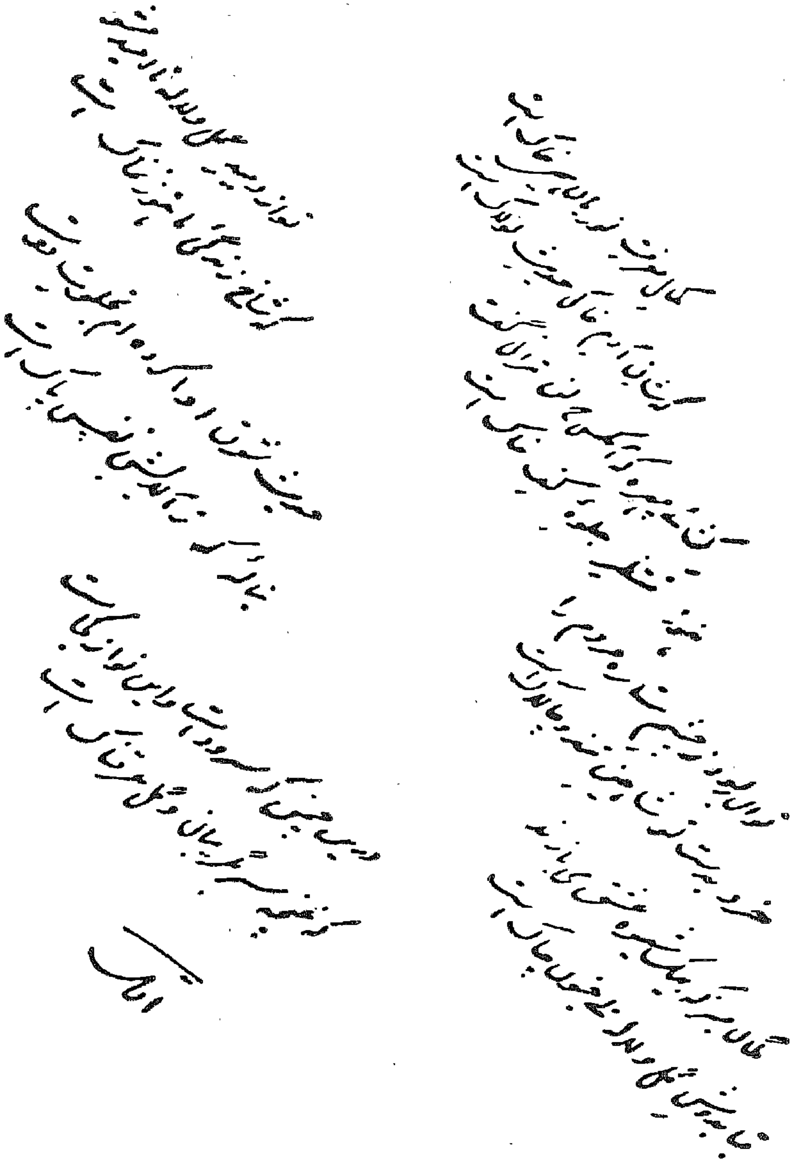
(۲)

پروفیسر الف جیلانی مرحوم ناظم انجمن شبان المسلمین میرٹھ کے نام

ڈیر مسٹر جیلانی

آپ کا خط مجھے مل گیا ہے۔

آپ کے پمفلٹ مجھے یقین ہے کہ بہت مفید ثابت ہوں گے افسوس ہے ہندوستان کے مسلمان عقائد کی جنگ میں مبتلا ہو کر اسلامی دستورِ حیات کو فراموش کر گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسم پرستی اس قوم میں عام ہو گئی۔



علامہ اقبال رحمہ کے ایک خط کا عکس

اور اسلامی ممالک میں بھی کم و بیش یہی حال ہؤا مگر چونکہ وہ ممالک نسبتاً آزاد ہیں وہاں قانون کے ذریعہ رسم پرستی دُور کی جا سکتی ہے اور کی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں سوائے مخلصانہ تبلیغ کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ خدا کرے آپ کی کوشش بارآور ہو۔

مَیں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے سے کسی قدر اچھا ہوں

محمد اقبال۔ لاہور

۱۳ ستمبر ۱۹۳۶ء

شاعری

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگا ہے

اقبال رح

میر۔ غالب۔ اقبال

نتیجۂ فکر
مولانا الحاج حامد حسن صاحب قادری صدر شعبہ فارسی اُردو
سینٹ جانس کالج آگرہ

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کے فیضِ طبع نے اُردو کو گنجِ زر دِیا
اک اثر میں بڑھ گیا، اِک رفعتِ تخئیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دِیا
کائناتِ شاعری ہیں بس یہی دونو کمال
تیسرے میں اس لئے دونو کو یکجا کر دیا

اِبتدائی مشق

جس زمانہ میں اقبال سیالکوٹ میں تعلیم پاتے تھے، اِنہی دنوں میں آپ کو شعرگوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ علامہ میر حسن مرحوم اپنے کسی شاگرد کو شعر کہنے کی ترغیب نہ دیتے تھے۔ بلکہ بعض حالات میں تو سختی سے منع کر دیتے تھے۔ مگر اقبال رح کے شعر سُن کر اُن کی ژرف نگہی نے شاعر کے مستقبل کو جانچا اور ہمت افزائی کی۔ بعض موقعوں پر تو علامہ نے آپ کے اشعار کی ایسی داد دی جو ایک نوعمر نومشق کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہو سکتی تھی۔ مگر وہ شاعر جو فطرت سے خاص طور پر شعر کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اور جس کی شانِ استغنا داد و تحسین سے بالاتر تھی، اِس ہمت افزائی سے اَور سنورتا چلا گیا۔

جب علامہ اقبال رح لاہور آئے۔ وہ زمانہ وُہ تھا کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے مرجعِ عام و خاص بنے ہوئے تھے۔ مولانا حالی، حافظ نذیر احمد، شہزادہ ارشد گورگانی جیسے برگزیدۂ ادب حضرات ان اجتماعوں کو اپنی شرکت سے زینت بخشا کرتے تھے۔ اِن محفلوں میں کسی نومشق شاعر کے لئے مرکزِ توجہ بن جانا اور ایسا چمکنا کہ اپنی تابانی و درخشانی سے آفاق کو خیرہ کر دے، ایک غیر معمولی بات ہے۔

اِس زمانے کے لاہور کے مشاعرے بھی خاص اہمیت رکھتے تھے۔ یہ صحبتیں صحیح معنوں میں اہلِ علم و ادب کی محفلیں ہوتی تھیں۔ اقبال نے بھی [illegible]

کے اصرار پر مشاعروں کی شرکت کا ارادہ کیا۔ ان دنوں علامہ خط و کتابت کے ذریعہ اُستاد داغ مرحوم سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ اشارہ بے موقع نہ ہوگا کہ داغ نے اقبال کی کچھ غزلوں پر اصلاح کرنے کے بعد ان کو صاف صاف لکھ دیا کہ "اب آپ کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے"۔ اقبال رح نے مشقِ سخن غزل گوئی سے شروع کی تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُنہوں نے قومی و مُلکی شاعری شروع کردی۔ غزلوں تک میں وہی رنگ جھلکنے لگا۔ داغ کا اندازِ تغزل اس رنگ سے بالکل جُدا تھا جس کی جانب اقبال کی طبعِ دراک اُن کو لئے جا رہی تھی۔ اس لئے نواب فصیح الملک نے جو خود ایک بے مثل جوہر شناس تھے، ان کی اصلاح غیر ضروری سمجھی۔ کیونکہ وہ پہچان گئے تھے کہ اقبال کسی اور مقصد کے لئے شعر کہتا ہے۔ اس کا مقصد مشاعروں میں چمکنا نہیں بلکہ اپنے اشعار سے دُنیا کو چمکا دینا ہے۔

اقبال کا اسی ابتدائی زمانہ کا ایک مقطع ہے:

نسیمِ تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

داغ کے شاگردوں میں بعض دائرۂ تغزل میں نمایاں حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے اور بعض اہلِ فن بھی نکلے۔ مگر اقبال نے جس روش پر سخن گوئی کی اور جو مرتبہ حاصل کیا، وہ خود استاد کے لئے موجبِ مباہات بن گیا۔ سر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر بانگِ درا کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبولِ عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی اُنہوں

نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور مَیں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے"۔ مَیں کہتا ہوں کہ یہ بات اس زمانہ کی ہے جب اقبال کی پیغمبرانہ شاعری کی ابتدا تھی۔ اس شاعری کی معراج کو اگر اُستاد داغ ملاحظہ فرماتے تو اس نسبتِ اُستادی پر ناز و غرور کی کوئی حد نہ باقی رہتی، اور "کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید" کا مصداق ہوتے۔

لاہور میں اِن دنوں بھاٹی دروازہ کے اندر حکیم امین الدین صاحب مرحوم بیرسٹر کے مکان پر کامیاب مشاعرے ہُوا کرتے تھے، وہاں اقبال بھی جانے لگے۔ ایک مشاعرہ میں اقبال نے غزل پڑھی، جب یہ شعر سُنایا:-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی پھڑک اُٹھے۔ بے اختیار داد دی اور فرمایا "میاں اِس عمر میں یہ شعر!" یہ غزل اس قدر کامیاب ہوئی کہ تمام لاہور آپ کے کمالِ شعر کا اعتراف کرنے لگا۔ اسی غزل کا مقطع تھا:

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دِلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ شاعر جسے شعر و ادب ہی میں نہیں بلکہ حسیات و جذبات تک میں انقلاب پیدا کرنا تھا وہ کب اِن تنگ دائروں میں محدود رہ سکتا تھا۔

مشاعروں سے قدم آگے بڑھا تو قومی محفلوں میں شرکت فرمانے لگے۔

ایک محفل میں آپ نے چند رُباعیات اور قطعیں سُنائی تھیں، ان میں سے ایک رُباعی دیکھئے اور غور کیجئے کہ ان کی وفات سے تقریباً چالیس برس قبل اقبال کی اس شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی جو آیندہ چل کر اُن کی زبان سے "پیغامِ حیات" اور "درسِ عمل" بن کر ادا ہوئی :-

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر　　چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِّ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں　　مل کے دُنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے

غالباً سب سے پہلی نظم جو آپ نے انجمن کے پلیٹ فارم پر سُنائی، وہ نالۂ یتیم تھی، جو ۱۸۹۹ء کے اجلاس میں پڑھی گئی۔ یہ دلگداز و زہرہ پاش نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ انجمن کے جلسوں میں لوگ اقبال کے متلاشی رہا کرتے تھے۔ علامہ بھی احباب کے اصرار و فرمائش کو رد نہ کر سکتے، اور جلسوں میں شرکت کر کے اپنی مؤثر نظموں سے سب کو رُلاتے اور خود بھی قومی درد سے مجبور ہو کر روتے تھے۔ "ہمالہ" اور "ہندوستاں ہمارا" اسی زمانے کی نظمیں ہیں جو انہی جلسوں میں سُنائی گئیں۔ اور مقبولِ عام و خاص ہوئیں۔ انجمن کے جلسوں کی مقبولیت اور اجتماعات کی اہمیت کا اندازہ اِس قصّہ سے ہو سکتا ہے :-

ایک اجلاس میں مولانا حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، مرزا ارشد گورگانی، میاں سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، میاں سر فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی

وغیرہ جیسے اکابر جمع تھے۔ رسم تھی کہ کسی کا کوئی شعر پسند کیا جاتا تو داد اس طرح دیتے کہ انجمن کو نقد عطیہ پیش کیا کرتے تھے۔ ایک شاعر نے نظم پڑھی۔ مولانا حالی مرحوم نے ایک شعر بہت پسند کیا اور انجمن کو دس روپیہ کا نوٹ عطا فرمایا۔ سارا میدان نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھا۔ شاعر کی اس سے زیادہ ہمت افزائی اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود خدائے سخن حالی اس کے کلام کی داد دے۔ کچھ عرصہ بعد مولانا حالی کے پڑھنے کی باری آئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اُن کی آواز پر ضعفِ پیری کا اس قدر غلبہ ہو چکا تھا کہ معمولی صحبتوں میں بھی ان کی آواز سننی مشکل ہوتی تھی۔ چہ جائیکہ اس جلسہ میں جہاں لاتعداد انسانوں کا مجمع تھا۔ لوگ بیقرار تھے کہ خود اس مصلحِ اعظم کی زبانِ فیض ترجمان سے اس کا پیغام سنیں۔ اس لئے عجیب افراتفری سی پیدا ہو چلی۔ آخر شیخ عبدالقادر صاحب نے کھڑے ہو کر مجمع کو خاموش کیا اور فرمایا کہ آپ مولانا حالی کی زبان سے تبرّکاً جو کچھ بھی سُنا جائے سُن لیجئے۔ بعد کو یہی نظم اقبال پڑھ کر سنائیں گے۔

جب اقبال مولانا حالی کی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو اوّل ایک رُباعی فی البدیہہ کہہ کر پڑھی جو اس موقع کے لحاظ سے نیز اپنی بلاغت کے اعتبار سے بہت خوب ہے۔ کہا تھا:-

مشہور زمانہ میں ہے نامِ حالی — معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
مَیں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا — نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

۱۹۰۵ء میں علامہ ولایت چلے گئے تو انجمن کے اجلاس چند سال تک آپ کے نغموں سے محروم رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ولایت سے واپس آئے تو پھر انجمن کی

محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ اپریل ۱۹۰۹ء کے اجلاس میں آپ نے اپنی مشہور و مقبول نظم شکوہ سُنا کر حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

(ملفوظاتِ اقبال میں علامہ شیخ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں: "انجمن کا ایک اجلاس جس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم شکوہ اپنے خاص انداز میں پڑھی بہت لوگوں کو یاد ہوگا۔ جب کیفِ غم کا سماں جلسے پر چھا گیا تھا، ان کے بہت سے مدّاح پھولوں سے جھولیاں بھر کر لائے تھے اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو ان پر پھول برسا رہے تھے۔ اس وقت کی ایک اور بات خاص طور پر قابلِ دید تھی، کہ اقبال کا معمّر باپ اس نظم کے سننے والوں میں موجود تھا۔ باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے مگر لبوں پر تاثیرِ کلام سے وہی علاماتِ غم تھیں جو بیٹے کے چہرے پر تھیں۔ درحقیقت یہ خصوصیت بیٹے نے باپ سے ورثے میں پائی تھی۔")

حکیم محمد حسن صاحب قرشی جو اس بزم میں شریک تھے، لکھتے ہیں کہ جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی سحر انگیز لَے میں ندرتِ تخیل کے اس شاہکار کو پڑھنا شروع کیا تو تمام مجمع مسحور نظر آتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں بادشاہی مسجد لاہور کے جلسۂ عام میں حضرت علامہ نے اپنی مشہور نظم دربارِ رسالتؐ میں "گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا" اپنے مخصوص انداز میں سُنائی تو تمام مجمع جوشِ بیخودی میں سرشار نظر آتا تھا"۔

حکیم صاحب موصوف ہی کا بیان ہے کہ جوابِ شکوہ انجمن کے جلسہ میں نہیں پڑھا گیا۔ جنگِ بلقان کے متعلق موچی دروازہ کے ایک جلسہ میں سنایا گیا۔ اس جلسہ کا انتظام مولانا ظفر علی خاں صاحب نے کیا تھا۔ جلسہ میں آغا حشر مرحوم بھی

شریک تھے۔ انہوں نے ایک دلچسپ تقریر میں بیان کیا کہ وہ بھی ایک نظم سنانا چاہتے تھے۔ مگر حضرتِ اقبال کے سامنے کسی کا رنگ جمنا مشکل ہے۔ اس لئے وہ نظم نہیں کہہ سکے۔ غالباً آغا صاحب کے ذہن میں اس وقت ان کی مشہور نظم شکریۂ یورپ کا تخیل آچکا تھا۔"

"نظم سے پہلے جو منظاہرہ ہوا وہ اس زمانہ میں بھی اقبال کی ہر دلعزیزی کا ایک دلآویز منظر تھا۔ پہلے تو رُونمائی کا سوال پیدا ہوا جس پر جوابِ شکوہ کے ہر صفحہ کو مختلف اصحاب نے خریدا۔ اس کے بعد جب نظم شروع ہوئی تو ہر طرف سے آواز بلند ہوئی "گا کر۔ گا کر" مگر جب ڈاکٹر صاحب نے پکار کر کہا کہ اس نظم کا مفہوم گانے سے ادا نہیں ہو سکے گا، تو سب خاموش ہو گئے۔ نظم کے اختتام پر اس کی سینکڑوں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بِک گئیں۔ یہ تمام روپیہ بلقان فنڈ میں دیا گیا۔"

نیز حکیم صاحب ممدوح لکھتے ہیں کہ "انجمن کے جلسوں میں ڈاکٹر صاحب کی نظمیں اکثر طویل ہوا کرتی تھیں۔ بعض اوقات نظم ایک ہی مجلس میں ہوتی تھی اور بعض اوقات دو جلسوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک ایسی ہی صورت میں یہ شعر پڑھا تھا:

درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

اس وقت ایک جلسہ کے صدر مرزا سلطان احمد اور دوسرے جلسہ کے صدر فقیر افتخار الدین تھے۔"

علامہ اقبال نے اور بھی بہت سی متفرق نظمیں اور اسرارِ خودی کے

حصے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھ کر سنائے تھے۔ تقریباً دس برس کی کنارہ کشی کے بعد جب علامہ نے ایک بار پھر انجمن کے اجلاس میں شرکت کی اور اپنی تازہ نظم خضر راہ سنائی۔ اس وقت کی کیفیت الفاظ نہیں بیان کر سکتے جس درد انگیز طرز سے اقبال نے یہ نظم پڑھی اور جو کیفیت و بے حالی حاضرین پر طاری ہوئی اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ جب اقبال نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے، اور سب کو بے چین کر دیا:-

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا مجمع بھی بے اختیار اشکبار تھا اور بے قابو ہوا جا رہا تھا:-

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

خضر راہ سے اگلے سال آپ نے اپنی بے بدل نظم طلوعِ اسلام انجمن کے سالانہ اجلاس میں سنائی۔ خضر راہ سن کر مجمع جس طرح متاثر ہوا تھا، اسی طرح اس نظم سے متکیف و بے خود نظر آتا تھا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ لاہور کے اربابِ شعر نے بزمِ اُردو قائم کی چونکہ بزم کی کارروائیوں میں علامہ کے اکثر احباب اور معتقدین شرکت کیا کرتے تھے اس لئے آپ بھی کبھی کبھی ان محفلوں کو اپنی شرکت کا شرف بخشتے تھے۔

ایک واقعہ

جناب عبدالمجید صاحب سالک شیرازہ کے اقبال نمبر میں تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ حضرت علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تین چار چھوٹی نظمیں پڑھیں، اور میں نے حسب عادت اُسی وقت نقل کر لیں۔ سید امتیاز علی صاحب تاج کا رسالہ کہکشاں اس زمانہ میں جاری تھا اور حکومت کے تشدد کی وجہ سے روزانہ اخبار کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میں نے اُن میں سے ایک نظم کہکشاں میں درج کر دی۔ اور لکھ دیا کہ ہم آئندہ بھی حضرت کا کلام درج کرتے رہیں گے۔ کہکشاں کا وہ پرچہ شائع ہوا ہی تھا کہ دوسرے دن تاج صاحب کے نام حضرت علامہ کی طرف سے ایک نوٹس پہنچ گیا، جس میں لکھا تھا کہ "میں نے آپ کو اپنا کوئی کلام شائع کرنے کے لئے نہیں دیا۔ پھر آپ کس بنا پر اپنے ناظرین سے میرا کلام شائع کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ آپ جلد سے جلد اس خلاف قانون حرکت کی تلافی کیجئے۔ ورنہ میں مجبوراً چارہ جوئی کروں گا۔"

تاج صاحب نے وہ نوٹس مجھے دکھایا۔ میں شام کو سیدھا حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے مجھ سے کسی قسم کے تکدر کا اظہار نہیں کیا۔ آخر میں نے خود ہی ذکر چھیڑا۔ تو آپ نے شکایت کی کہ کہکشاں نے بلا اجازت میرا کلام شائع کیا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ "اگر آج کوئی روزانہ اخبار لاہور میں ہوتا اور وہ انجمن کے اجلاس کی رُوداد شائع کرتا، تو یہ نظمیں لازماً اس رُوداد میں شائع ہو جاتیں۔ کیونکہ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں سُنائی جا چکی تھیں اور رپورٹروں کو کوئی

ترتیبِ روداد سے روک نہیں سکتا۔ آپ غالباً اس روزانہ اخبار کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرتے، تو پھر اس غریب ماہنامے کے خلاف عتاب کی کیا وجہ۔ اور اگر آپ اجازت پر مُصر ہوں تو مَیں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس آپ کی تین غیر مطبوعہ نظمیں اور موجود ہیں اور مَیں انہیں کہکشاں میں درج کرنا چاہتا ہوں"۔ اس پر تکدر کا بادل یک دم چھٹ گیا اور آپ نے خوشی سے اجازت دے دی۔

شاعری بے پیرا فن ہے؟

جناب عبدالمجید خاں صاحب سالک محولہ بالا مضمون ہی میں تحریر فرماتے ہیں: "۱۹۰۸ء کا ذکر ہے۔ جب میری عمر چودہ سال کے قریب تھی۔ اسی زمانہ میں مجھے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور مَیں نے حضرت کی خدمت میں تلمذ کے لئے عریضہ لکھا۔ اس کے جواب میں آپ نے لکھا کہ:۔

"ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اگر آپ کی طبیعت شعر گوئی کے لئے موزوں ہے تو آپ خود بخود اس پر مجبور ہوں گے۔ رہا زبان کا مسئلہ، تو مَیں اس کے لئے موزوں استاد نہیں ہو سکتا۔ مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک بے پیرا فن ہے۔ لوگ اس مثل کو شاعری کی تحقیر کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں کسی پیرو استاد کی ضرورت نہیں

آپ کے کلام سے ہونہاری ٹپکتی ہے۔ اگر آپ کا یہ شوق قائم رہا تو آپ کسی دن بہت اچھے شاعر ہوں گے"۔

اس عبارت کے نیچے ایک نوٹ لکھا کہ:-

"اگر آپ شاگردی پر مصر ہوں تو داغ صاحب کے شاگردوں میں سے دو کے نام لکھتا ہوں۔ ان سے رجوع کیجئے۔ سید محمد احسن مارہروی، مارہرہ ضلع ایٹہ اور منشی حیات بخش رسا مصاحب دربار رام پور"۔

خط کے آخری صفحہ پر مجھے مشورہ دے رکھا تھا کہ "مفید الشعراء۔ رسالہ تذکیر و تانیث (جلال لکھنوی) اور تحفۃ العروض ضرور دیکھ لیجئے"۔

ہم کو سالک صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ آنجناب نے یہ گرامی نامہ شائع فرما دیا۔ اس لئے کہ اس مکتوب سے متعدد امور پر روشنی پڑتی ہے:-

۱۔ علامہ کے نزدیک شاعر صرف وہی ہو سکتا ہے جس کو فطرت سے شاعرانہ طبیعت عطا ہوئی ہو۔

۲۔ زبان سے مکمل واقفیت شاعر کے لئے لازمی ہے۔

۳۔ زبان پر عبور اور قدرت حاصل کر لینے کے بعد شاعرانہ طبیعت رکھنے والے شخص کو کسی استاد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۴۔ عروض و قافیہ سے واقفیت لازم ہے تاکہ فنی غلطیوں سے بچ سکے۔

۵۔ استاد کی ضرورت صرف اس لئے ہو سکتی ہے کہ وہ شاگرد کو زبان اور فن سے آگاہ کر دے۔

۶۔ علاّمہ کے کلام پر جناب داغ نے اصلاح سے اسی بنا پر انکار کیا ہوگا کہ آپ کو زبان وفن پر دستگاہ حاصل ہو چکی تھی، اور آپ کی فطرتِ سلیم کسی مزید جلا کی محتاج نہ تھی۔

۷۔ داغ کے شاگردوں میں حضرت احسن اور جناب رسا علاّمہ کی نظروں میں اُستادی کے لائق تھے کہ ان کو زبان وفن میں مہارتِ کاملہ حاصل تھی، اوران کا مذاقِ سلیم شاگرد کی صحیح رہنمائی کرسکتا تھا۔

آگے چل کر حضرتِ سالک لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ کر کے حضرت علاّمہ کی خدمت میں بغرضِ اصلاح پیش کیا۔ حضرت نے دو تین جگہ اصلاح فرمادی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کے بعد کا ہے۔ سالک صاحب فرماتے ہیں "اصلاح کے بعد مَیں نے گزارش کی کہ ۱۹۰۸ء میں آپ ہی کے مشورے کے مطابق مَیں نے کتابیں بھی پڑھیں اور رسا صاحب سے اصلاح بھی لی، اور آج براہِ راست بھی ایک نظم آپ سے درست کرالی۔ کیا مَیں اب بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مَیں آپ سے شرفِ تلمذ رکھتا ہوں؟ اس پر بہت ہنسے اور فرمانے لگے۔ آپ کا جس طرح جی چاہے سمجھ لیجیے۔ لیکن مَیں تو سرے سے شعر میں اُستادی شاگردی کے انسٹیٹیوشن ہی کا قائل نہیں۔ یوں جو کچھ مجھے آتا ہے، کسی دوست کو بتانے میں مجھے کوئی تامّل بھی نہیں ہے"۔

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

علّامہ اقبال نہ تو شاعر مشہور ہونا چاہتے تھے اور نہ اسے اپنے لئے باعثِ فخر جانتے تھے۔ عطیہ فیضی بیگم صاحبہ کے نام کے خطوط میں کئی بار آپ نے اس بات پر زور دیا ہے۔ ایک خط مورخہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء میں ان کو لکھتے ہیں کہ "میں نے حال ہی میں اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کی ہے اور میں اپنے اوپر واجب جانتا ہوں کہ اپنے اس وقت کے ناقابلِ بیان تاثرات کو نظم کروں۔ شاید یہ نظم میری آخری نظم ہو اور دیر تک زندہ رہے۔" لیکن پھر بھی آپ شعر گوئی پر مصلحتاً اور ضرورتاً مائل ہوتے تھے۔ اِس لئے کہ آپ کے پیام کے لئے بہترین آلۂ اظہار شعر ہی ہو سکتا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی کے نام کے خط میں لکھتے ہیں:- "میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اِس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اِس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے مَیں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست" (زبورِ عجم)

مولانا ابوالکلام آزاد کے "تذکرہ" کے دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد مینیجر الہلال نے لکھا تھا کہ "اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سُنے گئے ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔ اور اِس لئے مولوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ "اقبال کی مثنویاں تحریکِ الہلال ہی کی آوازِ بازگشت ہیں"۔ علّامہ کو

کسی سے رقابت مقصود و مطلوب نہ تھی۔ لیکن وہ بے جا الزام بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اِس لئے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات مَیں نے اِن مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر، انگریزی و اُردو موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ اُنھوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہُوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا تحریکِ الہلال نے اسے مسلمان کیا .... معلوم نہیں اُنھوں نے کیا سُنا تھا، اور سُنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جُملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔"[۱]

باوجود "فنِ شاعری سے دلچسپی" نہ رکھنے کے آپ شاعری کے اصُول، زبان کی صحت اور عروض کے قواعد میں کمال احتیاط برتتے تھے۔ مکاتیبِ اقبال میں نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی وغیرہ کے نام کے خطوط سے اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ آپ ان بزرگوں کی تنقید کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ عیوبِ شعر پر "متنبہ" کئے جانے کی فرمائش کرتے ہیں، ان کے صحیح مشورے قبول کرتے ہیں اور غلط اعتراضات کے جواب میں کافی سندیں پیش کر کے اپنے استعمال کردہ الفاظ کے تلفّظ، معانی کی صحت اور قافیوں کی دُرستی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس علی خاں صاحب لمعہ حیدرآبادی نے آپ کے اکثر اصلاح

[۱] مکاتیب اقبال

لی ہے۔ ان کو ایک خط میں شاعری کے معمولی اصولوں کی طرف زوردار الفاظ میں توجہ دلائی ہے جو آجکل کے گمراہ شعراء کے لئے تازیانہ عبرت ہو سکتی ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں: "سُنئے غزل اور رباعی کے لئے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے اگر ردیف بھی بڑھادی جائے تو سخن میں اور لطف بھی بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں، قافیہ ہونا چاہیئے۔ اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی نقل ہے، جس کا نام انگریزی میں بلینک ورس ہے، جس کو نثر مجز کہنا چاہیئے۔ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہو گی۔ نظموں کے لئے اوّل سبجکٹ اور مضامین تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ نیچرل مضامین تو سبجکٹ ہی کے اعلےٰ انتخاب سے کچھ لطف دیتے ہیں۔......

قدیم شاعری اور جدید شاعری کا سوال بھی سرمایۂ ادب کا ایک سبجکٹ ہو گیا ہے۔ مَیں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو مانتا ہوں۔ شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی اللہ کی دین ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ طبعِ موزوں اس کے ادا کرنے کے لئے پُراثر الفاظ کی تلاش کرے نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں، وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصوّر ہو سکتا ہے نہ کہ نفسِ شعری۔ اگر ہم نے پابندی عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا، اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعرا کا کام تعمیری ہونا چاہیئے نہ کہ تخریبی۔"[۱]

[۱] مکاتیب اقبال

شعر کیسے کہتے تھے

علامہ کی شعر گوئی واردات و تاثرات کے تحت میں آتی ہے۔ کبھی آپ ایک ہی دن میں سینکڑوں شعر کہہ لیتے تھے، اور کبھی ہفتوں بلکہ مہینوں کچھ کہنے کا اتفاق نہ ہوتا تھا۔ ایسا ہوا کرتا تھا کہ سوتے سے رات میں آنکھ کھل گئی، اور شعر از خود پیدا ہونے لگے۔ لیکن صبح ہوتے ذہن سے اُتر جاتے تھے۔ اس لئے علامہ کا معمول ہو گیا تھا کہ آپ تکیہ کے نیچے پنسل اور کاغذ رکھ کر لیٹتے تھے۔ اگر رات میں اشعار فرماتے تو ہر شعر کے ابتدائی چند لفظ کاغذ پر لکھ لیتے اور صبح کو اُن اشارات کی مدد سے تمام اشعار نقل کر کے ایک جگہ ترتیب دے لیتے۔

(رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی فرماتے ہیں:" ان کے شعر کہنے کی حالت بھی دوسرے شعرا سے الگ تھی۔ فرماتے تھے کہ" سال میں چار یا پانچ ماہ تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے میں بلا ارادہ شعر کہتا رہتا ہوں۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے گھر میں دوسرے کام بھی کرتا رہتا ہوں۔ مگر زیادہ تر طبیعت کا رجحان شعر گوئی کی طرف ہوتا ہے ان دنوں عموماً رات کو شعر گوئی کے لئے بیدار رہنا پڑتا ہے" میرے استفسار کرنے پر فرمایا کہ" میں نے زیادہ سے زیادہ ایک رات میں تین سو اشعار کہے ہیں۔ چار پانچ ماہ کے بعد یہ قوت ختم ہو جاتی ہے، تو غور و فکر کے بعد کچھ شعر کہے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ آورد ہوتی ہے اور وہ آمد۔ دونوں طرح کے کہے ہوئے اشعار میں تمیز کی جا سکتی ہے"! اس حالت کو ڈاکٹر صاحب حمل سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور اس حالت کے اختتام کو

وضعِ حمل سے"۔

حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ "ان کو اس وقت بے حد تکلیف ہوتی تھی، جب کوئی ان سے دوسرے شاعروں کی طرح اشعار سنانے کی فرمائش کرتا تھا۔ میں نے اُن سے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ غالب نے یہ آپ ہی کے لئے کہا ہے:۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما"

جناب مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر "ملفوظاتِ اقبال" میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "گانا جاری ہوتا کہ اقبال کا قلب جذبات سے متاثر ہونے لگتا، اور وہ ایک دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے ـــــ ہم ہمہ تن گوش ہو کر اقبال کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے، جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ـــــ "یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" والی نظم کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی مجلس میں رکھی گئی تھی، اور ملی ترانہ کا پہلا شعر بھی اسی حالت میں موزوں ہوا تھا۔"

آگے چل کر مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔ "اقبال کی نگاہ میں اس قدر بصیرت تھی کہ وہ معمولی سے معمولی واقعات سے بھی فلسفے کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے، مثلاً ایک مرتبہ سر ذوالفقار علی خاں، سر جوگندر سنگھ اور میں اقبال کے ساتھ نواب صاحب کی موٹر میں شالامار کی طرف سیر کو نکلے۔ اس زمانے میں موٹر سازی کی صنعت ابھی تکمیل پذیر نہ ہوئی تھی۔ اس لئے موٹریں چلنے کے دوران میں اچھا خاصہ شور پیدا کرتیں، مگر نواب صاحب کی موٹر چونکہ بیش قیمت تھی، اس لئے اس میں یہ نقص

بڑی حد تک غائب تھا۔ چنانچہ سر جوگندر سنگھ نے از راہِ حیرت کہا کہ نواب صاحب کی موڑ کس قدر خاموش واقع ہوئی ہے۔ بظاہر یہ بات کوئی ایسے پتے کی نہ تھی کہ اقبال اس سے یوں متاثر ہو جاتے کہ وہ اسی فقرے پر اپنی نظم کی بنیاد رکھ دیتے۔ لیکن بانگِ درا میں "موڑ" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا مطالعہ فرمائیے اور اقبال کی فلسفہ طراز طبیعت کا اندازہ لگائیے۔"

مرزا صاحب اور آگے لکھتے ہیں:۔

"گو اقبال کا کلام اکثر پچھلی رات کے سکون اور تنہائی میں مرتّب ہوتا تھا۔ مگر ایسی حالت بھی ہوتی کہ اِن مجالس (محفلِ سرود) میں ان کی طبیعت کبھی کبھی موزوں ہو جاتی، اور وہ شعر کہنا شروع کر دیتے۔ ایسا تو اکثر ہوتا کہ مغنّیہ کوئی نعت چھیڑ دیتی جس کا کوئی شعر ان کے دِل پر اثر کر جاتا اور ان پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ اس کیفیّت کے ظاہر ہوتے ہی محفل کا نقشہ بدل جاتا اور یہیں اس حقیقی اقبال کی جھلک دکھائی دینے لگتی جس کا دماغ حریمِ ربّانی کے جلووں سے مدہوش، جس کا دِل تجلّیاتِ خداوندی سے منوّر، جس کی نگاہ میں پیغمبرانہ پاکیزگی، اور جس کے تخیّل میں ملکوتی بلندی تھی۔ یہی وہ مقدس ساعت ہوتی جس میں شاعرِ مشرق خاکدانِ عالم سے بلند ہوتا ہوا عرشِ معلّیٰ کی طرف بڑھتا اور جذبات کی تند و تیز موجیں اس کے دِل کے مخفی چشمہ سے موسیقیت کے ساتھ شعر کی صُورت میں اُٹھنے لگتیں۔"

"بعض اوقات اقبال پر ایک عجیب خیر سکوت سا چھا جاتا، اور وہ یوں دکھائی دینے لگتے گویا کسی اور ہی دُنیا میں چلے گئے ہیں۔ پھر وہ یکلخت یوں چونک پڑتے گویا نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ اِس حالت کے ظاہر ہوتے ہی ہم سمجھ جاتے کہ ان

کے دل پر کوئی وجدانی کیفیت طاری ہے اور وہ شعر کی فکر میں ہیں۔ یہ کئی مرتبہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جب اقبال کا دل کسی جذبے سے متاثر ہوتا تو وہ گردو پیش کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے۔ علی برادران کی رہائی پر امرتسر میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں مولانا محمد علی رح خود تشریف لانے والے تھے۔ اس جلسہ میں شمولیت کے لئے ہمیں بھی دعوت دی گئی، اور نواب سر ذوالفقار علی خاں، اقبال اور میں نواب صاحب مرحوم کی موٹر میں امرتسر کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم باتیں کرتے جا رہے تھے کہ اچانک اقبال پر متذکرہ کیفیت طاری ہونے لگی۔ انہیں خاموش پاکر نواب صاحب نے ان کی جانب دیکھا تو وہ کسی اور ہی دھن میں نظر آئے۔ اس پر وہ مجھ سے کہنے لگے: "لو بھئی یہاں تو فکر شعر ہو رہی ہے" اور ہم پھر اپنی گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ چند ساعت بعد اقبال چونکے اور ہماری جانب متوجہ ہو کر فرمانے لگے "ہاں صاحب! اب کہئے کیا ارشاد ہے" معلوم ہوا "اسیری" کے عنوان سے بانگِ درا میں جو اشعار ہیں، وہ ابھی ابھی موزوں ہوئے ہیں"[1]

شعر پڑھنے کا طریقہ

جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب بانگِ درا کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں: "اوّل اوّل جو نظمیں جلسۂ عام میں پڑھی جاتی تھیں تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبال سے باصرار کہا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی

[1] ملفوظاتِ اقبال

آواز قدرتاً بلند اور خوش آیند ہے۔ طرزِ ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا۔ اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اب اُن کے لئے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہو گیا ہے، جب کبھی پڑھیں لوگ اصرار کرتے ہیں کہ لَے سے پڑھا جائے اور دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص ہی اُن کے کلام کے قدردان تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے، اس کشش کے سبب عوام بھی کھنچ آئے لاہور میں جلسۂ حمایت اسلام میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں، اور جب تک نظم پڑھی جائے لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں۔"

نیز جناب شیخ صاحب مدظلہٗ ہی ارشاد کرتے ہیں:-

"شعر سے رغبت کے ساتھ اقبال کو موسیقی کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کو علمِ موسیقی سے گہری واقفیت پیدا کرنے کا تو موقع نہیں ملا۔ مگر ان کے کان موسیقی کی اچھی شناخت رکھتے تھے اور کوئی گاتا ہو تو وہ اس سے ایسا لطف اُٹھاتے تھے جیسے کوئی ماہرِ فن اُٹھائے۔ قدرت نے خود انہیں بھی اچھا گلا عطا کیا تھا اس لئے کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا، وہ ہر بحر کے لئے ایسی موزوں لَے چن لیتے تھے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ اس ترنم کے وقت ان پر اکثر غم کی حالت طاری ہوتی تھی، اور سننے والے بھی اس سے اثر پذیر ہونے سے بچ نہیں سکتے تھے۔ . . . . .

. . . ."

"ایک عرصہ تک اقبال اپنی نظمیں ترنم سے پڑھنے کے بعد فرمائشوں کی

کثرت سے تنگ آ گئے، اور اُنھوں نے یہ اصُول بنا لیا کہ کسی بڑے مجمع میں ترنّم سے نہیں پڑھیں گے۔ بہت سے شائقین کو سخت مایوسی ہوئی مگر مرحوم جب کوئی ایسا فیصلہ کر لیتے تھے، اس پر قائم رہتے تھے، اِس لئے ان کی وفات سے برسوں پہلے یہ معمول ہو گیا تھا کہ کسی جلسے میں وہ اپنا کلام پڑھیں تو تحت اللّفظ پڑھتے تھے اور دوستوں میں بیٹھے ہوئے بھی ترنّم پر بمشکل مائل ہوتے تھے۔ آخر میں اُنھوں نے خاص صحبتوں میں بھی ترنّم سے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ اِس عرصہ میں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہُوا کہ مجھے اور دو اور دوستوں کو ان کی نوائے درد انگیز سننے کا موقع مِلا۔ وہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ مجھے رہ رہ کر افسوس آتا ہے کہ جس زمانے میں اقبال لَے سے پڑھتے تھے، اس وقت آواز کے ریکارڈ بنانے کا عام رواج نہ تھا اور کسی کو خیال نہ آیا کہ ان کے پڑھنے کی بے نظیر طرز کو مستقل طور پر مقید کر لیا جاتا۔ کیونکہ ایک خاص اثر ان کی آواز میں تھا جو سننے سے تعلق رکھتا تھا اور لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا!!

اس کے بعد جناب شیخ صاحب قبلہ نے جسٹس سر سید عبدالرؤف مرحوم کی فرمائش اور اپنی سفارش پر اقبال کے ترنّم سے پڑھنے کا واقعہ درج کیا ہے۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات تھی اس صحبت میں ان تین اکابر کے سوا جسٹس سیّد آغا حیدر صاحب بھی تھے۔ اس محفل کے تاثرات کا ذکر شیخ صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"اِن دونوں ججوں کے لئے تو ان کی خوش نوائی ایک نئی چیز تھی۔ مَیں جو پہلے سن چکا تھا، میرے لئے بھی ایک گئی ہوئی نعمت واپس آئی۔ ہم اس طرح جھوم جھوم کر سُننے لگے کہ اقبال کو بھی مدّت کے بعد اس طرح پڑھنے کا مزا آ گیا، اور ان

کی طبیعت کی وہ خصوصیت بھی اپنا رنگ لائی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہم تینوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ پڑھتے پڑھتے ان کے آنسو بہہ نکلے، پھر ہم کیا پتھر تھے کہ ہمارے آنسو تھمے رہتے۔ رات کے کوئی دس بجے تھے جب اقبال نے پڑھنا شروع کیا۔ آدھی رات ہوگئی تو ہم سب کو پتہ چلا کہ اتنی دیر ہوگئی ہے باول ناخواستہ یہ پُرکیف صحبت ختم کرنی پڑی ؎۱

یہاں یہ لطیفہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ عطیہ فیضی صاحبہ کی روایت کے مطابق ہیڈل برگ (جرمنی) میں اقبال موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اس لئے کہ ان کی آواز میں غنائیت ہی نہ تھی ؎۲

شاعری کے مختلف دور

اور

تخییل کا تدریجی ارتقا

اقبال کی شاعری کے چار دور ہیں:

۱۔ ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک

۲۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک

۳۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک

۴۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک

پہلا دَور

۱۔ اس دَور میں اقبال حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ اس کو رازہائے سربستہ کے انکشاف کی جستجو ہے۔ مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدہ سے وہ ان اسرار کو حل کرنا چاہتا ہے۔ پہاڑ، باغ، سورج، چاند، ابر، پھول، شمع سب کا مطالعہ کرتا ہے کہ لعلِ مقصود ہاتھ آ جائے۔ ہر شے سے مخاطب ہوتا ہے کہ کوئی تو اسے راہِ مطلوب بتا دے۔ یہ نیچرل شاعری ورڈزورتھ کی شاعری سے بے حد مشابہ ہے:۔

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں ... کہاں جاتا ہے آیا ہے کہاں سے
یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں فروز ہے ... توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

خفتگانِ خاک سے استفسار:۔

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے ... موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

پرندے کی فریاد اور ایک آرزو پوری نظمیں مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۲۔ آخر اقبال کی طبیعت کا سوز و گداز اور اس کی دراک فطرت مناظرِ قدرت میں درسِ اخلاق اور پیغامِ حیات پاتی ہے، اس لئے اس عہد میں اقبال معلمِ اخلاق بھی نظر آتا ہے:۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ... کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے ... آتے ہیں جو کام دوسروں کے

کنارِ راوی:۔

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی ... ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(چاند سے) :-

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

. . . .

شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

۳ - اس دور میں اقبال کی نظر وطنیت کے محدود دائروں میں گرفتار ہے۔ وہ ابنائے وطن کو افتادگی، نفاق، افتراق، تعصب، بے علمی، تنگ نظری اور کج بینی کے غاروں میں گرا ہوا پاتا ہے۔ ان کو غیرت دلاتا ہے اور نصیحت کرتا ہے، کہ وہ محبت و اتفاق، بلند خیالی اور علو ہمتی اور حقیقت بیں نظر پیدا کریں کہ اپنے مستقبل کو روشن و شاندار بنا سکیں۔

"ترانۂ ہندی" اور "میرا وطن وہی ہے" اس کی اچھی مثالیں ہیں:-

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ، اک نیا شوالا اس دیس میں بسا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آبجو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری

اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

۴۔ کہیں کہیں حکمت و فلسفہ اور تصوف کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ مگر ابھی اقبال تصوف کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے ہیں:۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ

خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ

میں اس مے خانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس

ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے مانندِ جرس

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

۵۔ متعدد نظمیں انگریزی کی تقلید و نقل میں بھی کہی گئی ہیں۔ مثلاً ہمدردی، پیام، صبح، عشق اور موت، رخصت اے بزمِ جہاں، ایک پہاڑ اور گلہری وغیرہ۔

دُوسرا دَور

یہ دَور قیامِ یورپ کا زمانہ ہے۔ جب اقبال ولایت کو روانہ ہوئے تھے اور ہندوستان چھوڑنے سے قبل آستانۂ حضرت محبوب الٰہی رح پر دہلی میں حاضر ہوئے تھے تو آپ نے دُعا مانگی تھی:۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　　شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں　　　تری دُعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے　　　کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان و قلم سے کسی کا دِل نہ دُکھے　　　کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی مِلے فغاں مجھ کو

یورپ کا قیام، فلسفہ کا مطالعہ، وہاں کے علماء و سیاسیین کی صحبت، اہلِ یورپ کا معیارِ زندگی میں مجاہدانہ اقدام اور مغربی ممالک کی سطوت و جبروت کے مظاہر دیکھ کر اقبال کا دردمند دِل ہندوستان اور ایشیا کی زبوں حالی پر بہت کڑھا اور ایک وہ موقعہ آیا کہ آپ نے شعرگوئی ترک کرنی چاہی اور کہا:۔

مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے

جو کام کچھ کر رہی ہیں تو ہیں اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب بانگِ درا کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔

(اقبال کے قیامِ یورپ کے) "تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا، اور اکثر ملاقات کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے، اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اُسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اُن کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے۔ بلکہ اُن کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے، اس لیئے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوتے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ ہے۔"

وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ شعر

سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے۔

خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق

کے لیئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت

اُن کے لیئے بھی مفید ہے اور اُن کے ملک

قیامِ یورپ میں اقبال نے بہت

شاعری کی طرف سے بے رغبتی ہو گئی جس کا اوپر

میں فلسفہ اور وکالت وغیرہ کے مطالعہ میں

ا۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اقبال حسن و عشق کے مطالعہ میں محو نظر آتا ہے۔ جمالیات کا فلسفہ اس کو محبت کی گہرائیوں تک پہنچاتا ہے اور وہ ان حسین و جمیل کیفیات میں گم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کوتاہ بیں اسے مجاز سمجھیں مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ اس حقیقت کا پیش خیمہ تھا جس کی تکمیل دورِ چہارم میں ہوئی ہے۔

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

ہر دل ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی ہمیاں ہے رنگ و بو کا

لو کہ نشتر سے تو جو چھیڑے
کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

ن آغاز ہے عشق انتہا حسن

لوہ حسن سب نظمیں اسی اثر کی آئینہ دار ہیں۔
ل اقبال کو یہ بتایا کہ جنبشِ پیہم اور حرکتِ مسلسل

یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے — زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

۳۔ اسی کے ساتھ یورپ کی مادہ پرستی دیکھ کر اقبال مغرب کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ اور وہ ان عواقب سے بھی دہشت زدہ ہوا جو ایشیا کو یورپ کی مادہ پرستی کی تقلید میں پیش آسکتے تھے:۔

تیرے پیالوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر — خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بے ہوش ہے
پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر — اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا بزمِ کہن بدل گئی — اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

آخر میں اس نے صاف صاف کہہ دیا:۔

دیارِ مغرب میں رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

۴۔ مغرب سے مایوسی، اجمالیات کے مطالعہ اور مسلمانوں کے ماضی کی یاد نے اقبال کے دل میں وہ درد اور سوز و گداز پیدا کر دیا جو آخر تک بڑھتا ہی رہا۔ اقبال کو یقین ہو گیا کہ "تہذیب حجازی" کی طرف عود کرنے سے مشرق کی ہی نہیں بلکہ تمام عالم کی نجات ہو سکتی ہے۔ اسی وقت سے اسلامی شاعری بلکہ پیغمبرانہ شاعری کی بنیاد پڑی

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحرِ بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اِک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہُوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہُوا

غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

اِن دونوں دَوروں کا کلام علامہ مرحوم نے خود انتخاب کر کے بانگِ درا میں شامل کیا ہے۔ فارسی گوئی کی طرف آپ کو توجّہ ہو چکی تھی۔ مگر مختلف اشعار کے سوا کوئی مستقل تصنیف اِس عہد میں نہیں فرمائی۔

تیسرا دَور

یہ یورپ کی واپسی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ سفرِ یورپ میں اقبال مرحوم کو مغرب و مشرق کے ترقی و تنزّل، احساس و بے حسی، بیداری و جمود، حاکمی و محکومی کے موازنہ کا موقعہ مِل چکا تھا۔ فلسفہ کے مطالعہ، عربی و فارسی علوم کی آگاہی، بعض اسلامی

ممالک کی سیر اور انگلستان میں حکمائے غرب شرق کی صحبتوں نے شاعر کی حساس فطرت میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ ۱۰-۱۹۰۹ء میں جنگِ طرابلس الغرب چھڑ گئی مسلمانوں کی بے بسی اور مظلومیت نے اس کے احساسات کو بھڑکا دیا۔ اس کی قوتِ فکر نے اسے مشرق اور اسلام کے ان مصائب کے اسباب و علل سے آگاہ کیا اور اس کی عاقبت بیں نظروں نے ان امراض کا مداوا اور اس پستی و زبوں حالی سے نجات پانے کا راستہ اسے بتایا۔

۱۔ چنانچہ اس دور میں اقبال کے منہ سے بجائے ہندی ترانہ کے اسلامی ترانہ ادا ہوا۔ اور وہ وطنیت کی محدود فضاؤں سے نکل کر عالمگیر قومیت کی پیام رسانی کرنے لگا۔

۲۔ اقبال نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو جگانے اور ان میں بیداری و احساس پیدا کرنے کے لیے ان کو ان کے عہدِ ماضی کے قصے سنائے۔ جواب شکوہ اسی قسم کے خیالات سے لبریز ہے۔ آخر میں قوم کے جذباتِ یاس کو امید سے بدلا ہے اور ان کو راہِ نجات دکھلائی ہے۔ خطاب با جوانانِ اسلام، غرۂ شوال، مسلم، شعاعِ آفتاب، نویدِ صبح سب نظمیں اسی قبیل سے ہیں۔

۳۔ اسی کے ساتھ اقبال نے قوم کو تہذیبِ جدید کے خطرات سے آگاہ کیا۔ مادیت کی تقلید جس تباہی کی طرف لے جاتی ہے اس سے متنبہ کر کے روحانیت کی تعلیم دی۔ مسلمان اور تعلیمِ جدید اور مذہب اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

۴۔ اقبال نے یورپ کے طلسم کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ مغرب کی لبنانی سیاست کی چالوں کو آشکار کیا، اور تمام سیاسی مسائل کے عقدوں کو حل کر کے

راہِ راست دکھائی۔ خضرِ راہ اسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔

۵۔ یہ سب کچھ بتلانے کے بعد اقبال نے قوم کو اُمید کی راہ دکھائی۔ جستجو، احساس، عزم، ہمت، حوصلہ، عمل پیدا کرنے کا سبق دیا۔ اور تصویر کے دونوں رُخوں پر روشنی ڈال کر مستقبل کا خاکہ پیش کیا۔ خضرِ راہ کے آخری بند اور طلوعِ اسلام اس سلسلہ کی مضبوط کڑیاں ہیں۔

اقبال کی اس اسلامی شاعری سے ان کے بعض احباب کو سخت شکایت پیدا ہوئی، اور اس شکایت کا اظہار بھی ہوا۔ چنانچہ پنڈت آنند نرائن صاحب مُلا ایم اے ایل ایل بی وکیل نے ایک لمبی نظم میں یہ مضمون لکھا ہے چند شعر نقل کرتا ہوں

ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا، آج نمازی بن بیٹھا
محمل میں چھپا ہے قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا اقبال وہ اب دُنیا میں نہیں
اے مطربِ نیر سے تانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں
وہ تازگیٔ تخیل نہیں بے ساختگیٔ جذبات نہیں

۶۔ یورپ کے قیام نے اقبال پر ایک اور مستقل اثر بھی قائم کیا تھا مستشرقین اور ایرانی فضلا کی صحبتوں نے آپ کو یقین دلا دیا، کہ وہ جو کچھ حکمت و موعظت کے دریا بہانا چاہتے ہیں، اس کے لئے زبانِ اُردو کفایت نہیں کر سکتی، نیز یہ کہ آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے اصلاحی پیغام کا مستحق صرف ہندوستان ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایشیا کی دوسری قوموں کو بھی اس پیغام کی سخت احتیاج ہے۔ ان تاثرات

کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے ہندوستان واپس آنے کے بعد فارسی کو بالخصوص جولاں گاہِ فکر بنایا ؛

جناب سر عبدالقادر صاحب بانگِ درا کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

"فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی۔ اور مَیں سمجھتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنی کتاب حالاتِ تصوف کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی، اِس کو بھی ضرور اس تغیرِ مذاق میں دخل ہوگا۔ اِس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو اُنہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اُردو کا سرمایہ بہت کم ہے۔ اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اُردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔ اِس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہوگئے۔ مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے، جہاں اُن سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پُوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں نہیں اعتراف کرنا پڑا کہ اُنہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے، اور صبح اُٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں، جو اُنہوں نے مجھے سنائیں۔ اِن غزلوں سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا، جس کا پہلے اُنہوں نے اِس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اُردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔"

اسی دور میں علامہ نے فارسی کی تین مشہور کتابیں اسرارِ خودی، رموزِ بےخودی اور پیامِ مشرق لکھیں۔ ان کتابوں کا تذکرہ آگے آئے گا۔ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اقبال نے خودی کے فلسفہ کو جس قدر تفصیل سے اپنی فارسی تصنیفات میں بیان کیا ہے، اُردو میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ عرفانِ نفس اور احساسِ خودی کو اقبال نے مادی و روحانی ترقیات کا اصل الاصول قرار دیا ہے، اس لئے اسی محور پر ہر شے گردش کرتی نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ اور جو فلسفیانہ و صوفیانہ دقائق و نکات حل کئے ہیں ان کا عرفان ہر کہ و مہ کو نہیں ہوتا، اسی لئے کم پڑھے لکھے لوگ اقبال کی فارسی سے تغافل برتتے ہیں، حالانکہ اقبال کی شاعرانہ پیغمبری کا اعجاز یہ اور اس کے بعد کی تصنیفات ہی ہیں۔ خود فرماتے ہیں:۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتار دری شیریں تر است

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

خوردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند
دل بذوقِ خوردۂ مینا ببند

چوتھا دور

یہ دور تکملہ ہے دورِ سوم کا۔

۱۔ خودی کے مسئلہ پر اقبال نے بہت زور دیا ہے۔

۲۔ مادہ پرست دنیا اور مغربی تہذیب و تمدن کے مصائب و نقائص

آگاہ کیا ہے۔

۳۔ اہم سیاسی و عمرانی مسائل کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۔ مغرب جس گمراہی کی طرف راہنمائی کر رہا ہے، اس کے خطرناک عواقب سے متنبہ کر کے راہِ راست بتائی ہے۔

۵۔ مذہب کو تمام برائیوں کا نجات دہندہ قرار دے کر دینِ فطرت کی طرف تمام عالم کو دعوت دی ہے۔

۶۔ توحید کو صرف دین ہی کا نہیں بلکہ دُنیا کا بھی مرکزِ نجات بتا کر وحدت کا سبق پڑھایا ہے اور اسی نیستانِ معرفت کے نغموں میں کھو جانے کی نصیحت کی ہے۔

۷۔ حکمتِ کلیمی اور حکمتِ فرعونی کا موازنہ کر کے حق و باطل کی جداگانہ راہوں کو ممتاز کر دکھایا ہے۔ مغرب کی دسیسہ کاریوں اور مغربی حکما کی طلسم بندیوں کی ملمع کاری اور دجالی کے فریب کو واضح کر کے اس جال سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

۸۔ نوجوانانِ ملک کو شاہراہِ حیات دکھا کر خودی، اخوت، مساوات، عزم و ہمت، حوصلہ و استقلال، حریت و عمل کا درس دیا ہے کہ یہی بنی نوع انسان کے نجات دہندہ ہیں۔

۹۔ اس دور میں اقبال غلامی کا خواہ وہ کسی نوع کی ہو سخت ترین دشمن اور حریت کا زبردست مبلغ نظر آتا ہے۔

۱۰۔ نیز وہ خواہان و داعی ہے اس عالمگیر اتحاد، اخوت اور برادری کا جس کو انٹرنیشنلزم کا لفظ بھی پورے طور پر ادا نہیں کرتا۔ وہ تمام بنی نوع انسان کو ایک نسل

ایک قوم اور ایک ملّت بنانا چاہتا ہے کہ امتیازاتِ قومی و ملکی کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے اور اختلاف و افتراق کا استیصال ہو جائے۔

اُردو میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم اور فارسی میں زبورِ عجم اور پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" اور "مسافر" انہی مذکورہ بالا خیالات کی آئینہ دار ہیں۔ جاوید نامہ میں بھی یہی سب کچھ ہے۔ مگر جس انداز سے ہے وہ شاعری کی حقیقی معراج ہے جس کے پاس آتے ہوئے بھی ہر شاعر کے پَر جلتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز اسی کا تتمہ ہے۔

مَیں نے مثالوں سے دانستہ گریز کیا ہے، اس لئے کہ پُوری پُوری نظمیں درج کرنی پڑتیں۔ نیز اس سبب سے کہ آئندہ صفحات میں اِن مسائل پر کہ یہی اقبال کی شاعرانہ پیغمبری کے معجزے ہیں تفصیلی نظر ڈالوں گا وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

خصوصیاتِ شعر

علّامہ کے اشعار میں جو محاسن اور خصوصیات پائے جاتے ہیں وہ بے حد و شمار ہیں۔ فلسفہ کے دقائق اور تصوّف کے حقائق آپ کی نظم کے مختصات ہیں۔ خودی کی بابت اقبال نے جو کچھ لکھا اور جس طرح لکھا، اس کی مثال فارسی اور اُردو ادب پیش نہیں کر سکتے۔ صوفیانہ شاعری کے مطوّلات بھی اس تفصیل و توضیح سے عاری نظر آتے ہیں۔ چونکہ خودی پر آئندہ ایک مستقل عنوان کے تحت میں بحث کی جائے گی، اس لئے اِس سے یہاں قطع نظر کرتا ہوں۔

آئندہ جو خصوصیات آئیں گی ان کی چند مثالیں سرسری طور پر انتخاب

کر کے درج کر دی گئی ہیں۔ ورنہ ایک ایک عنوان پر شرح و بسط سے لکھا جائے تو مستقل کتاب بن جائے۔ محاسنِ لفظی و ظاہری کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اس لئے کہ اقبال کی شاعری ظاہری آرائستگی سے نظر فریبی کے لئے نہ تھی بلکہ ان کا مقصود ایک خاص معنویت و حقیقت تھا۔ آیندہ خصوصیات اسی مقصد کے ماتحت قائم کی گئی ہیں کہ ان کا تعلق معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں سے سمجھا گیا ہے :

۱۔ رفعتِ تخیل

فکر کی بلندی اور خیال کی رفعت میں اقبال کو ماضی و حال کے تمام شعراء پر سبقت حاصل ہے۔ ان کے رفعتِ تخیل کا حال انہی کی تفصیل کے مطابق یہ ہے :

بلند بال چنانم کہ بر سپہرِ بریں ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

وہ اوروں کو بھی اسی بلند پروازی کی دعوت دیتے ہیں :-

می گزرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری تو بہ کمیں چہ خفتۂ صید کن ایں غزالہ را

نیز فرماتے ہیں :-

تو در زیرِ درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بندی بہ پرواز آ کہ صید مہر و ماہے می تواں کردن

ذرا بلند خیالی کی چند مثالیں دیکھئے :-

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

شایانِ جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست ایں راہگذر مارا آں راہگذر مارا

نقش پرواز جہاں چوں بہ جنونم نگریست گفت ویرانہ بسودائے تو تنگ است ہنوز

ز جوئے کہکشاں بگذر ز نیلِ آسماں بگذر
ز منزل دل بمیر و گرچہ باشد منزلِ ماہے

چو موج خیز و بہ ہم جاودانہ مے آویز — گرانہ می طلبی، بے خبر! گرانہ کجاست

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ می خواہم ازو — تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

من بسیمائے غلاماں فرِ سلطاں دیدہ ام — شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید بروں

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست — کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

زمیں بہ پشت خود الوند و بے ستوں دارد — غبارِ ماست کہ بر دوشِ او گراں بود است

تاک خویش از گریہ ہائے نیم شب سیراب دار — کز درونِ او شعاعِ آفتاب آید بروں

در گذر از خاک و خود را پیکرِ خاکی مگیر — چاک اگر در سینہ ریزی ماہتاب آید بروں

گر بروئے تو حریمِ خویش را در بستہ اند — سر بسنگِ آستاں زن لعلِ ناب آید بروں

پیشِ من آئی، دمِ سردے دلِ گرمے بیار
جنبش اندر تست اندر نغمۂ داؤد نے

چوں ز مقامِ نمود نغمۂ شیریں زنم — نیم شباں صبح را میل دمیدن دہم

زمانے گم کنم خود را، زمانے گم کنم او را
زمانے ہر دو را یابم چہ راز است ایں چہ راز است ایں

جاں در عدم آسودہ از ذوقِ تمنا بود — مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامِ من

پیدا بضمیرم او، پنہاں بضمیرم او — ایں است مقامِ او، دریاب مقامِ من

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے — تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں — دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

نہ تُو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تُو نہیں جہاں کے لئے

کب تلک طُور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم — اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا — مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم — اِک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک — یا مَیں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج — موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

۲۔ حُسنِ ادا

سا کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اقبال ایسا عمدہ طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں اور الفاظ کا انتخاب اس قدر موزوں اور مناسب ہوتا ہے کہ شعر میں ایک خاص قسم کی رنگینی و شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے اور جو اثر آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں الفاظ

ان کے پورے طور پر حامل نظر آتے ہیں۔ یہ شئے اقبال ہی کا طرۂ امتیاز ہے، اور آپ کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ چند بغرض ملاحظہ پیش کرتا ہوں:-

عُرفی کا مشہور شعر ہے:-

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم — چنانکہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

اقبال کہتے ہیں:-

بحرفے می تواں گفتن تمنّائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

عُرفی نے "درازی حکایت" کا سبب صرف "لذتِ روایت" بیان کیا تھا۔ اقبال نے اس پر اضافہ کیا۔ "ذوقِ حضوری" ہی اصل مقصودِ الفت ہے۔ اس توضیح نے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:-

اے برادر ما بگرداب اندریم — واں کہ شنعت می زند بر ساحل است

خواجہ حافظؒ نے ترقی دی اور کہا:-

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل — کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل را

غالب نے اور زیادہ صاف کر کے کہا:-

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز — گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

اقبال رح کے شعر کو ان اشعار کے مقابلہ میں دیکھیئے۔ "بے یقینی راہی" اور "دلیلِ کارواں" کے شمول نے مضمون کس قدر بلند اور کتنا محکم کر دیا ہے:-

شبِ تاریک و راہ پیچ پیچ و بے یقینی راہی — دلیلِ کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است

اسی غزل کے اور اشعار کا حسنِ بیان ملاحظہ ہو:-

رقیبِ خام سودا است و عاشق مست و قاصد مست
کہ حرفِ دلبراں دارائے چندیں محمل افتاد است
گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفاں
کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

سرگرمیٔ عمل اور جد و جہد کے لئے کیا خوب اندازِ بیان اختیار کیا ہے:-

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیشے بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

شاعر کی "نے نوازی" ایک مغنّی کی نغمہ آفرینی سے بے حد مختلف ہے۔ حسنِ ادا دیکھئے:-

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ نادانی
دمِ شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

اور مثالیں دیکھئے:-

نغمہ پردازی ز جوئے کوہسار آموختم
در گلستاں بودہ ام یک نالہ درد آلود نے

تا سازش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما

نہ بہ ماست زندگانی نہ ز ماست زندگانی
ہمہ جاست زندگانی ز کجاست زندگانی!

دریں میخانہ ہر مینا ز بیمِ محتسب لرزد
مگر یک شیشۂ عاشق کہ از وے لرزہ بر سنگ است

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ کناں
دلبراں زہرہ وشاں گلبدناں سیمبراں

مذہب زندہ دلاں خواب پریشانے نیست
ازہمیں خاک جہان دگرے ساختن است

رات کے سکون، ہوا کی خاموشی اور دریا کے سکوت کو بیان کرنے کے لئے کیسے نرم و نازک الفاظ اختیار کئے ہیں کہ ایک مصرعہ میں وہ مفہوم ادا ہو گیا جس کے لئے چند شعر بھی شاید کفایت نہ کرتے:۔

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

موت کو ان الفاظ سے تعبیر کرنے میں کس قدر حسرت ہے:۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

اصحابِ بصیرت کی کمیابی و نایابی کو کس لطیف انداز میں بیان کیا ہے:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کس حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں کس خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے:۔

تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر

داستانِ محبت، طرح طرح بیان کی جاتی ہے۔ اِس اندازِ بیان کی خوبی اور جامعیت ملاحظہ ہو:۔

اِک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اوّل سوز و تب و تاب آخر

آشیانہ کے فنا ہو جانے پر شانِ استغنا دیکھئے:-

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

عروجِ انسانی پر ستاروں کا اندیشہ ناک ہونا کس خوبی سے بیان کیا ہے:-

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

وہ چنگاری خس و خاشاک میں کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

۳- جوشِ بیان

(اقبال کا کلام آمد ہے اور جذبات و تأثرات و کیفیات کا آئینہ دار، اس لئے جوش سے لبریز ہے۔ پوری پوری نظمیں اور غزلیں جوش سے بھری ہوئی ہیں:-)

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گُل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

مرے گلو میں ہے اِک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است زمامِ من

ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من
ایں کوکبِ شامِ من ایں ماہِ تمامِ من

اے عالمِ رنگ و بو ایں صحبتِ ما تا چند
مرگ است دوامِ تو عشق است دوامِ من

جاں در عدم آسودہ بے ذوقِ تمنا بود
مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامِ من

مثلِ شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم
تن بہ تپیدن دہم بال بہ پریدن دہم

سوزِ نوایم نگر، ریزۂ الماس را — قطرۂ شبنم کنم، خوئے چکیدن دہم
چوں ز مقامم نمود نغمۂ شیرین نیم — نیم شباں صبح را میل دمیدن دہم

باز بر رفتہ و آیندہ نظر باید کرد — ہلہ برخیز کہ اندیشہ دگر باید کرد
گفتمش در دلِ من لات و منات است بسے — گفت ایں بتکدہ را زیر و زبر باید کرد

شعلہ می باش و خاشاکے کہ پیش آید بسوز
خاکیاں را در حریمِ زندگانی راہ نیست
جرہ شاہینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پر کشا پروازِ تو کوتاہ نیست

۴۔ سوز و گداز

(اقبال کے دل میں درد و سوز و گداز ہے۔ اس لئے آپ کے اشعار میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہے، اور جو قومی و ملی نظمیں ہیں، وہ تو تمام و کمال سوز و درد ہیں۔ اُردو میں میرؔ کے سوا اِس قدر درد، سوز اور اثر کسی اور شاعر میں نہیں۔)

چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:-

چناں پیش حریم او کشیدم نغمۂ دردے
کہ دادم محرماں را لذتِ سوزِ جدائی ہا
دریں صحرا گذار افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نغمہ ہائے ساربانے را

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

تھی کبھی درماندہ رہرو کی صدا لئے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ جاوداں میری

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وُہ گُل ہوں مَیں خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری

تصویرِ درد، صقلیہ، بلادِ اسلامیہ، گورستانِ شاہی، شمع و شاعر، حضورِ رسالت مآب میں، فاطمہ بنت عبداللہ اور والدہ کی یاد میں وغیرہ تمام نظمیں سراپا سوز و گداز اور درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

۵۔ جدید تراکیب

(عربی و فارسی پر قدرتِ کاملہ رکھنے کے باعث اقبالؔ ایسی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں کہ جو مفہوم ان چند الفاظ سے ادا ہو جاتا ہے، وہ کئی جملوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایسے مرکّب الفاظ کو آپ جس سلیقہ اور لُطف کے ساتھ باندھ جاتے ہیں اُو دُوسروں کو نصیب نہیں۔ یہ خصوصیت غالبؔ اور مومنؔ کے زمانہ سے اُردو میں عام

ہوئی۔ اور اقبال نے اس کو اس قدر مقبول بنا دیا کہ پھر سب نے آپ کی تقلید میں نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرنی شروع کر دیں۔ لیکن عربی و فارسی سے کم علمی کی بنا پر اکثر شعراء عموماً گوناگوں غلطیوں کے شکار ہو جاتے ہیں:۔

تغیر آ گیا ایسا تدبر میں تخیل میں — ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں — انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں — آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر — آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں آلام ہیں — کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے — زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں — اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے سازِ زندگی — غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

زندگی الفت کی دردِ انجامی سے ہے مری — عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں

اے درائے کاروانِ خفتہ پا خاموش ہو — ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش ہو

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں — اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آ گیا — تھے جو گراں قیمت کبھی اب ہیں متاعِ کس مخر

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

شمع یہ سودائی دلسوزیِ پروانہ ہے

بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن — عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

گرچہ ہے دلکشا بہت حُسنِ فرنگ کی بہار — طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر

قافلے دیکھ اور اُن کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ

کافروں کی مُسلم آئینی کا نظارہ بھی کر
اور اپنے مُسلموں کی مُسلم آزاری بھی دیکھ

بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
اُمّتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ

اس زیاں خانے میں کوئی ملّتِ گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو — اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو — یہ میری خود نگہداری کہیں ساحل نہ بن جائے

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا — عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

۶۔ فلسفیانہ انداز

فلسفہ جیسی خشک شے کو اقبال اپنے بیان سے رنگین بنا دیتے ہیں۔ معمولی اشیا میں بھی ان کو فلسفیانہ حقائق نظر آتے ہیں۔ اور ادنیٰ ادنیٰ واقعات سے وہ دلکش نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ اس مست نازشؔ کے کلی کو توڑنے سے کیا درسِ حقیقت حاصل کیا ہے:۔

وہ مستِ ناز جو گلشن میں آ نکلتی ہے — کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
"الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے — کلی سے رشکِ گلِ آفتاب مجھ کو کرے"
تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے — تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

موٹر کو "مانندِ برقِ تیز، امثالِ ہوا خموش" دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا اقبال ہی کا کام تھا:-

میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر — ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

پھر ثبوت پیش کرتے ہیں۔ فلسفیانہ نکات دیکھئے:-

ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس — نکہت کا کارواں ہے مثالِ ہوا خموش
مینا مدام شورشِ قلقل سے پا بگل — لیکن مزاجِ جامِ خرام آشنا خموش
شاعر کے فکر کو پرِ پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمیِ آواز خامشی

انسان پر ایک قطعہ لکھا ہے، سر تا سر فلسفیانہ نکات سے لبریز ہے:-

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا — محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو — فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی — یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

اتحادِ ملّی کی تبلیغ کس لطیف انداز سے فرماتے ہیں:۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

شبِ معراج میں اقبال کو یہ درس نظر آتا ہے:۔

رہ یک گام ہے ہمّت کے لئے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عقاب کی زبانی "سخت کوشی" کی تعلیم کیسی بصیرت افروز ہے:۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

(زندگانی کا فلسفہ اقبال نے اُردو اور فارسی میں طرح طرح سے لکھا ہے اور اس فلسفہ سے مفید و عجیب حقائق و دقائق ملّت کے سامنے پیش کئے ہیں)

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
گفتا کہ تلخ تر از کوثر است

گفتم کہ کرمک است و زگِل سر بروں زند　　گفتا کہ شعلہ زاد و مثالِ سمندر است
گفتم کہ شر بفطرتِ خامش نہادہ اند　　گفتا کہ خیر او نشناسی ہمیں شر است
گفتم کہ شوقِ سیر بنبر وش بمنزلے　　گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گلِ تر است

شبے زار نالید ابرِ بہار　　کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر گفت　　خطا کردۂ خندۂ یک دم است
ندانم بگلشن کہ برد ایں خبر　　سخن ہا میانِ گل و شبنم است

زندگی از طوفِ دیگر رستن است　　خویش را بیت الحرم دانستن است
بدریا غلط و با موجش درآویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

جگنو کو دیکھ کر درس دیا ہے:۔

شنیدم کرمکِ شب تاب می گفت　　نہ آں مورم کہ کس نالد ز نیشم

تواں بے منتِ بیگانگاں سوخت نہ پنداری کہ من پروانہ کیشم
اگر شب تیرہ تر از چشمِ آہوست خود افروزم چراغِ راہ کیشم

زندگی پابندِ رسوم و علائق زمانہ رہے تو اس سے موت بہتر ہے۔ ستاروں کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا اقبال ہی کے لئے مخصوص ہے:۔

اگر انجم ہمانستے کہ بود است ازیں دیرینہ تابی ہا چہ سود است
گرفتارِ کمندِ روزگاریم خوشا آں کس کہ محروم از وجود است

چند متفرق اشعار دیکھئے اور فلسفیانہ حقائق پر غور کیجئے:۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نروی نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است
گرچہ مید انم خیالِ منزل ایں جا دمِ من است در سفر از پا نشستن ہمتِ مردانہ نیست

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب میدہد جانِ امیدوار را

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر
محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

من کی دُنیا؛ من کی دُنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دُنیا؛ تن کی دُنیا، سُود و سودا مکر و فن

۷۔ شوخی

باہمہ متانت وثقاہت، اقبال کے کلام میں شاعرانہ شوخ گفتاری بھی اکثر نظر آتی ہے۔ اور اس شوخی سے مضمون میں عجیب لطف پیدا ہو جاتا ہے:

دگر ز سادہ دلی ہائے یارِ نتواں گفت
نشستہ بر سرِ بالینِ من ز درماں گفت

شیخ شہر کو مردِ باخدا بنانے کی کیا جدید ترکیب ہے:۔

ازاں پیشِ بتاں رقصیدم و زنّار بربستم
کہ شیخِ شہر مردِ باخدا گردد ز تکفیرم

شیخ و برہمن پر اور طنز دیکھئے:۔

بہ بندگاں خط آزادگی رقم کردند
چنانکہ شیخ و برہمن شبانِ بے رمہ اند

شراب کی حلت کے لئے کیا خوب توجیہ ہے:۔

پیالہ گیر کہ مے را حلال می گویند
حدیث اگرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

عفوِ الٰہی کو برانگیخت کرنے کے لئے کیا شوخ ادا ہے:۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

مُلّا و شیخ کی الٰہی دیکھئے:۔

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

جنوں کی فرزانگی ملاحظہ ہو:۔

مرے جنوں نے زمانہ کو خوب پہچانا
وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں

ہجومِ میکدہ سے کیا اخلاقی نکتہ پیدا کیا ہے۔ شوخی قابلِ داد ہے:۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

فریب کلیسا کے لئے کہتے ہیں:-

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

مُلّا و شیخ پر شوخ طعن دیکھئے:-

پیر ما مصلحتاً رو بمجاز آورد است
ورنہ با زہرہ وشاں ہیچ سروکارش نیست

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

مُرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر کہ مُلّا ہیں صاحب تصدیق

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز گفتار واہی

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں جھک گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

اس طرح کے متفرق اشعار کے علاوہ بعض نظمیں اور قطعے شوخ رنگ میں کہے ہیں اور حقائق و معارف ظریفانہ اسلوب کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے رنگ میں جو کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے وہ بھی اسی موضوع میں شامل ہے۔

۸۔ موسیقیّت و ترنم

(اقبال نے اپنی نظموں اور غزلوں کے لئے عموماً ان بحروں کا انتخاب کیا ہے جن سے کلام میں روانی اور ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی موزونیت اور سجع اس موسیقی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ عصر حاضر کی ایرانی شاعری کا ایک خاص

انداز یہ ہے کہ چند مصرعوں کے بعد مستزاد کے ایک یا زاید ٹکڑے اضافہ کر دیتے ہیں، جس سے عجیب رعنائی و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ نے اِس خصوصیت کو ہندوستان میں رواج دیا۔ اس کے بعد اور شعراء نے عام طور پر اس کو اختیار کیا۔ مگر اقبالؔ جس خوبی سے اِس خصوصیت کو برت جاتے ہیں، دوسروں کو وہ بات نصیب نہیں۔

طلوعِ اسلام بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔ یہ بحر اس قدر مقبول ہوئی کہ حفیظؔ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام کے لئے اسی کو پسند کیا۔ اب تو ہر شاعر اسی میں نظم لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ طوالت کے خوف سے ہر نظم کا صرف پہلا بند نقل کرتا ہوں:۔

گفتند فرودآئے ز اوجِ مہ و پرویز
بر خود زن و با بحرِ پُر آشوب بیامیز
با موج در آویز
نقشِ دگر انگیز
تابندہ گہر خیز الخ

نافۂ سیارِ من
آہوئے تاتارِ من
درہم و دینارِ من
اندک و بسیارِ من

دولتِ بیدارِ من ۱

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست الخ

ہستیِ ما نظامِ ما
مستیِ ما خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما
زندگیِ دوامِ ما

دَور فلک بکامِ ما مے نگریم و مے رویم الخ

خواجہ از خونِ رگِ مزدُور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب! الخ

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز کاشانۂ مارفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز! الخ

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنّم ہزار
طوطی و درّاج و سار
کشتِ گل و لالہ زار

چشمِ تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار — الخ

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تُو بھی اے فرزندِ کہستاں! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان — الخ

۹۔ سلاست و روانی

موسیقیت: کے ذیل میں جن نظموں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، ان سب میں کس قدر روانی و سلاست ہے، وہاں غزلیں بخوفِ طوالت نقل نہیں کی گئی تھیں۔ یہاں مثالاً چند نقل کرتا ہوں۔ ان کی سلاست و روانی اور موسیقیت و ترنّم دیکھئے۔ ایسی غزلیں لاتعداد ہیں:۔

فصلِ بہار این چنیں بانگِ ہزار این چنیں — چہرہ کشا غزل سرا بادہ بیار این چنیں
اشک چکیدہ ام ببیں ہم بنگاہِ خود نگر — ریز بہ نیستانِ من برق و شرار این چنیں
بادِ بہار را بگو پے بخیالِ من برد — وادی و دشت را دہد نقش و نگار این چنیں
زادۂ باغ و راغ را از نفسم طراوتے — در چمن تو زیستم با گل و خار این چنیں
فاختۂ کہن صفیر نالۂ من شنید و گفت
کس نہ سرود در چمن نغمۂ پار این چنیں

از چشمِ ساقی مستِ خرابم — بے مے خرابم بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی — بینم نہ بینم از پیچ و تابم
چوں رشتۂ شمع آتش بگیرد — از زخمۂ من تارِ ربابم
از من بروں نیست منزلگہِ من — من بے نصیبم راہے نیابم
تا آفتابے خیزد ز خاور
مانندِ انجم بستند خوابم

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تُو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی — محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
وُہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے — سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے — تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سُلطاں — محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے — یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

بہ خوں آلودہ دست و تیغ غازی ہا نہ بہ تحسیں

تو اوّل زیبِ اسپ و زینتِ برگستواں بینی!

یہی وجہ ہے کہ جب مجھے سیرتِ اقبال کا مسودہ دیکھنے کا موقع دیا گیا، تو جس بات سے مجھے خاص مسرّت ہوئی وہ یہ تھی کہ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی نے اقبال کے کلام کی نبض پہچانی ہے اور ٹھیک اُس جگہ ہاتھ رکھا ہے جہاں ایک صاحبِ ذوق اور سخن فہم شارح کو رکھنا چاہیئے تھا۔ پروفیسر صاحب نے "اقبال بحیثیت انسان" اور "اقبال بحیثیت شاعر" دونوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جو اقبال کے ایک جامع سیرت نگار کے لئے یقیناً ضروری تھا۔ لیکن کتاب کا بیشتر حصہ اقبال کی تعلیم کی سُلجھی ہوئی اور شُستہ تشریحات پر مشتمل ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فاضل مصنف نے اقبال کو بالکل اسی طرح سمجھا ہے جس طرح سمجھنے کا حق تھا، خود اقبال کو بھی اسی طرح سمجھے جانے کی تمنّا تھی ؎

"جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟"

اقبال کو سمجھنا اگر مشکل ہے تو سمجھانا اُس سے زیادہ مشکل۔ مگر حق یہ ہے کہ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی نے اس منزل پر اپنی قدرتِ بیان اور قوتِ اظہارِ مطالب کے جو شواہد پیش کئے ہیں اُن کو دیکھ کر پروفیسر صاحب کے فہمِ سلیم اور کمالِ انشا دونوں کا یکساں معترف ہونا پڑتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کوئی بات مدعیانہ انداز میں بلا حجت و دلیل پیش نہیں کی۔ پوری کتاب کا انداز علمی اور استقرائی ہے۔ ہر بیان کے لئے خود اقبال کے کلام سے استشہاد کیا ہے۔ اقبال کے اشعار سے جو حوالہ جات دیئے ہیں اُن کی کثرت اور نوعیت

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو — طشتِ اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے — کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"

رات کا سکون، دریا کا سکوت اور اس وقت کے خاموش منظر کو کس خوبی کے ساتھ چند اشعار میں نظم کر دیا ہے :-

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر — گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار — موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

کشمیر کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہاں جہاں بہ ہیں، لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج — صلصل و سار زوج زوج، بر سرِ نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید، موج بہ آبجو تپید — خاک شرر شرر ببیں، آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تارِ ساز زن، بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را، انجمن انجمن نگر

فصلِ بہار کا منظر کس حسن و خوبی کے ساتھ کھینچا ہے :-

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

واردائے نظر شُد

پروانہ بیتاب کہ ہر سُو تگ و پو کرد	بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترکِ من و تو کرد

یا اختر کے ماہ مبینے بکمینے	نزدیک تر آمد بتماشائے زمینے
از چرخ برینے

یا ماہِ تنک ضو کہ بیک جلوہ تمام است	ماہے کہ بر و منتِ خورشید حرام است
آزاد مقام است

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں	یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ	یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا	غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا	ذرّہ ہے یا نمایاں سُورج کے پیرہن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

مناظرِ قدرت کے لئے کیا خوب تشبیہیں پیدا کی ہیں:۔

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گُل کی ٹہنی	جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سُورج جب شام کی دُلہن کو	سُرخی لئے سُنہری ہر پھول کی قبا ہو
پھولوں کو آئے شبنم جس دم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دُعا ہو

موت کے لئے کیسی دلکش تعبیریں کی ہیں :-

تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں　　موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت

گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

دریا کی روانی دیکھ کر کیا خوب تشبیہیں پیدا کی ہیں :-

یکہ جوئے آب چہ مستانہ می رود　　مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار

خوابِ ناز بود بگہوارۂ سحاب　　واکرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار

سنگریزہ نغمہ کشاید خرامِ او　　سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

درسِ حیات کو تشبیہ و استعارہ سے کس قدر پختہ و پرزور بنا دیا ہے :-

خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی　　چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

شاعر اپنی بابت کتنی ہی "لن ترانیاں" الاپیں۔ مگر اس سے بہتر اور صحیح تر تشبیہ

ا ہو سکتی :-

کرمِ شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود

در پر و بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

شبنم کے لئے کس قدر جدید و لطیف تشبیہ ہے :-

قطرۂ شبنم سرِ شاخِ گلے　　تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے

ہمالیہ سے اس طرح خطاب کرنا استعارہ کی لطافت و نزاکت کی انتہا ہے

اے زصبحِ آفرینش تیغ بدوش　　پیکرت از رودہا زنّار پوش

رات میں ہری ہری گھاس پر چنبیلی کے تختوں کے انعکاس کے لئے کیا عجیب تشبیہ پیدا کی ہے :-

از ظلامِ شب سمن زارش نگر   بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر

خضرِ راہ کے پہلے بند میں موج کے سکون کے لئے کیسی اچھوتی تشبیہ ہے

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

دریا میں چاند کے عکس کو دیکھ کر کیا نادر استعارہ پیدا کیا ہے :-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

چشمہ کے ترنم کے لئے کیا معصوم تشبیہ ہے :-

شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال
دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال

اور چند نادر و لطیف تشبیہیں اور استعارے ملاحظہ ہوں :-

حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں   جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے   جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر   شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے   گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے　　　سُکر کی لذت میں تُو لٹوا گیا نقدِ حیات

نمی بینی کہ از مہرِ فلک تاب　　　بسیمائے سحر داغِ سجود است

۱۲۔ تمثیل

تمثیلی انداز میں کلام کو مرصع و مدلل بنا کر بیان کرنے میں علّامہ کو خاص مہارت ہے۔ آپ کی تمثیلیں دلکش اور عامۃ الورود ہوتی ہیں۔ پھر آپ کا حسنِ بیان اس مثال کو کچھ اُور ہی آب و رنگ بخش دیتا ہے۔

عروج و زوال کے لئے کیا خوب تمثیل بیان کی ہے:۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

خودی کے عرفان کو "ضربِ کلیم" سے مثال دے کر کیا خوب سبق دیا ہے:۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

جوشِ عمل اور حرکت کے لئے کیسی صحیح تمثیل ہے:۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد　　　ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر

ملّاؤں کی تنگ نظری قوم کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اِس کے لئے کیسی نادر تمثیل پیدا کی ہے:۔

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں

کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

عزم و ہمت اور حریت و عدم پابندی کی مثال دیکھئے :-

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی

عشق کے لئے "دلِ زندہ" کی ضرورت ہے۔ ہر ایک کا یہ دل گردہ نہیں۔
اِس مضمون کو کیسی لطیف تمثیل سے ثابت کیا ہے :-

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

ساقی کی "مے ناب" کیا اثر رکھتی ہے؟ کیسی اچھوتی مثال بیان کرتے ہیں :-

بر دلِ بیتابِ من ساقی مئے نابے زند
کیمیا ساز است و اکسیرے بہ سیمابے زند

غم کو ضبط نہ کر سکنے کے لئے اِس سے زیادہ سادہ اور صحیح تمثیل کیا ہو گی :-

از غمِ پنہاں نہ گفتن مشکل است
بادہ در مینا نہفتن مشکل است

"خودداری، خود نگہداری اور خوگری" کی کیسے پاکیزہ طور پر تعلیم دی ہے :-

تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

غلام کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

کور ذوق و نیش را دانستہ نوش
مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش

عقل اور عشق کے امتیاز کو اقبال نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔
ایک مثال ملاحظہ ہو۔ کیسی سادہ تمثیل سے مضمون کو ثابت کرتے ہیں :-

عقل ورق ورق بگشت عشق بہ نکتۂ رسید

طائرِ زیرکے برد دانۂ زیرِ دام را

محبت کی تکمیل کے بعد رقیبانہ خیالات باقی نہیں رہتے - اس امر کے لئے کیا خوب تمثیل پیدا کی ہے :-

محبت چوں تمام اُفتد، رقابت از میاں خیزد
بہ طوفِ شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد

رازِ حیات کیا ہے؟ ایک مسلسل تپش حسنِ تمثیل سے اس بات کو واضح کرتے ہیں :-

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را

خودی میں ڈوبنے سے راہِ مقصود ہاتھ آجاتی ہے کیسی سادہ مثال ہے :-

راہ کو راست بخود غوطہ زن اے سالکِ راہ
جادہ را گم نکند در تہِ دریا ماہی

سلطنت کی نزاکت کو کس قدر عامتہ الورود تمثیل میں بیان کیا ہے :-

اے سکندر! سلطنت نازک تراز جامِ جم است
یک جہاں آئینہ از سنگے شکستن می تواں

اور چند شعر ملاحظہ ہوں :-

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچہ کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ اُفتاد

۱۳۔ غزلِ مُسلسل

غزلِ مسلسل کا وجود فارسی اور اُردو میں مُدت مدید سے ہے۔ یہ کوئی اقبال کی جدت نہیں۔ لیکن علامہ کی غزلیں چونکہ اس خصوصیت سے عموماً مزین ہیں اور فارسی یا اُردو کے کسی شاعر نے اس کثرت و التزام سے مسلسل غزلیں نہیں لکھیں اس لئے یہ امر بھی آپ کی امتیازی خصوصیت اسی طرح بن گیا ہے جس طرح یہ وصف کہ آپ مقطع کی پابندی غزل میں بھی پسند نہیں فرماتے۔ چنانچہ آپ کی غزلیں عموماً بغیر مقطع کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک غزل فارسی اور ایک اُردو کی ملاحظہ ہو۔

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز

او بیک دانۂ گندم بزمینم انداخت
تو بیک جرعۂ آب آنسوئے افلاک انداز

عشق را بادۂ مرد افگن و پُرزور بدہ
لائے ایں بادہ بہ پیمانۂ ادراک انداز

حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا
خضرِ من! از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

خرد از گرمیِ صہبا بگدازے نرسید
چارۂ کارِ بآں غمزۂ چالاک انداز

بزم در کشمکشِ بیم و امید است ہنوز
ہمہ را بے خبر از گردشِ افلاک انداز

می تواں ریخت در آغوشِ خزاں لالہ و گل
خیز و بر شاخِ کہن خونِ رگِ تاک انداز

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تُو ہے محیطِ بیکراں مَیں ہوں ذرا سی آبجُو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بیکنار کر

مَیں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
مَیں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

رجائیت

انسانی زندگی اکثر مفکّرین کے لئے ایک معمّا ہے۔ سب نے اس کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف نتائج پر پہنچے ہیں۔ بعض کا نظریہ ہے کہ ہماری زندگی کے تغیّرات و حوادث اِس قسم کے اسباب و علل کا نتیجہ ہیں جن پر ہم کو کوئی قدرت نہیں۔ ہم اُمیدوں کے محلّات تعمیر کرتے ہیں مگر وہ مسمار ہو جاتے ہیں، اور ہماری مساعی کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اِس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دُنیا دار المحن ہے اور بس۔ اِن آلام و مصائب کا دفعیہ ہمارے بس کا نہیں۔ جو کچھ پردۂ غیب سے ظاہر ہوتا ہے اس پر ہم کو مجبوراً راضی ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ہم جد و جہد، کد و کاوش، اُمید و آرزو کی اُلجھنوں میں ہرگز نہ پڑیں۔ کامیابی و کامرانی کو کوئی کسی شئے خیال نہ کریں اور اعمال و اسباب پر بھروسہ نہ کریں۔ اسی کا نام قنوطیت ہے۔ لیکن دُوسرے مفکّرین کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ

بعض حالات میں ہماری توقعات کے خلاف نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں۔ دُنیا عالمِ اسباب ہے۔ زندگی ایک پیہم جہد و جہد ہے۔ کائناتِ عالم کا ذرّہ ذرّہ تگ و دو میں مصروف اور عمل میں سرگرم ہے۔ انسان کو مکارمِ اخلاق کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ ہمت، حوصلہ، شجاعت، جوش، خودداری، خوداعتمادی، اُمید، عمل انسانیت کے خواص ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسباب کو اپنے مقاصد کے مطابق ترتیب نہ دے کر دُنیا کے معاملات کو اپنے منشا کے موافق صُورت پذیر ہونے پر مجبور نہ کر سکیں۔ ناکامی میں کامرانی اور نااُمیدی میں اُمید کی شعاعیں جھلکتی ہیں۔ پھر ہم کیوں گھبرائیں اور کیوں دل شکستہ ہوں۔ اس کا نام رجائیت ہے۔

فارسی شاعری رجا و قنوط دونوں اجزا اپنے اندر رکھتی ہے۔ مگر اُردو شاعری میں قنوطیت اس قدر غالب ہے کہ رجائیت کا چہرہ اس موٹے نقاب میں نگاہوں سے بالکل پوشیدہ ہو گیا ہے۔ اُردو شاعری جس وقت سے پلی بڑھی، اس نے سلطنتوں کے انقلاب اور بادشاہوں کی تباہیوں کے مناظر دیکھے۔ سوسائٹی کا شیرازہ بکھرتا ہوا پایا اور افراد کو گوناگوں افکار و مصائب میں مبتلا دیکھا۔ شعرا خود حوادث و آلام کے آماجگاہ بنے رہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا اور زمانے کے ماحول نے ان کی خوداعتمادی، جوشِ عمل، علوِ ہمت کے جذبات مضمحل و افسردہ کر دیئے تھے۔ پھر اُن کی زبان سے رجائی اشعار کیونکر نکل سکتے تھے۔ ہاں بعض کے حساس دلوں میں کبھی جذبات پیدا ہوتے تھے تو اُن کی زبان سے کبھی کبھی قنوطیت سے بغاوت کا اگرچہ کبھی دبی زبان سے اظہار ہو جاتا تھا۔ آتشؔ

ہندوستانی شعرا کے کلیات اور دیوان چھان ڈالیے۔ آپ کو زیادہ تر اس قسم کے اشعار ملیں گے۔ جیسے

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم	کب ملے گا مجھے پیا میرا	حاتم
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا	قائم
کیا اس چمن سے باندھ کے لے جائیگا کوئی	دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا	سودا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر	اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا	میر
نہیں ہے مثل صدف مجھ سا دوسرا کم بخت	نصیب گہر مرے منہ کا آب و دانہ ہوا	آتش
کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں لگایا	نہ الجھا خار دامن سے کبھی میرے بیاباں کا	ناسخ
نہ تجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد	نکل کر کیا کریں گے آشیاں سے	مومن
ہے تو انسان خاک کا پتلا	لیک پانی کا بلبلا دیکھا	ظفر
آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب	کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد	غالب
درد منت کش دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا	″
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید	ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے	″
رلائیگا یاد اے غم ہم کو بعد مرگ تو برسوں	کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں	امیر
عالم یاس میں گھبرائے نہ انسان بہت	دل سلامت ہے تو حسرت بہت ارماں بہت	داغ
پھر بیٹھے ہیں کس امید پر ہم	مرنے کا جو آسرا نہیں ہے	تسلیم
ان راتوں کو تڑپیں گے یونہی جاں اپنی کھوئیں گے	تری مرضی نہیں اے دردِ دل اچھا نہ سوئیں گے	شاد
کچھ امید کرم میں گذری عمر	کچھ امید کرم میں گذرے گی	فانی

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی — یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیئے — فانی

ایسے اشعار تعداد میں بہت کم ہیں جن میں رجائیت جھلکتی ہے، جیسے :-

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں — درد
شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش — لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا — آتش
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے — غالب
کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں غالب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی — "
غیر سے سرگوشیاں کیجیے پھر ہم بھی کچھ — آرزوہائے دل درد آشنا کہنے کو ہیں — مومن
لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں — بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں — اثر
بہار آتے ہی وہ اک بارگی میرا تڑپ جانا — وہ جا پڑنا قفس کا آپ سے آپ اڑ کے گلشن میں — اکبر

عصر حاضر کے شعراء نے اس قنوطیت کے خلاف جہاد کیا ہے۔ بیسویں صدی میں سب کے پیشرو بے شبہ علامہ اقبال ہیں۔ آپ کے کلام میں آج سے چالیس سال قبل بھی رجائیت موجود تھی، اور آخری کلام بھی اسی جذبہ سے لبریز ہے۔ دیگر شعراء نے گزشتہ پچیس سال میں اپنا رنگ بدلا ہے۔ ورنہ اس صدی کے ابتدائی عشرہ میں بھی وہی قنوطیت غالب نظر آتی ہے۔

اقبال فطرتاً رجائی تھے۔ ہر شخص کم و بیش مصائب کا شکار ہوا کرتا ہے۔ اقبال کی زندگی بھی مکروہات و علائق سے خالی نہیں۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آنے کے بعد کئی سال تک آپ بے شمار مشکلات سے دوچار رہے جن کے باعث عرصۂ حیات تنگ نظر آتا تھا۔ عطیہ فیضی صاحبہ کے نام کے خطوط سے اس اختصار کی توضیح ہوتی ہے۔ لیکن باوصف ان تمام مکروہات و مصائب کے آپ عطیہ صاحبہ کو لکھتے ہیں "

سمجھنا کہ میں قنوطی ہوں۔ کلفت میں بڑی لذت ہوتی ہے۔ میں اپنی سیہ بختی میں ہی لطف پاتا ہوں اور ان لوگوں پر مجھے ہنسی آتی ہے جو خود کو خوش و خرم سمجھتے ہیں"۔

پھر اقبال کا درس اور پیغام بھی تشکک و قنوط کے منافی ہے۔ اس لئے فطری طور پر آپ کا تمام فارسی اور اُردو کلام رجائیت سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا معلم اور مبلغ ارادہ بھی کرتا تو شاید اپنے اشعار سے رجائیت کو حذف نہ کر سکتا تھا۔ خودی اور عمل آپ کے درس کے غیر منفک اجزا ہیں۔ آپ کی تعلیم کو سکون اور یاس سے بُعد بعید اور سیر و حرکت اور امید و رجا سے قریبی تعلق ہے۔ اس لئے آپ کی غزلیں، نظمیں اور مثنویاں سب رجائیت میں ڈوبی ہوئی ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ صرف اقبال نے فارسی اور اُردو میں جس قدر رجائی اشعار پیش کئے ہیں اتنے کسی دور کے چند شعرا بھی مجموعی طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ میں مثال میں اُردو کے چند اشعار پیش کرتا ہوں:-

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ ____ پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں ____ کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

تنک بخشی سے استغنا کو پیغام خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم، نگوں جام و سبو کر لے

دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ شکن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو

پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو — اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے

کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل — یہی ہے فصلِ بہاری، یہی ہے بادِ مراد

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ — پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں

کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں — ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے

حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو

نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ بازی کا

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے
دریا میں موتی، اے موجِ بیباک — ساحل کی سوغات ہے خار و خس و خاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے — جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں — مستی ہے جس کی بے منتِ تاک
ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد — ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے — خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

تغزّل

تمام اصنافِ شعر میں غزل سب سے زیادہ حسین اور دلکش قسم ہے۔ اس لئے کہ غزل کا تعلق جذبات اور احساسات سے ہے۔ غم والم، سرور و انبساط اور عشق و محبت سے غزل کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ صحیح جذبات اور سچے معاملات، فطری تخییل، اور موثر انداز، درست ترکیبیں اور چست بندشیں، حُسنِ ادا اور ندرتِ بیان، شیریں الفاظ اور صحتِ زبان اس کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ اسی لئے صرف وہ شعرا جو حساس طبیعت، وسیع مشاہدہ، صحیح تخییل، بلند نگاہ، توازنِ دماغ اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں کامیاب اور مستند غزل گو ہو سکتے ہیں۔ جن میں یہ صفات نہ ہوں اُن کی غزلیں ٹکسال باہر ہیں۔ قدیم و جدید اساتذہ کے دواوین کو دیکھئے۔ ان کے دیوانوں کے

ہزاروں ورق اُلٹ جائیے تب کہیں ان کے تیرونشتر دستیاب ہوتے ہیں۔ ابتدا سے لے کر اب تک ایسے باکمال صاحبانِ ذوق غزل گو جن کے منتخبات میں بھرتی کے چند شعر بھی مشکل سے ملیں اور سارے کا سارا کلام انتخاب ہو صرف چھ نظر آتے ہیں۔ خواجہ میر دردؒ، شاہ نیاز احمدؒ، مرزا غالب، علامہ اقبالؒ، حسرت موہانی اور فانی بدایونی۔

غزل کے اصل مضامین اور صحیح تغزل کا رنگ کیا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیجئے۔ اور حسن و عشق کے حقیقی جذبات و کیفیات اور معاملات و واردات دیکھئے:۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا
کہنے تو ہوں یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے — حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا
سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں — ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں
ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی — فریاد سے ملتی نہیں فریاد کسی کی
مجھ کو خبر نہیں کہ مرا مرتبا ہے کیا — یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا
گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی — میں بھول جاؤں گا کہ مرا مرتبا ہے کیا

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے — حسرتؔ

لیکن غزل کی ملنساری اور رواداری نے حسن و عشق کے میدان سے آگے قدم بڑھایا اور اخلاق، فلسفہ، تصوف وغیرہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے اندر جگہ دی اور انہیں پر بس نہ کیا، عام اجازت دے دی کہ جس قسم کا مضمون بھی ہو غزل میں کھپایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ الٰہیات، نفسیات، خمریات وغیرہ سبھی کو جگہ مل گئی۔ لیکن اس درآمد کے لئے پاسپورٹ ضروری رہا یعنی حسن و عشق کے سوا دوسرے مضامین بیان کرنے کے لئے دو شرطیں ہیں۔ یا تو یہ کہ ان نکات و حقائق کو اس طرح بیان کیا جائے کہ شاعرانہ اندازِ بیان اور غزل کا لطف ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ یا یہ کہ بظاہر تو مضمون عاشقانہ ہو لیکن غور کرنے پر کسی علم و فن کا کوئی مسئلہ حل کیا گیا ہو جیسے:-

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں (شیفتہ) گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں — اخلاق

سب اس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ " آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں — تصوف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا (غالبؔ) میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے — نفسیات

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی " یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے — "

کہہ گیا ساقیِ سرشار یہ چلتے چلتے (داغؔ) آپ جو رنگ میں ڈوبے گا، ڈوب جائے گا — تصوف

آرام طلب ہوں کرمِ عام کے طالب " یوں مفت میں لٹتی نہیں بیداد کسی کی — "

دورِ جدید میں غزل میں زبردست انقلاب ہوا ہے۔ پچھلے شعراء میں سے اکثر غیر محتاط حضرات نے شوقیانہ تخیل، بے لطف مضمون آفرینی، مبتذل معاملات، معشوق کے حلیہ و پوشاک کا غیر مہذب تذکرہ، اور غیر معتدل رعایت لفظی سے غزل کا دامن داغدار کر دیا تھا۔ شعرائے عصرِ حاضر نے متانت و لطافت، سوز و گداز

اور حقیقی و واقعی جذبات کو پھر سے غزل میں جگہ دی۔ اور متوسطین کی رفعتِ تخیل، ندرتِ ادا، جدید تراکیب اور نادر استعارات کو بھی از سرِ نو فروغ دیا، اور فلسفہ و نفسیات، تصوف و الہیات، اخلاق و سیاسیات وغیرہ سے غزل کو مالا مال کر دیا۔

اس انقلاب کے اسباب حسب ذیل ہیں:-

(۱) سائنس اور فلسفہ جدید سے رفعتِ فکر پیدا ہوئی۔

(۲) انگریزی شاعری کے مطالعہ نے وسعتِ نظر عطا کی۔

(۳) جدید خیالات کے لئے نئی ترکیبوں کی ضرورت ہوئی۔

(۴) اعلیٰ التعلیم نے خیالات کو وسعت بخشی۔

(۵) تہذیب و معاشرت میں انقلاب پیدا ہوا۔

(۶) غالب کی تقلید عام ہو گئی۔

(۷) غالب کی رفعتِ تخیل، علوِ فکر اور اختراعِ تراکیب کی بہترین تقلید علامہ اقبال نے کی تھی۔ اور اس حد تک ان صفات میں کمال پیدا کر لیا تھا کہ ہر اعتبار سے غالب سے بدرجہا برتر اور ممتاز ہو گئے تھے۔ اقبال کے فلسفیانہ اندازِ بیان، موزوں انتخابِ الفاظ، ایجادِ تراکیب، نادر استعارات اور جدت و ندرتِ بیان نے آپ کے کلام کو اس قدر مقبول و دل پسند بنا دیا کہ عصرِ حاضر کے شعراء نے آپ کی تقلید کو موجبِ فخر جانا۔ یہ ساتواں سبب ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال نے فارسی اور اردو میں بہت غزلیں کہی ہیں۔ آپ کی غزلوں میں حسن و عشق کے صحیح اور سچے جذبات بھی ہیں اور فلسفہ و تصوف وغیرہ بھی انہی شرائط و قیود کے ساتھ جو غزل میں ان مضامین کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہیں، موجود ہے۔

تطویل کے الزام سے بچنے کے لئے تفصیلی مثالوں سے یہاں گریز کرتا ہوں اور صرف "بالِ جبریل" میں سے مختلف مضامینِ غزل کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ اقبال کے کلام میں ایسے مضامین کی کس قدر افراط ہے :۔

گیسوئے تابدار کو، اور بھی تابدار کر (تغزل) ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں، حُسن بھی ہو حجاب میں ، یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو ، کھٹک سی ہے جو سینہ میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو ، یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

نہ کردیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں ، مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

تُو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ ، تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

عشق کی اِک جست نے طے کردیا قصّہ تمام ، اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا مَیں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق ، تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا مَیں

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں ، خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اِک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور ، مَیں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

نخچیرِ محبت کا قصّہ نہیں طولانی ، لُطفِ خلشِ پیکاں آسودگیِ فتراک

رمز ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی ، ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب ، کہ مَیں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

احوالِ محبت میں، کچھ فرق نہیں ایسا ، سوز و تب و تابِ اوّل، سوز و تب و تابِ آخر

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر — اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ (تغزل ۱)

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا — کم کر گلۂ برہنہ پائی ,,

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں — نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے (تغزل)

مئے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن — کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی ,,

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق — ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو ,,

تجھ سے مری زندگی، سوز و تب و درد و داغ — تُو ہی مری آرزو، تُو ہی مری جستجو ,,

ستاروں سے آگے جہاں اَور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اَور بھی ہیں! ,,

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اَور بھی ہیں! ,,

تُو ہے محیطِ بیکراں! مَیں ہوں ذرا سی آبجُو — یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر ,,

مَیں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو — مَیں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر ,,

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی — کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ ,,

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم — اِک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں ,,

نگہ پیدا کر اے غافل تجلّی عین فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا ,,

عجب مزا ہے مجھے لذّتِ خودی دے کر — وہ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنے آپ میں نہ رہوں ,,

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور — کسے خبر کہ تجلّی ہے عینِ مستوری ,,

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی ,,

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا ,,

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں (اخلاق)

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں ״

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد ״

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے ״

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات — ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی ״

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں — کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی ״

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں — فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق ״

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری ״

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں — مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں ״

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر — یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ ״

میری بساط کیا ہے، تب و تابِ یک نفس — شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا (فلسفہ)

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا — صفائے پاکیِ طینت سے ہے گہر کا وضو ״

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری — محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا ״

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا — وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں ״

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں ״

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی — تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن ״

من کی دُنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق — تن کی دُنیا؟ تن کی دُنیا سود و سودا مکر و فن ״

کمال ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری — کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری ״

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
(فلسفہ) عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیات بے شرف

یہ دیرِ کہن کیا ہے؟ انبارِ خس و خاشاک — مشکل ہے گزر اس میں بے نالۂ آتشناک ″

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ″

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل — حیات، سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں ″

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات — خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں ″

تارے آوارہ و کم آمیز — تقدیرِ وجود ہے جدائی ″

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی (سیاست)

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ — جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز ″

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی ″

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے — کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی ″

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا ″

وہ چنگاری خس و خاشاک میں کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا ″

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار — طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر ″

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب — تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر ″

بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا — کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا ″

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک — یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے ″

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے (مسیات)

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر — مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری ״

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی ״

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی ״

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں — خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے ״

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر — کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے ״

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے — شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر ״

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر ״

کیا دبدبۂ نادر، کیا شوکتِ تیموری — ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مئے ناب آخر ״

خلوت کی گھڑی گزری جلوت کی گھڑی آئی

چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر ״

شعر اور پیغام

"مشہور ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" یعنی شاعر میں کچھ پیغمبرانہ اوصاف بھی ہوتے ہیں۔ پیغمبری کیا چیز ہے؟ تمام صفاتِ پیغمبری کا خلاصہ اور جامع صفت یہ ہے کہ قدرتی طور پر پیغمبر کو "توازنِ دماغ" حاصل ہوتا ہے جس کو "معیارِ کامل اور نقدِ صحیح" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی پیغمبر کے دماغ میں اس طرح کی موزونیت، تناسب، انقادیت ہوتی ہے کہ کسی خیال، کسی ارادے، کسی فعل، کسی قول کا مناسب، برمحل، جائز و صحیح ہونا

خود اس کی طبیعت و فطرت بغیر غور و فکر کے بتا دیتی ہے۔ یہی وصف فطری و حقیقی شاعر میں بھی ہوتا ہے کہ کسی تخئیل، کسی لفظ، کسی بندش، کسی طرزِ ادا کی صحت و فصاحت، حسن و لطافت کو جانچنے کے لئے اس کو فکر و تامّل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی شاعرانہ فطرت خود آنِ واحد میں ادراک کر لیتی ہے اور فیصلہ کر دیتی ہے۔ پیغمبر کو اس وصف سے کام لینے اور منصبِ پیغمبری کو پورا کرنے کے لئے عصمتِ پیغمبری عطا ہوتی ہے یعنی راہِ راست اور صراطِ مستقیم سے منحرف ہونا پیغمبر کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ خطا و انحراف کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں آتا۔ شاعر اس وصف میں پیغمبر کا شریک و مساوی نہیں ہے۔ شاعر میں یہ عزیمت کمزور اور یہ عصمت ناقص ہوتی ہے۔ پیغمبر میں شاعری کی اصلی روح اس قدر خالص اور لطیف ہوتی ہے کہ وہ عمر بھر کوئی شعر نہ کہنے پر بھی اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر سے زیادہ صحیح تخئیل اور فصیح بیان کا مالک ہوتا ہے۔ پس پیغمبر اگر شاعری کرنے لگے تو اس کے لئے یہ مرتبہ نزولی ہے۔ اسی لئے فرمایا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ۔ لیکن شاعر اگر اپنی شاعری کے اندر پیغمبرانہ توازنِ ذہنی و قوتِ تمیز، پیغمبرانہ تخئیل و اسلوبِ بیان پیدا کر سکے تو یہ اس کی معراجِ کمال ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے: اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِيْذُ الرَّحْمٰنِ[1]۔

یہ کمال شاعری علامہ اقبال رح میں بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ یہی باعث ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنے پیغام کے لئے "شعر" کو واسطہ اور ذریعہ قرار دیا۔

مزید تشریح کے لئے یوں سمجھئے کہ خطابت و بلاغ کے لئے دو ہی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ تقریر یا تحریر۔ پھر تحریر یا منثور ہوگی یا منظوم۔ تقریر یا خطبہ ان

---

[1] پروفیسر حامد حسن قادری، تاریخ مرثیہ گوئی صفحہ ۲۔

تینوں میں سب سے کم مفید طریقہ ہے۔ اِس لئے کہ اس کا اثر عارضی ہوتا ہے۔ پُرجوش خطبات نے سلطنتیں بدل دی ہیں، ملکوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے، اور اقوام میں ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ لیکن یہ تاثرات کبھی دیرپا نہیں ہو سکتے زمانۂ ثانی کے وقت انہی سامعین پر جب ردّعمل ہوتا ہے تو خطبوں کی تعلیمات فراموش کر دی گئی ہیں، اور انہی لوگوں نے جو ان لکچروں کے مخاطب تھے، اِن نظریوں کو مسترد کر دیا ہے۔ پھر ایک بڑی بات یہ بھی ہے کہ خطبات ایک مخصوص وقت میں محدود طبقہ تک پیام رسانی کر سکتے ہیں۔ اس پیام کو زندگی و پایندگی حاصل نہیں اور وہ افراد جو غیر حاضر ہوں، اِس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس تحریر دیرپا اور مستقل شے ہوتی ہے، جو اقوام و افراد کی ذہنیات و تخیلات کو منقلب کر دیتی ہے۔ اور مخاطب اشخاص پر پایندہ و مستقل اثرات مرتب و مرتسم کرتی ہے۔ تحریر میں بھی نثر کے مقابلہ میں نظم میں یہ صفت زیادہ تر پائی جاتی ہے۔ تمام دُنیا کی زبانوں میں جو کتابیں زندہ جاوید خیال کی جاتی ہیں النظم میں ہی ہیں۔ کتب مقدسہ کے سوا کسی زبان میں بھی نثری تصنیفات کو منظومات پر ترجیح و تفوق حاصل نہ ہو سکا۔ وحیِ الہٰی کے لئے زیبا نہ تھا کہ وہ شعر کے لباس کو اختیار کرے۔ لیکن انسانی پیغام بالخصوص وہ پیغام جس کو بقائے دوام حاصل ہو اور جو اقوام و ملل کی اصلاح و تعمیر کا کام انجام دے سکے ہمیشہ شعر کی صورت میں ہی ادا ہوا ہے۔ دراصل، ہومر، ڈینٹے، نابغہ، زہیر، فردوسی رومی، سعدی وغیرہ کی تصنیفات اِس دعوے کی روشن دلیلیں ہیں۔ ایشیائی اقوام کی ذہنیت خاص طور پر کچھ اِس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ ان میں اصلاح و انقلاب کے لئے جس قدر مؤثر ذریعہ شعر ہے، نثر اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ عرب و عجم کی قدیم

جدید تاریخ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اسی لئے اقبال نے بھی اپنے پیغام کی تبلیغ کے لئے شعر کو آلۂ کار بنایا کہ شعر کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ شعر اپنی رنگینی و رعنائی و موسیقیت کی بدولت عوام و خواص کی توجہات کے لئے خاص جذب و کشش رکھتا ہے۔ چنانچہ اقبال کا کلام ان کی زندگی ہی میں لاکھوں کروڑوں افراد نے پڑھا اور سنا جس نے سمجھا اس نے بھی اور جو نہ سمجھ سکا اس نے بھی اثر پذیر ہوا اور اہل دماغوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، نااہلوں کو فائدہ نہ ہوا۔ مگر حظ اور لطف سے وہ بھی محروم نہ رہے پھر ان میں بھی بہت سے ایسے نکلے کہ مداومت و مزاولت نے ان کے دماغوں پر بھی غیر فانی نقوش مرتسم کر دیئے۔

اقبال کا مرتبہ

(۱)

انیسویں اور بیسویں صدی کے اردو اور فارسی شعراء میں اقبال کا مرتبہ بلند اور بے حد بلند ہے۔ تخیل کی عظمت، نظر کی وسعت، فکر کی رفعت، ترجمانی حقیقت، زود اثر اور صاحب درس و پیغام ہونے کے اعتبار سے کوئی دوسرا شاعر آپ کا مثیل و ہمسر نہیں ہے۔ اب سے ایک صدی قبل غالب نے شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا تھا۔ مگر غالب کی رفعتِ نظر ان کو "تشکیکیت" کی حدود سے آگے نہ بڑھا سکی۔ غالب کو کبھی کبھی "رجائیت" کے نور کی شعاعیں نظر آتی ہیں۔ مگر ان پر جو "قنوطیت" طاری ہے وہ انہیں پھر طلسم تشکک میں گرفتار کر دیتی ہے۔ حالی بے شک پیغمبر سخن تھے جنہوں نے

قوم کے دل و دماغ میں ہیجان و انقلاب پیدا کر دیا۔ حالی نے عہدِ گزشتہ کی عظمت و شوکت کے افسانے دُہرا کر قوم کو پستی و زبوں حالی سے نکالنے کا تہیہ کیا، اور ماضی کی جانب معاودت کرنے کا درس دیا۔ مگر حالی باوجودیکہ وہ ایک پیغمبر تھے پھر بھی حال کے تمام امراض کا علاج نہ بتا سکے، اور نہ مستقبل کے لئے راہِ نجات متعین کر سکے۔ اکبر کا دل بھی انہی جذبات سے لبریز تھا۔ اُنھوں نے بھی اصلاح کا علَم اُٹھایا، اور "یورپ زدگی" کے خطرناک عواقب سے قوم و ملک کو باخبر کر کے مغربی رَو میں بہ جانے سے روکنا چاہا مگر یہ کام اُن کے بس کا نہ تھا۔ زمانہ کی رفتار کو بدلنا اور سیلاب کے رُخ کو مقتضیاتِ حال کے مطابق پھیر دینا ایک دوسرے "پیغمبرِ ادب" کے لئے متعین تھا۔ اقبال "شاعرِ ماضی، شاعرِ حال اور شاعرِ مستقبل" تینوں حیثیتوں کے جامع ہیں۔ اُنھوں نے وہ کام بھی کیا جو حالی نے کیا تھا، وہ مقصد بھی ادا کیا جو اکبر پورا کرنا چاہتے تھے اور "یاس و قنوط" کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اور "متشککیت" کے طلسم سے رہا ہو کر "رجائیت" کی دُنیا کے وہ آئینِ شہبازی بھی سکھائے جو "یقین و عمل" کے اس آخری پیغمبر" ہی کا درس ہو سکتے تھے اقبال بے شبہ اِس عصر کے واحد "مصلح اور مجدد" تھے۔ وہ غزالی و رازی بھی تھے عطار و سنائی بھی، سعدی و رومی بھی، حالی و اکبر بھی اور میر و غالب بھی۔ تصوف و حکمت، عشق و موعظت اثر و رجائیت اور اصلاح و مجددیت کا یہ اجتماع دُنیائے ادب کے اس "خاتم الشعراء" ہی کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا۔

دورِ حاضر میں اور بھی نادر الکلام شاعر اور نظم نگار ہیں۔ مگر ان میں اکثر وہ ہیں جو دُنیائے تفکر اور عالمِ اصلاح کے مفہوم سے بھی نا واقف ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر کہیں سے کہیں بھٹک سا گئے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو

باوصف شوکتِ الفاظ حُسنِ ادا، اور جوشِ بیان کے

"اس قدر ہرزہ سرا ہیں کہ عیاذاً باللہ"

اور "اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ" کا صحیح مصداق ہونے کے باعث ان کی شاعر
نتیجہ "يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ" تو ہوسکتا ہے، قوم کی اصلاح اور رہنمائی تک کب ا
رسائی ممکن ہے۔ "او خویشتن گم است کرا رہبری کند"، اس لئے ان حضرات کا
سے ٹکر لینا یا ان کا ہمسر و عدیل ہونے کا دعویدار بننا مجنونانہ و مذبوحانہ افعال
وقعت نہیں رکھتا۔ اقبال میں اور ایسے مدعیانِ سخن میں جو فرق ہے، وہ خود
ہی کے ان اشعار سے واضح ہے۔ اقبال تو مصداق ہیں ان اشعار کے:-

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہوگئی بیدار — شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و براّ
اس کی نگہِ شوق پہ ہوتی ہے نمودار — ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اظہا

اور دوسرے شعرا سے ان کا موازنہ یوں ہے:-

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو — تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آ

اقبال نے عصرِ حاضر کے عقاید و تخیلات میں انقلاب پیدا کردیا۔ چنا
ادب نے بھی اس انقلابی لہر کو قبول کیا۔ آج جو شاعری "گل و بلبل" کے افسا
خالی نظر آتی ہے، اس کا سبب "تقلیدِ اقبال" ہی ہے۔ یہ خصوصیت پنجاب
شعرا میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے کہ انہوں نے اقبال کے درس سے صحیح
اٹھا کر کامیاب تقلید کی ہے۔ بقیہ شعرا میں دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جو
میں گرفتار ہیں، اور اس لئے اس انقلاب کا اثر قبول کرنے سے انکار کرتے
ان میں بجز مستثنیات کے سب وقت ضائع کرتے ہیں، اور ادب میں کوئی

اضافہ بھی نہیں کرتے۔ دوسرے وہ حضرات جو گامزن تو اسی راہ پر ہیں مگر اعتراف حقیقت کو شاید اپنی سبکی سمجھ کر دوسروں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتے ہیں حالانکہ دانستہ یا نادانستہ اقبال کی تقلید سے باز نہیں رہ سکتے حقیقت امر یہ ہے کہ شبلی، حالی، نذیر احمد اور اکبر نے جس ادبی انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی، اقبال نے اس کی تکمیل کر دی۔ اور آج (اُن چند غزل گو شاعروں کے سوا جو غالب یا مومن یا امیر یا داغ کے پیرو ہیں) سب خواہ وہ اعتراف کریں یا نہ کریں، اسی "اقبال اسکول" کے متعلم اور مقلد ہیں۔

(۴)

غالب کے مشہور ترجمان اور بے مثل ناقد ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری مرحوم نے اسرار خودی اور رموز بے خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"ہندوستان کے اسلامی ادب میں روح کا ملاء اعلیٰ کی جانب صعود مرزا غالب کے زمانہ سے بدستور جاری ہے۔ غالب، حالی اور اقبال ایک مقدس اقانیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالب نے اس سکون وجمود کا خاتمہ کر دیا جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیئے۔ مگر وہ کوئی غیر معمولی مشکک نہیں تھا، جسے اپنے شک کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اس کا شک ایک چنگاری تھی جس نے دنیا میں آگ سی لگا دی۔ دہلی کی سلطنت اس کی شاعری کی متحمل نہ ہو سکی اور اس کی نگاہ نے اسے ملیامیٹ کر دیا۔

•

حالی نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی، دیکھا کہ دنیا اپنی

حسن ونمائش کے باوجود تباہی کی طرف جارہی ہے۔ اس نظارہ نے اسے بہت متاثر کیا۔ مگر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ اس نے غم ویاس کے ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا اور اپنے اُستاد کی تاخت کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دُنیا کی تعمیر اُٹھائی، اور اسے اپنے سینہ میں نشوونما دی۔ امید کی جھلک نے اُسے نئی زندگی دی اور یوں تنِ مُردہ میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔

"اقبال کی شاعری اب یاس وقنوط کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے، اور نئی عمارت کو متفاولی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام وعدے اور بشارت کا مترادف ہے۔ اس نے زمانۂ حاضرہ کے غیر ملکی اثر پر قابو پا لیا ہے، جو فضائے ہند پر چھایا جارہا تھا، اور یہ سب کچھ اس نے اس اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے جس کا منبع اور مبدا خالص اسلامی ہے۔ اس کی رُوحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے جو اس مادی دَور کی پیداوار ہے۔ اقبال اسلامی کارواں کا سالار ہے جس کی منزلِ مقصود حرمِ محترم ہے۔

"اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور خود ہی جوان ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی دونوں مثنویوں (اسرارِ خودی و رموزِ بےخودی) سے پوری طرح نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے جس کے لئے ہماری نئی نسل پرانے غزل گو شعرا کے دواوین کو بے سُود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے، جس نے مُردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے ہیں۔ زمانہ پر اس کے پیغام کی اہمیت رفتہ رفتہ واضح ہوگی، جو زمانہ حاضرہ کی ان دونوں معرکۃ الآرا نظموں میں پنہاں ہے۔

"مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کام کا جزو ہیں جو تکمیل کے بعد اسلامی دُنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہوگا[1]۔ اقبال کے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزّل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی کی بجائے "افلاطونی بے عملی" کو اختیار کر لیا ہے۔" افلاطونیت جدیدہ" اور حافظ نے ان سے وہ احساس مسرّت چھین لیا ہے جو" کچھ کر لو" کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اور اس کی جگہ اس دماغی تفتیش نے لے لی ہے جو ایک تنِ بیمار کا خاصہ ہے مسلمانوں میں سنگِ خارا کی سختی کی بجائے کوئلہ کی سی نرمی آگئی ہے۔ خوفِ خدا کی جگہ مخلوقِ خدا کا خوف ان پر حاوی ہو گیا ہے۔ مگر زندگی کا ایک نصب العین بنا لے سے سب خوف دُور ہو جاتے ہیں جو ترقی اور عروج اسلام کے لئے خدا نے ودیعت کر رکھے ہیں۔ پس توحیدِ الٰہی پر کامل اعتقاد خوف کو زائل کرتا ہے، اور دل میں وہ عزمِ صمیم پیدا کرتا ہے جو خلّاقی کا طغرا ہے۔

"اقبال ایک محدود زمانہ کے اندر اسلامی نظام کو از سر نو حیاتِ تازہ اور شباب بخشنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بعینہٖ جس طرح ایک مہوّس مادۂ خام سے سونا نکال لیتا ہے، وہ موجودہ زمانہ کا ہے۔ مگر اس کی نظر مستقبل پر بھی ہے، اور موجودہ زمانہ کا نکتہ چیں بھی ہے۔ ایمرسن افلاطون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ہملیٹ بالکل افلاطونی ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو افلاطون کے "ہملیٹ پن" (متشائم پسندی) کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس متشائم پسندی اور اخلاقی ضعف نے کئی قوموں کو بلندی سے دے پٹکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس زمین پر

---

[1] اقبال کے بعد کی تصنیفات میں "اس غیر فانی کام" کی تکمیل ہوگئی۔

رہیں، اور یہاں کے "کار" کی تکو کاری پر توجہ دیں۔ افلاطون اس پرندہ صبح کی مانند ہے جو ایک اثیری دُنیائے خواب و خیال میں پرواز پر قانع ہے۔ برخلاف اس کے اقبال ایک بحری عقاب کی طرح ہے جو بحرِ حیات کی طوفان خیز موجوں پر سوار ہو۔ اقبال کا فلسفہ خودی اور عمل کا فلسفہ ہے۔

"اقبال میں جان ہے، چُستی ہے، خلاقی ہے، قناعت سے تفاؤل ہے۔ خون تازہ ہے حقیقت پژوہی ہے اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔

"عمل ہی اصل اسلام ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو پھر اسی عمل کی طرف واپس بُلاتا ہے۔ اُس کی حقیقی روحانی تعلیم، اخلاقی قوت، جوش، فکر، سرگرمی اور عمل میں مضمر ہے۔ مگر وہ حافظ سے کیوں برسرِ پیکار رہے؟ اور مولانا جلال الدین رومی کے خلاف کیوں صف آرا نہیں ہوتا؟ حالانکہ موخر الذکر تمام متصوفانہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ صوفی جب اپنے تجربات بیان کرتے ہیں تو انہیں قدرتاً وہ الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو عوام کے فہم و ادراک کے مطابق ہوں۔ خیالات خواہ آسمانی ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر ذریعۂ اظہارِ خیالات زمینی الفاظ ہوں گے عشق حب مے اور نغمہ کے پردوں میں بیان کیا جائے گا۔ عجب نہیں کہ اس سے مادی اور ہیجانی لذات مُراد لی جائیں۔ سنائی، عطار اور رومی باوجود اس کے ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو ان کی حقیقی رُوح کو صاف نمایاں کر دیتی ہے، اور ان کی نظموں کو مادّی تاویل کے جال میں نہیں پھنسنے دیتی۔ ممکن ہے وُہ اپنے ناظرین کو دُنیا سے پرے لے جائیں۔ مگر وہ اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے، برخلاف اس کے حافظ نے ان کے نشہ آور جرعہ میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے۔ اس کا

دیوان بصیرت سے زیادہ سکر آور ہے۔ بلاریب سقراط کی مانند حافظ بھی مخرب اخلاق نہیں تاہم وہ ان کے خراب کرنے میں ممد و معاون ضرور ہوا ہے۔ اس سے بہتوں نے شرابِ حقیقت کی بجائے شرابِ مجازی پی ہے۔ اقبال کا حملہ دراصل اس "اپیکوری رو" کے خلاف ہے نہ کہ شعراء کے مادی تصوف جدیدہ پر۔"

"اقبال نہیں چاہتا کہ اسلام ملکوں کی چہار دیواری میں قید ہو کر لخت لخت ہو جائے۔ اقبال کی سیاست اخوت پر مبنی ہے، نہ کہ خود غرضی پر۔ مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسبان ہے۔ وطن یا ملک ایک عارضی یا جغرافیائی چیز ہے۔ تاریخی حوادث و واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی حیات عارضی ہوتی ہے۔ اور وہ چند صدیوں کے لئے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔ اقبال کی ریاست عالمگیر، مذہبی ہے، خدائی ہے، آدرش ہے اور ابدی ہے۔ مگر باایں ہمہ اقبال یہ نہیں کہتا کہ حبِ وطن حب الایمان کی نقیض ہے۔ کُل میں جزو ہوتا ہے۔ عالمگیر اخوت میں حبِ وطن پوشیدہ ہے۔ اسلامیانِ ہند کے راستے پر دو نشان ہیں۔ اسلامیت محض اور وطنیت۔ اور دونوں زندگی کی ایک ہی منزل کی جانب راہنمائی کرتے ہیں۔ اگرچہ راہیں الگ الگ ہیں۔ درحقیقت اقبال میں مذہب کے غائر مطالعہ اور عمیق جذبہ حب الوطنی کا امتزاج کامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا سیاسی مطمح نگاہ اس کے بلند مذہبی نصب العین کے ماتحت ہے۔ سیاسی نقطۂ خیال اور مذہبی مقصد نظر کے اختلاط نے اس کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی حیثیت دے دی ہے۔

"جب مثنوی کا علم کلام ہر جگہ سمجھ میں آجائے گا تو تمام اسلامی دنیا میں

وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شاندار ہے۔ اقبال ایک پیغمبر ہے۔ وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زریں ماضی کا علم رکھتا ہے اور مستقبل میں اس کی معاودت کا نظارہ کرتا ہے۔

"بعض دفعہ اس ملک میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے۔ کہ آخر مثنویوں کو اُردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مرتب ہوگا؟ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو کہے گا ہے ایک پیغام اور ایک مقصد کے ساتھ منصّہ شہود پر آتے ہیں۔ اس کا پیغام تمام اسلامی دنیا کے لئے ہے۔ اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدی کی گلستان اور دہلی، کابل، طہران، قاہرہ، قازان، استنبول، مدینہ اور مکّہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنوی مولانا روم کی جگہ استعمال کرنے کے لئے ہیں"

(۳)

مشہور مستشرق فاضل ڈاکٹر نکلسن جنہوں نے اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، پیامِ مشرق پر فاضلانہ تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عہدِ حاضر کے ہندوستانی شعرا میں اقبال ایک نہایت ارفع درجہ رکھتا ہے اس کے ساز سے دو قسم کے نغموں کی صدائیں نکلتی ہیں۔ پہلی صدا ہندی الاصل (اردو) جو محبتِ وطن کے جذبات کے لئے داد طلب ہے۔ حالانکہ اقبال سیاسی حیثیت سے وطن پرست نہیں۔ دوسرا سرود خاکِ ایران کی شیریں اور سریلی زبان میں ہے، جو ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ درحقیقت یہ جدید اور فیضانی سرود جو اپنی سحر کاریوں سے آتشیں شعلے اور خاکستر دُور دُور پھیلا رہا ہے، عنقریب ایک الہامی آواز کی حیثیت پیدا کرنے والا ہے۔"

(۴)

سر ٹامس آرنلڈ اسلامک فیتھ میں لکھتے ہیں :۔

"ہندوستان میں حرکتِ تجدید نے اپنا ممتاز ترین ظہور سر محمد اقبال کی شاعری میں حاصل کیا ہے جو مغربی فلسفہ و زندگی کے ایک متین و عمیق محقق ہیں۔ وہ تازہ سے تازہ فلسفیانہ تفکر کی ترقیات سے آگاہ ہیں، اور اُنھوں نے برگسان اور نیٹشے کے کچھ خیالات کو اپنی ذاتی افکار کی دُنیا میں منتقل کیا ہے۔ لیکن سر محمد اقبال اپنے زبردست علم و فضل اور وسیع مطالعہ و تحقیق کے باوجود ہرگز دوسروں کے خیالات کی آواز بازگشت نہیں ہیں۔ بلکہ امتیازی طور پر ایک اوریجنیل مفکر و مجتہد ہیں۔ یہاں ہمیں آپ کے فلسفیانہ تفکر سے تعلق نہیں بلکہ مذہب اسلام کی طرف آپ کے عنانِ طبع سے بحث ہے۔ اپنی شاعری میں وہ حضرت محمد صلعم کی شخصیت سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، جن کی سب باتوں سے بالاتر وہ ایک پیغمبرِ عمل کی حیثیت سے تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اور آپ کا یہ ایمان ہے کہ ایک آئیڈیل پالیٹی رشالی ہیئت اجتماعی) کے اساسات صرف حضرت محمد صلعم کی تعلیم میں دریافت ہو سکتے ہیں، اور عالمِ اسلام (اور اس کے واسطہ سے عالمِ انسانیت) کی نشاۃ جدید شخصیت کے پرزور اظہار، نمو خودی اور ارتقائے نفس کے واسطہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جہاں تک ہر فرد اپنے آپ کو ایک کامل فرد بنانے کی سعی کرتا ہے، اس حد تک وہ ترقی اسلام کو دُنیا میں آگے بڑھاتا ہے۔ عمل کی اس تعظیم میں جیسا کہ حیات النبی صلعم تعلیم دیتی ہے، کوئی جگہ اس جمود و سکون کے لئے نہیں ہے جو مسلم تصوف کا نمایاں و مثالی پہلو بن گیا تھا اور جس کا یہ مفکر سخت مخالف ہے۔ اس دماغِ اعظم کا اثر مسلم نوجوان

نسل پر عمیق اور وسیع ہے۔"

(۵)

مسٹر ہربرٹ ریڈ جو یورپ کے مسلّم اور مستند نقاد ہیں، لکھتے ہیں:-

" والٹ وہیٹمن کا نصب العین اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نظری نہیں بلکہ عملی ہے۔ صرف ایک شاعر ایسا ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے اور وہ بھی ہماری نسل اور قوم سے نہیں۔ میری مُراد محمد اقبال سے ہے جن کی نظم اسرارِ خودی کا ترجمہ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے کیا ہے اور میکملن کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اِدھر ہمارے ملک کے متشاعر[۱] تو کیٹس کے زمانہ کی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور بلبلوں اور پرندوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اور اُدھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلّط کر لیا ہے۔ ایک نوجوان مُسلمان لکھتا ہے: " اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے۔" تم پوچھو گے آخر اس میں کونسی ایسی ظاہر کشش ہے جس نے لوگوں کے دِل اپنی طرف کھینچ لئے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی کسی ظاہری کشش کا مرہونِ منت نہیں جو مبلغوں اور دُنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے، جس کے حُسن و جمال کے آئینہ میں فلسفہ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں۔ اس میں خیالات کی فراوانی ہے۔ لیکن ان میں اتحاد پایا جاتا ہے، اور اس کی منطق ساری کائنات کے لئے

---

[۱] یہی حال اُردو زبان کے شاعروں کا ہے۔

آوازِ غیب کا حکم رکھتی ہے "۔

(۶)

یمین السلطنت ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد، صدرِ اعظم دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن نے ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اس جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے جو علّامہ اقبال کے اعزاز میں باغ عامہ ٹاؤن ہال حیدرآباد میں منعقد کیا گیا تھا بطورِ تعارف فرمایا تھا:۔

" ڈاکٹر اقبال کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی تصنیفات کے انمول اور وسیع گنجینوں کا ایک ایسا لامتناہی تصوّر پیشِ نظر ہو جاتا ہے کہ غرض کلام سے گزر کر جوہرِ بیان میں فکرِ سخنورِ غلطان و پیچان ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال جس مقصدِ حیات کو اپنے علم و عمل سے پورا کر رہے ہیں، وہ انسانی ترقی کو دنیا کے لئے سودمند بنانے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال تصوّف اور عرفان کے آغوش میں پل کر حکیم ہوئے ہیں اور ان کے حکیمانہ خطبات سے ہم سب کو یکساں مستفید ہونے کا اب بالمشافہ موقع ملا ہے جس کی ہم عزت اور قدر کرتے ہیں "

نیز مہاراجہ صاحب بہادر نے " یومِ اقبال " کے اجلاس کی دوسری نشست کی صدارت کرتے ہوئے ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو ٹاؤن ہال حیدرآباد میں فرمایا تھا

" خودی اقبال کے کلام کا سرنامۂ امتیاز ہے، اور یہی ایک لفظ اس تمام دعوتِ سعی و عمل کا آئینہ دار ہے۔ خودی احساسِ نفس بلکہ عظمتِ نفس کا درس ہے جسے اقبال کی باریک بیں نظروں نے پہچانا اور مشرق کی موجودہ پستی نے اس کے

حساس دل کو سمجھایا کہ جب تک اس کو نصب العین نہ بنایا جائے گا، یہ حقیقت نزول میں آئی ہوئی اقوامِ مشرق کائنات میں اپنی بقائے حیات کے لئے جگہ نہ حاصل کر سکیں گی
"حقیقت میں اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے، وہ اس کا جائز حق ہے اور اس کا پیغام فرزندانِ مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ آئندہ نسلیں اس کا فیصلہ کریں گی کہ ہندوستان کی ادبی ناہمواری کی اصلاح اور قومی ترقی میں اس زندۂ جاوید شاعر کا کس قدر حصہ تھا؟"[1]

(۷)

مشہور سخن سنج و سخن فہم رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:۔

"میں یہ کہنے کی ضرور جرأت کروں گا کہ میں بعض ایرانی ادبا و فضلا سے یورپ اور دیگر مقامات پر ملا ہوں۔ ان سب نے اقبال کے فارسی زبان پر قدرت کاملہ رکھنے کی مجھ سے بہترین الفاظ میں مدح سرائی کی ہے۔ پروفیسر براؤن آنجہانی نے بھی جو فارسی زبان کے بہت بڑے فاضل تھے اور جو ہندوستانی شعرا کی لکھی ہوئی فارسی کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے، مجھ سے ایک بار کیمبرج میں فارسی زبان کے شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کی شاندار الفاظ میں تعریف و توصیف کی۔"

نیز لکھتے ہیں: "اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی

---

[1] ماخوذ از شادِ اقبال

تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا، یا کالیداس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا۔ اس کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ اور مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدر دانی میں کمی کی[1]۔

(۸)

ڈاکٹر محمد نظام الدین ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی، صدر شعبہ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے میری کتاب "ادبیات ایران نو" پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کرم نامہ میں تحریر فرمایا تھا:۔

"میرے خیال میں اس عبوری دور میں نثر کا رنگ تو کچھ قائم ہو گیا ہے ابھی شاعری اپنے اعلیٰ منصب پر فائز نہیں ہوئی ہے۔ "سر محمد اقبال" کی ٹکر کا ایک شاعر ابھی تک ایران نے اس دورِ جدید میں پیدا نہیں کیا"۔

(۹)

آقائے محترم سید محمد علی داعی الاسلام، پروفیسر فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن نے اپریل ۱۹۲۸ء میں شعبۂ جامعۂ معارف حیدرآباد دکن کے ماہانہ جلسہ میں اقبال کی فارسی شاعری پر ایک لیکچر دیا تھا۔ جناب تمکین کاظمی صاحب نے اس خطبہ کا ترجمہ کیا تھا جو نیرنگِ خیال جولائی ۱۹۲۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس ترجمہ سے اقتباس کر کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک مستند ایرانی فاضل و نقاد کی اقبال کی شاعری اور زبان کی بابت کیا رائے ہے۔

[1] اقبال (انجمن ترقی اُردو دہلی)

"اقبال کوئی ایسے 'عادی' شاعر نہیں ہیں، جو فرضی عشق کی بنا پر گل و بلبل شمع و پروانہ، قمری و سرو کے مضامین باندھتے پھریں۔ جس سے سامع کو صرف ایک لذتِ استماعی حاصل ہو۔ بلکہ وہ ایک قائد لطائف دارائے نصب العین ہیں بلبلِ اقبال شاہین کردہ مریخ کو شکار کرتا ہے۔ اِن کی بوکاشن ناہید تک پہنچتی، ان کی شمع بزمِ تمدّنِ عالم کو روشن کرتی اور ان کی قمری سرو بستان کے عوض فرازِ طوبیٰ پر تجسسِ معرفت میں کوکو کہتی ہے۔

"اقبال دورِ حاضرہ کے بہترین علماء اور تربیت یافتوں میں سے ہیں علوم قدیمہ و جدیدہ سے تفحص حاصل کرکے گنجِ دانش سے گوہرِ شاہوار چن کر بازارِ شاعری میں لا رکھا ہے۔ وہ جو قیمت چاہتے ہیں، یہ ہے کہ مغزِ بیدار اور دلِ دردمند ملے"

"ہندوستان کے تمام اساتذہ میں ایک ایک خاص رنگ موجود تھا۔ جو اُن کے کلام کی خصوصیت رہا ہے۔ اسی طرح اقبال کا رنگ غالب کے رنگ سے بہت ملتا ہے۔ غالب نصف صدی قبل اُردو اور فارسی کا اُستاد مانا جاتا تھا اس لئے مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کے بعد چشمِ ہندوستان اقبال کی وجہ سے پُر نور ہے۔ کسی قدیم اُستاد نے اساتذہ کی جانشینی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو اس طرح ختم کیا ہے کہ ؎

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید — بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے اس پر اِس شعر کا اضافہ کیا تھا:-

زجامی بہ عرفی و طالب رسید — زعرفی و طالب بہ غالب رسید

اب مَیں اِس پر اِن دو شعروں کا اضافہ کرتا ہوں:-

چو غالب نے ہندوستاں رخت بست　　　　بجائے وے اقبال دانا نشست
یقیں داں سخن دانی باستاں　　　　بماند بہ ہندوستاں جاوداں

"اقبال کے وطنی اشعار کا مقابلہ اگر ایران کے مشہور شعرائے وطنی عارف وبہار سے کیا جائے تو چنداں نازیبا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اقبال اگر ایران میں ہوتے اور فارسی زبان میں وطنی شعر کہتے تو وہ وہاں کے مشہور اساتذہ کی صف میں جگہ پاتے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کے اردو وطنی اشعار نے مجھے جس قدر متاثر کیا، اس قدر ایران کے جدید شعرا کے اشعار نے نہیں کیا۔"

(۱۰)

جناب شہزادہ احمد علی خاں صاحب دُرّانی مدیر انجمن ادبی کابل تحریر فرماتے ہیں:۔

"جس قوم میں پستی اور قعرِ ذلت سے اُبھرنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے اس میں خود اپنی تباہ حالت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور پھر اس بیدار شدہ جماعت میں سے کوئی فرد (جس میں سیادت وقیادت کی اہلیت ہوتی ہے) اس کاروانِ ساکت وصامت کو اپنے بانگ درا سے صحیح جادہ پر سرگرم عمل وجستجو بنا دیتا ہے۔

"چنانچہ وہ سارا جمود اور خوابِ غفلت جو کہ مللِ اسلامیہ پر طاری تھا۔ اب اس کو کافی احساس ہوتا جاتا ہے۔ اور اکثر ممالک میں قائدینِ ملت عقلِ رسا سے کام لے کر اپنی قوم کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ چنانچہ اقبال بھی انہی قائدین میں سے ایک ہیں جن کی درد بھری آواز نے قوم وملت کے حق میں صورِ اسرافیل کا کام کیا ہے

"اقبال، فلسفہ، تاریخ، الٰہیات اور سیاسیات سب میں کمال رکھتے ہیں اور اس لئے وہ ایک ہی وقت میں مدبر بھی ہیں، شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے یعنی مذہبیات، چنانچہ علامہ موصوف مذہب اسلام کے بھی بہت بڑے رہنما ہیں۔

"اقبال نے شاعری کے سکون و اضمحلال (کہ شاعری کا زوال درحقیقت اقوام کے زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے) کی بیخ کنی کر دی ہے۔ اور کاروانِ ملت کو تخیل عشقی کی مانند جد و جہد اور علم و عمل کے میدان میں سرگرم کر دیا ہے۔

"اقبال نے بھی رومی کی قیادت میں معرکۂ حسن و عشق طے کرنے میں تصوف میں فلسفہ کی چاشنی دے کر آب رکناباد و گلگشتِ مصلےٰ کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ علو تفکر اور نزاکتِ خیال میں وہ کلیم کی یادگار ہیں، اور حسنِ تخاطب میں بلبلِ شیراز ہیں۔ مثالیہ میں غنی کشمیری اور صائب اصفہانی کا جواب ہیں۔ تغزل میں بھی حافظ اور نظیری سے جرعہ کش ہیں، اور شاعرانہ حیثیات کے علاوہ اقوام و اُمم کا فلسفہ و تاریخ اور ان تمام رموزِ حکمت و الٰہیات سے بھی واقف ہیں۔ جو نوعِ انسانی کی ترقی کے سامان بن سکتے ہوں۔ پھر علوم دینیہ اور اسلامی معلومات بھی بدرجۂ کمال رکھتے ہیں۔ کتب یورپ کے مطالعہ نے انہیں حیات و جذباتِ انسانی کا نباض بنا دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کی تصانیف شرق و غرب میں ایسی مقبولیت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں، کہ ان کی صفت میں ایک کلمہ لکھنا بھی میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔"

(۱۱)

روزنامہ اصلاح (کابل) میں علامہ اقبال کی وفات پر ایک طویل مضمو

شائع ہوا ہے جس میں ان کی تصنیفات اور تخیلات کی بلند پروازی پر مدلل خامہ فرسائی کی ہے :-

فاضل مضمون نگار لکھتا ہے " علامہ اقبال نے فارسی میں وہ شعر کہنے شروع کئے کہ اہلِ زبان عش عش کر اٹھتے تھے۔ حضرت اقبال کو اسرارِ کائنات کے انکشاف اور کشفِ غوامضِ الہیات و فلسفہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کے تخیلات اتنے بلند تھے کہ مظاہرِ حقیقی کے لاینحل معموں کے حل کرنے میں آپ کو کوئی خاص دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ علامہ اقبال نے حسن و عشق کے مظاہر میں تصوف کی چاشنی سے کام لیا ہے جس سے مولانا روم کا فلسفہ یاد آ جاتا ہے۔ علوِ فکر اور نزاکتِ تخیل کی یہ حالت تھی کہ آپ کے اشعار کلیمؔ اور بیدلؔ کی سی وقعت پیدا کر گئے حسنِ تخاطب ایسا کہ بلبلِ شیراز کی روح شاد ہو۔ استعارات اور تشبیہات میں غنی کشمیری اور صائب اصفہانی کے سوا آپ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ کا پیمانہ تغزل حافظؔ اور نظیریؔ کی طرح سرشار تھا "

" علامہ اقبال محاسنِ شعری کے علاوہ فلسفہ، تاریخ حیات اقوام و اُمم، علم نفسیات، نکاتِ حکمت و الہیات، علوم دینیہ اسلامیہ میں وسیع معلومات رکھتے تھے، اور فلسفہ علوم و حقائق روحی ملل و اقوام میں آپ کی آگاہی درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ خدمت و اصلاح اقوام میں آپ کو خصوصی درجہ حاصل تھا آپ ماہرِ علمِ نفسیات تھے۔ اس لئے قوم کی نبض دیکھ کر فی الفور اس کا علاج تشخیص کر دیتے تھے۔

" اگرچہ علامہ اقبال سرزمینِ ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن آپ کا علمی

مقام، آپ کی اخلاقی اور فلسفی تعلیمات و تلقینات آپ کو جامع بشری کا ایک جلیل القدر فرد قرار دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ عالم اسلام اور مشرق کے لیئے نابغہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ان منوّر الفکر اور بلند پایہ فلاسفروں میں سے تھے جو سارے کرۂ ارض کو اپنا وطن قرار دیتے تھے اور عالم بشریت کو ایک ملت سمجھتے تھے۔

"اس امر کے اظہار میں کسی کو اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر اقبال زمانہ حال کے مفکّرین، شعراء، اُدَباء اور فلسفہ دانوں میں سب سے ممتاز ہستی کی حیثیت رکھتے تھے۔"

(۱۴)

یہ بھی سن لیجیے کہ ہمارے وہ پیشرو جو اہلِ نظر، اصحاب رائے اور ارباب فن تھے، اقبال کی بابت کیا رائے رکھتے تھے۔ علامہ شبلی مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں دہلی میں اقبال کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا تھا۔ علامہ سید آزاد بلگرامی مرحوم اقبال کو حسّان الہند فرمایا کرتے تھے، اور حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی مرحوم آپ کو فرزدقِ ہند کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔

حضرت اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:-

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظریں جو اُن کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ ذوقِ معرفت — یہ طریقِ دوستی، خودداری با تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے، اہلِ دل تھے، صاحبِ اسرار تھے

علامہ گرامی مرحوم جو اس آخری عہد میں فارسی کے بے مثل شاعر تھے،
بال کی بابت یہ رائے رکھتے تھے :۔

دردیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال　　پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

علامہ عبداللہ العمادی "کلیاتِ اقبال" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔
"میر کا سوز، غالب کی جدت و اجتہاد، مومن کی نازک خیالی، ذوق کی روانی
صفائی، درد کی تاثیر و دلآویزی، شیکسپیر کی فطرت نگاری، ملٹن کی پروازِ فکر
شبلی کی شیریں کلامی، ورڈس ورتھ کی نیچر پرستی، ٹینیسن کی فصاحت، کولرج کی موسیقی
بیٹے کی حکمت شعاری، یہ سب ان کے کلام میں جمع ہیں"

نیز اقبال کی جلالت مآبی کا اندازہ علامہ عمادی مرحوم کے ان اشعار سے کیجیے:

تجھ پر اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تُو اقبال کی دولت سے مالامال ہے

ہم نے مانا تُو نہیں مسحور تہذیبِ فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے

تصنیفات

علامہ اقبال کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :۔

اُردو ۔ علم الاقتصاد ۔ بانگِ درا ۔ بالِ جبریل ۔ ضربِ کلیم ۔

فارسی ۔ اسرارِ خودی ۔ رموزِ بیخودی ۔ پیامِ مشرق ۔ زبورِ عجم ۔ رمع

گلشن[9] راز جدید و بندگی[10] نامہ)۔ جاوید[11] نامہ۔ پس چہ[12] باید کرد اے اقوام شرق (مع مسافر[13])

ارمغان[14] حجاز۔ (اس میں ضرب کلیم اور اقوام شرق و مسافر کے بعد کا فارسی اور اُردو

کلام جمع ہے)۔

انگریزی۔ ملت[15] بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ ایران[16] میں فلسفۂ مابعد الطبیعیات

کا ارتقا۔ اسلام[17] کا مذہبی تخیل۔

غیر مطبوعہ۔ تاریخ[18] عالم (جرمن زبان میں[1])

علامہ کے خطوط اور ان کے احباب و معتقدین کی تحریروں سے کئی اور

کتابوں اور رسالوں کا علم ہوتا ہے، جن کو وہ تصنیف کرنا چاہتے تھے، لیکن آخری چند

سال میں بصارت کی معذوری یا بیماری کے امتداد کے سبب سے، یا تو لکھ ہی نہ

سکے یا تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ اپنے ذہنی ارتقا کی سرگزشت۔ فرماتے ہیں: "میں اپنے دل و دماغ

کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں، اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے

کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے

کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت

انقلاب پیدا ہوگا[2]"۔ نیز لکھتے ہیں: "خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز

ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہو گئی تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود بعض عزائم

کی فہرست میں ہے[3]۔"

---

[1] اقبال از عطیہ فیضی بیگم صاحبہ۔ [2] خط مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء۔ بنام مولانا سید سلیمان صاحب

ندوی۔ [3] خط مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء بنام عشرت رحمانی صاحب۔

۲۔ اجتہاد ۔ (ایک مقالہ)۔ فرماتے ہیں "میں نے اپنے مضمون اجتہاد میں ان کی (یعنی عبادات کی) ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے[1] ...... وہ مضمون شائع نہیں کیا گیا[2]"

۳۔ قوانین اسلام کا فلسفہ ۔ تحریر کیا تھا: "انشاءاللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے ..... اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے[3]" نیز فرماتے ہیں: "اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اب یہ اُمید موہوم معلوم ہوتی ہے[4]"۔ یہ خیال بالکل آخر میں ہی ذہن میں نہیں آیا تھا اس لئے کہ ۷ را پریل ۱۹۲۶ء کو آپ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا: "میرا مقصود یہ ہے کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا۔ مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسی فلسفہ کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے[1]"

---

[1] خط مورخہ ۷ را پریل ۱۹۲۶ء بنام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

[2] خط مورخہ ۷ ر اگست ۱۹۳۶ء " " " " " "

[3] خط مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۳ء بنام خواجہ غلام السیدین صاحب

[4] مکاتیب اقبال

۴ ۔ حاشیۂ قرآن مجید ۔ سر سید راس مسعود مرحوم کو ۲۶ / اپریل ۱۹۳۵ء کو لکھتے ہیں: "اس طرح میرے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآنِ کریم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیرِ غور ہیں۔ لیکن اب تو معلوم نہیں کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا"[1]۔

نیز سر راس مسعود مرحوم ہی کو ۳۰ / مئی ۱۹۳۵ء کو تحریر فرماتے ہیں: "چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد حضور نبی کریم صلعم کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجا لا سکا"[1]۔

۵ ۔ سر راس مسعود مرحوم کے نام کے ۱۵ / جنوری ۱۹۳۷ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ زیارتِ حرمین شریفین کے قصد کے ساتھ وہیں کسی اہم تصنیف (غالباً نظم) کا بھی عزم تھا۔ تحریر فرماتے ہیں: "انشاء اللہ امید ہے کہ سالِ آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے"[1]۔

حضرت علامہ کے وہ خطبات جو آپ نے لندن میں اسلام پر دیئے تھے

---

[1] مکاتیب اقبال

کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے۔ لیکن آپ کی اکثر دوسری تحریریں جو رسائل واخبارات میں شایع ہوئی تھیں بعض اصحاب نے یکجا جمع کر دی ہیں۔ ان میں اسرارِ رموز کے پہلے ایڈیشنوں کے دیباچے بھی ہیں، خطباتِ صدارت بھی، کونسل کی تقریریں بھی، اور وہ مضامین بھی جو سیاسی یا مذہبی مسائل پر کتابچوں کی شکل میں شایع ہوئے تھے۔ ایسے مجموعے چار ہیں: (۱) مضامینِ اقبال (۲) حرفِ اقبال (۳) خطباتِ اقبال (۴) اسپیچز اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال۔

آپ کے مکاتیب کے بھی تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ (۱) شادِ اقبال۔ (۲) مکاتیبِ اقبال۔ (۳) خطوطِ اقبال بنام جناح (انگریزی اصل۔ نیز ان کا اُردو ترجمہ)+

ذیل میں تصنیفاتِ اقبال پر زمانۂ تصنیف کی ترتیب کے اعتبار سے ایک نظر ڈالی جاتی ہے:۔

۱۔ علم الاقتصاد

اکنامکس پر لکھی گئی ہے۔ ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے۔ جبکہ آپ لاہور میں پروفیسر تھے، اور ابھی ولایت بھی نہ گئے تھے۔ اِس کتاب کو یہ تفوّق حاصل ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جو اس فن پر اُردو میں تصنیف یا تالیف کی گئی۔[۱]

۲۔ ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقا

یہ کتاب علامہ کا وہ مقالہ ہے جو

[۱] حاشیہ اگلے صفحہ پر

انگریزی کتاب ۱۹۰۸ئہ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اُردو میں فلسفۂ عجم کے نام سے ترجمہ ہوگیا ہے۔ میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) دیباچہ میں فرماتے ہیں "۱۹۲۷ئہ میں علامہ اقبال سے اِس ناچیز نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ علاّمہ موصوف نے ازراہِ کرم اجازت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ یہ کتاب اِس سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے بہت سے نئے امُور کا انکشاف ہُوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اب اِس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصّہ ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔"

"علمی دُنیا میں تحقیقات کی رفتار اِس قدر تیز ہے کہ جو نظریہ آج رائج ہوتا ہے وُہ کل متغیر ہو جاتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات آج رائج نہیں۔ تاہم ان کی تصانیف کو جو تاریخی اہمیّت حاصل ہے، اس سے کون انکار کرسکتا ہے علاّمہ اقبال کے خیالات میں گو بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ تاہم پیشِ نظر کتاب کی تاریخی اہمیّت قابلِ لحاظ ہے۔ عصرِ جدید کے مستشرقین اس کے حوالے و اقتباسات پیش کرتے ہیں جس سے اِس کتاب کی اہمیّت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔"

اس مقالہ کی تحریر کا مقصد علامہ مرحوم نے خود دیباچہ میں تحریر کیا تھا۔ فرماتے ہیں "اس تحقیق کا مقصد جیسا کہ ظاہر ہو جائے گا۔ ایرانی مابعد الطبیعیات

ملے ۱۱۰۰... کہ مختصر رسالوں کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے جو انیسویں صدی کے وسط میں اُردو میں شائع ... رسالہ کی سی ہے جسے کتاب نہ کہنا زیادہ صحیح ہے"

کی آیندہ تاریخ کے لئے ایک بنیاد تیار کرنا ہے۔ ایسے تبصرہ میں جس کا نقطۂ نظر خالص تاریخی ہے ایسے تفکر کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے جس میں جدت و اُپج ہو۔ تاہم حسبِ ذیل دو امُور کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانے کی جسارت کرتا ہوں۔"

(ا) میں نے ایرانی تفکر کے منطقی تسلسل کا سُراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو میں نے فلسفۂ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے۔

(ب) تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹیفک طریقہ سے بحث کی ہے اور ان ذہنی حالات و شرائط کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جو اس قسم کے واقعہ کو معرضِ ظہور میں لے آتے ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے برخلاف جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ تصوف ان مختلف عقلی واخلاقی قوتوں کے باہمی عمل و اثر کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کر کے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔"

۳۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

علامہ اقبال نے سنہ ۱۹۱۰ء کے آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں انگریزی زبان میں یہ لیکچر دیا تھا۔ مضمون کا اندازہ خود نام سے ہو سکتا ہے۔ اسلام پر تمجلسی و معاشی نقطۂ نظر سے بحث کی تھی جس سے حضرت علامہ کے وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ اگلے سال حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب نے اس لیکچر کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اور مئی سنہ ۱۹۱۱ء میں برکت علی ہال لاہور میں یہ ترجمہ ایک عام جلسے میں سنایا گیا۔ یہ جلسہ محض اسی لکچر کو سُننے کے لئے منعقد کیا گیا

تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے خود ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا۔ علامہ اقبال بھی جلسہ میں شریک تھے۔ بعد میں یہ ترجمہ مذکورہ بالا نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۴۔ اسرارِ خودی

فلسفۂ خودی پر فارسی میں اقبال کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کا کچھ حصّہ علامہ نے ۱۹۱۴ء میں لاہور میں ایک جلسہ میں سنایا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو سر سیّد علی امام مرحوم کے نامِ نامی سے معنون کیا ہے۔ دیباچہ علامہ نے خود لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیّلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی یا انا یا "مَیں" جو اپنے ردِ عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیّل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں: "مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت

زبردست پیغامِ عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔ مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے، اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی۔ اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابنِ عربی اندلسی رح نے قرآن شریف کی تفسیر کی، جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فن اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی رح اور فخرالدین عراقی رح ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے، اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔"

آخر میں فرماتے ہیں "میں نے اس دقیق مسئلہ کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض "احساسِ نفس یا تعین ذات" ہے۔ مرکب لفظ بیخودی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "

اس تصنیف میں علامہ نے مختلف طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ تمام کائنات خودی کی تابع فرمان ہے۔ جب خودی کے ساتھ عشق کا امتزاج ہوتا ہے، تو خودی تمام عالم و ماورائے عالم پر چھا جاتی ہے۔ خودشکنی اقبال کے نزدیک گناہِ عظیم ہے، اور خودگری و خودشناسی مقصدِ حیات۔ آخر میں علامہ نے

عرفان خودی کی راہ بتائی ہے اور ان مدارج سے آگاہ کیا ہے جن سے گزر کر خودی تکمیل کی معراج پا سکتی ہے، اور عارفِ خودی کو خلیفۃ اللہ فی الارض کا اہل بناتی ہے۔"

۵۔ رموزِ بے خودی

یہ دراصل اسرارِ خودی کا دوسرا حصّہ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کو اقبالؔ نے ملّتِ اسلامیہ کے حضور میں پیش کیا ہے۔ خود ہی ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں: "جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت، دفعِ مضرّت، تعیینِ عمل و ذوقِ حقائقِ عالیہ، احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملّیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں۔ تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوّتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملّیہ کے لئے بمنزلہ قوّتِ حافظہ کے ہے، جو اس کے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کر کے "قومی انا" کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نقطہ کو مدِّنظر رکھ کر میں نے ملّتِ اسلامیہ کی ہئیتِ ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل

ہو سکتا ہے۔"

اس مثنوی میں اقبال نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام کا بنایا ہوا آئینِ حیاتِ ملّی کے لئے بہترین ضابطہ ہے اور مختلف اسلامی اصولوں پر تبصرہ کر کے اپنے پیش کردہ نظریہ کو قوت بخشی ہے۔ اقبال نے بتایا ہے کہ افراد پر لازم ہے کہ وہ ایک خاص حد تک انا کی انفرادی حیثیت کو قائم و محفوظ رکھیں اور اس کے بعد ملّت کے فلاح و بہبود پر اپنی انفرادیت کو قربان کر دیں۔

یہ دونوں مثنویاں بظاہر مسلمانوں کے لئے ہیں لیکن درحقیقت ان کا مخاطب تمام عالم ہے۔ ان کے ذریعہ اقبال نے زمانہ حاضرہ کے ان غلط نظریوں کا ابطال کیا ہے، جو افراد اور ملّت کی بابت قائم کئے گئے تھے، اور ان کی حفاظت بقا تسلسل اور ترقی کے لئے صحیح رہنمائی کی ہے۔

ان دونوں مثنویوں کے بعد ایک بات رہ جاتی ہے جیسا کہ علامہ خود فرماتے ہیں "البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہیئت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آچکا ہے۔ مگر مفصل جواب کے لئے ناظرین کو انتظار کرنا چاہئے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔"

چنانچہ بعد کی تصنیفات میں اسی سوال کا جواب نہایت وضاحت سے دیا گیا ہے

جناب منشی سراج الدین صاحب کے نام کے خط مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کا

یہ اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ تحریر فرماتے ہیں: "یہ مثنوی (اسرارِ خودی) دو سال کے عرصے میں لکھی گئی۔ مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصّہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصّہ اِس حصّہ سے زیادہ لطیف ہوگا۔ کم از کم مطالب کے اعتبار سے، گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض وغایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں، اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے مُنہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوّف پر ایک حملہ تصوّر کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ اِنشاءاللہ دوسرے حصّے میں دکھاؤں گا کہ تصوّف کیا ہے اور کہاں سے آیا۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوّف حامی ہے۔"[1]

۲۔ بانگِ درا

اس میں ابتدائی تین دوروں کا اُردو کلام ہے ۱۹۲۴ء میں شائع

ہوئی۔ اقبال نے بعض ابتدائی نظموں کو جو مخزن وغیرہ میں شائع ہوئی تھیں، یا انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں پڑھی گئی تھیں ۔ اس مجموعہ سے خارج کر دیا ہے۔

تصویرِ درد اور فریادِ اُمّت جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی تھیں، ان کے بھی صرف بعض اجزاء شامل ہیں۔ باقی اجزاء کا شمول کسی نہ کسی سبب کی بنا پر مناسب نہیں سمجھا گیا۔ نالۂ یتیم، شکوہ، شمع و شاعر، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام جو کتابی صورت میں چھپ کر قبولِ عام کا طغرائے امتیاز پا چکی تھیں، اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ہر دور کی غزلیات بھی ہیں۔ لیکن شروع زمانہ کی بیشتر غزلوں کو شمولیت کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ آخر میں ظریفانہ کلام بھی ہے جو خواجہ حسن نظامی صاحب کی زبان میں اکبرِ اقبال کا کلام کہا جائے تو زیبا ہے۔ جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے بانگِ درا پر دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

اس مجموعہ میں مشاہدات، تأثرات و کیفیات ہیں جو شاعرِ اعظم پر مطالعہ فطرت اور مشاہدۂ قدرت سے مترتب ہوئے۔ حسن و عشق کی تفسیر آرٹ کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے، اور صوفیانہ رجحانات کی غمازی کرتی ہے۔ ہم اقبال کو اس مجموعہ میں وطنی شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھ سکتے ہیں، اور اسلامی شاعر کے اعتبار سے بھی۔ یہ کتاب آثارِ حیات سے لبریز ہے۔ حسن و عشق، تصوف، فطرت نگاری، طعن و طنز، تعلیمِ اخلاق اور تبلیغِ مقصدِ زندگی سبھی کچھ اس میں موجود ہے۔

۷۔ پیامِ مشرق

۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس فارسی تصنیف کا دیباچہ علامہ نے

خود لکھا ہے اور اسے اعلیحضرت امیر امان اللہ خاں کی جناب میں پیش کیا ہے۔ کتاب کی ترتیب یوں ہے کہ اوّل لالۂ طور کے نام سے رباعیات ہیں۔ پھر افکار کے عنوان سے مختلف نظمیں ہیں۔ اس کے بعد مے باقی کے ماتحت غزلیات درج ہیں۔ پھر نقش فرنگ کے ذیل میں بعض نظمیں ہیں جن میں مغرب اور مسائل مغرب پر تبصرہ کیا ہے۔ آخر میں خردہ کی سرخی کے ماتحت کچھ متفرق اشعار و قطعات ہیں۔

اس تصنیف کی بابت علامہ خود دیباچہ میں فرماتے ہیں: "پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک جرمن "حکیم حیات" گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے جس کی نسبت جرمنی اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے:۔

"یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے ...... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے"۔

اس کے بعد علامہ نے اس تحریک پر مختصر نظر ڈالی ہے جس کو المانوی ادبیات کی تاریخ میں تحریک مشرقی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں "پیام مشرق" کے متعلق جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے ..... مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں

کر سکتی۔ جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں منتقل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور مَیں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

گوئٹے نے اپنے دیوان میں مغرب میں روحانیت کے فقدان کا ماتم کیا تھا اور مشرق سے اس پیغام کا متوقع تھا، اقبال کی زبان سے سو سال بعد وہ پیغام مغربی ممالک کے نام ادا ہوا۔ چنانچہ پیامِ مشرق میں اخلاق مذہب اور معاشرت کے وہ اسباق ملتے ہیں جو افراد و ملت کی زندگی کی تشکیل کے ذمہ دار بن سکتے ہیں۔ یورپ کی تصویر ان تخیلات کے ماتحت پیش کی گئی ہے جو مشرق نے مغرب کی بابت قائم کئے ہیں۔ چنانچہ مغربی عقائد و نظریات کے نقائص دکھا کر اقبال نے بتایا ہے کہ یورپ کے لئے صحیح شاہراہ کیا ہے۔ علامہ نے اپنے اس پیغام میں بتایا ہے کہ مغرب کی مادیت جوش اور زندگی سے معرا ہے۔ اور احساس، جوش، حرکت، عمل اور عشق کے جذبات پیدا کرنے پر زور دیا ہے، اور یورپ کو جتا دیا ہے کہ بغیر روحانیت کا درس حاصل کئے زندگی اعلیٰ مدارج پر فائز نہیں ہو سکتی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام کے خط مؤرخہ ۱۷ اپریل ۱۹۲۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نظمیں ترتیب نہ پا سکنے کے باعث پیام میں شامل ہونے سے رہ گئیں، نیز یہ کہ پیام کی اشاعت میں اقبال نے اپنے والدِ مرحوم کے حکم کی تعمیل کے باعث عجلت کی تھی۔ لکھتے ہیں: "چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں۔

لیکن افسوس ہے انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکرِ روزی قاتلِ روح ہے۔ یکسوئی نصیب نہیں۔
ان سب باتوں کے علاوہ والدِ مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔[1]

۸۔ زبورِ عجم

۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس مجموعہ میں اوّل زبورِ عجم ہے جس کے دو حصّے ہیں جو مختلف غزلیات و قطعات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد دو مثنویاں ہیں۔ اوّل گلشنِ رازِ جدید جو حضرت سیّد محمود شبستری کی مثنوی گلشنِ راز کے جواب میں ہے۔ اس مثنوی میں محمود شبستری کی طرح نو سوال قائم کر کے ان کا جواب دیا ہے اور ماورائیات کے بعض اہم مسائل کو علومِ جدیدہ کی روشنی میں حل کر کے عملی دنیا پر اس کا اثر اور تعلق ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد مثنوی بندگی نامہ ہے جو غلامی و محکومیت کے خلاف ایک جہاد ہے۔ اس مثنوی میں اوّل بندگی سے بحث کی ہے۔ پھر غلاموں کے فنونِ لطیفہ موسیقی اور مصوری پر تبصرہ کیا ہے۔ بعد ازاں غلاموں کے مذہب پر نظر ڈال کر عشق کا مذہبِ غلاماں سے موازنہ کیا ہے، اور آخر میں مردانِ آزاد کے فنِ تعمیر سے روشناس کرا کے مثنوی کو ختم کر دیا ہے۔

زبورِ عجم کی غزلیات وغیرہ کے درس کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس میں علّامہ نے خدا سے خطاب کیا ہے۔ دوسرا وہ جس میں تمام عالم کو اور بالخصوص مشرق کو مخاطب بنا کر عام بیداری کا پیغام پہنچایا ہے۔ مطالعہ عہدِ ماضی کی تعلیم دی ہے۔ اور حرکت، بیداری، ذوقِ عمل، محبّت اور زندگی پیدا کرنے کا درس دیا ہے۔ تاکہ عہدِ رفتہ کی شان و شوکت، تجمّل و حشمت کو دوبارہ حاصل کیا جا سکے۔

[1] مکاتیبِ اقبال

اور مشرق ایک بار پھر مادی اور روحانی دنیا پر اپنی حکومت کا پرچم لہرا سکے ۔

۹۔ جاوید نامہ

۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دُنیائے شعر کی معراج ہے جس تک ہر شاعر اعظم کی رسائی نہیں ہو سکتی، اور جو شعر کے اس آخری پیغمبر کے لئے ہی مخصوص تھی ۔

اس کتاب میں زندہ رود جو اقبال نے اپنا نام رکھا ہے، پیر رومی کی قیادت میں افلاک کی سیر کرتا ہے۔ فلک قمر پر ایک ہندوستانی درویش سے ملاقات ہوتی ہے۔ پھر وادی طواسین میں پہنچتے ہیں۔ طاسین گوتم، طاسین زرتشت، طاسین مسیح اور طاسین محمد صلعم سے گزر کر فلک عطارد آتا ہے، جہاں علامہ جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا جیسی برگزیدہ آفاق ہستیوں سے ملاقات اور اہم اسلامی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ فلک زہرہ پر قدیم دیوتا نظر آتے ہیں۔ دریائے زہرہ میں فرعون اور لارڈ کچنر کی روحیں ہیں۔ پھر مہدی سوڈانی روح عرب کو پیغام بیداری سناتا ہوا ملتا ہے۔ فلک مریخ پر ایک مریخی حکیم اور ایک مغربی مدعیہ نبوت ملتے ہیں۔ فلک مشتری میں منصور حلاج، غالب اور قرۃ العین سے باتیں ہوتی ہیں۔ پھر شیطان نظر آتا ہے جو کسی مردِ حق کی آمد کی آرزو کرتا ہے۔ فلک زحل پر خبیث روحیں ہیں جن کو دوزخ بھی قبول نہیں کرتا۔ انہی میں جعفر بنگالی اور صادق دکنی جیسے غدار اور قوم فروش شامل ہیں۔

بعد ازیں ماورائے افلاک پر رسائی ہوتی ہے۔ یہاں نیٹشے ملتا ہے

آگے بڑھ کر شرف النسا کا محل ہے، پھر سید علی ہمدانی، غنی کشمیری اور بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے۔ پھر نادر شاہ، ابدالی اور سلطان شہید وغیرہ سے گفتگو ہوتی ہے۔ سب کے بعد قربِ حضور اور تجلیات سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ندا آتی ہے اور معراج ختم ہو جاتی ہے۔

آخر میں "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے علامہ اپنے بیٹے جاوید کو اور درحقیقت اس پیرایہ میں تمام نوجوانوں کو درس اور پیغام دیتے ہیں۔

اس معراج نامہ کی تعلیمات کوئی جدید شئے نہیں۔ وہی اقبال کی تعلیم ہے جو دوسری کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ یہاں ایک جدید اسلوب سے اور دنیا کے دوسرے مفکرین اور رہنماؤں کی زبان سے ادا ہوئی ہے اور بس۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ تمام درس وہی ہے جو قرآن اور پیغمبرِ عرب صلعم نے دنیا کی ہدایت کے لئے پیش کیا تھا۔ ہاں طرزِ بیان جدید ہے اور "نژادِ نو" کے رجحانات و ضروریات کے مطابق ان کی رہنمائی کی گئی ہے۔

۱۰۔ اسلام کا مذہبی تخیل

یہ کتاب مجموعہ ہے اُن چھ خطبات کا جو علامہ نے مدراس، حیدر آباد اور میسور میں ارشاد فرمائے تھے۔ اس میں حسبِ ذیل چھ موضوع ہیں (۱) علم اور مذہبی الہامات (۲) مذہبی الہامات کا فلسفیانہ معیار۔ (۳) ذاتِ واجب کا تصور اور عبادات کی حقیقت (۴) انانیتِ انسانی اور مسئلہ جبر و اختیار (۵) تمدنِ اسلامی کی روح اور (۶) نظامِ اسلام میں حرکت کا اصول (مسئلہ اجتہاد)۔

مسائلِ مذکورہ بالا پر علامہ نے اسلام اور فلسفہ کے نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اِس لئے اس کتاب کو اسلامی علمِ کلام کی جدید تالیف کہنا نامناسب نہیں۔ الٰہیات و طبیعیات کے دقیق مسائل پر متکلمین نے جس قدر اضافے کئے ہیں ان کو علامہ نے انگریزی خواں طبقہ کی رہنمائی کے لئے خوش اسلوبی سے اِس کتاب میں درج کیا ہے اور جن انقلابات کا تذکرہ علامہ نے فلسفۂ عجم کے ترجمہ کی اجازت دیتے ہوئے میر حسن الدین صاحب کے خط میں کیا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان اجتہادی نظریوں پر آگاہی ہوتی ہے۔ اور اس طرح اِس فلسفیٔ اعظم کی مجتہدانہ شان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے علمِ کلام کے شائقین کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

علامہ اقبال نے میر غلام بھیک صاحب نیرنگ کو ان خطبات کی بابت ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو لکھا تھا: " باقی رہا لیکچروں کے ترجمہ کا کام، سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور ازبس مشکل ضرور ہے۔ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر نہیں اور اس بات کے خواہشمند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے، اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں مَیں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مگر مَیں خیال کرتا ہوں کہ اُردو خواں دُنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے۔ کیونکہ بہت سی باتوں کا علم مَیں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے والے یا سُننے والے کو پہلے سے حاصل ہے، اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔[1]

---

[1] مکاتیبِ اقبال

۱۱- بالِ جبریل

۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ بالِ جبریل میں اوّل غزلیات ہیں، پھر رباعیات وقطعات، اور آخر میں مختلف عنوانات کے ماتحت نظمیں درج کی گئی ہیں۔

بالِ جبریل، بانگِ درا کے عرصہ دراز کے بعد لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی۔ تو علم ہوا کہ علامہ نے اُردو شعر گوئی سے کُلیتہً اجتناب نہیں کیا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہی سمجھا گیا تھا کہ آپ نے اُردو کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ بانگِ درا میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ ارتقائے تخیل کے ابتدائی دو مدارج سے بانگِ درا کا زیادہ حصہ بھرا ہوا ہے۔ اس لئے تیسرے درجہ کو عام ناظرین اس غائر نظر سے نہیں دیکھتے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کے برعکس بالِ جبریل ارتقائے خیال کی چوتھی منزل کو جو بلند ترین مرتبہ ہے پیش کرتی ہے۔ بعض کم علم، کوتاہ نظر، تنگ فکر اور کور ذوق حضرات کی ظاہر بین نگاہیں اس کے دقائق وحقائق تک نہ پہنچیں تو اُنہوں نے اس کو بانگِ درا سے پست تر تصنیف قرار دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ادبِ اُردو میں اس تصنیف نے اِن جواہر پاروں کا اضافہ کیا ہے جس سے دامنِ اُردو اب تک تہی تھا۔ تخییل وفکر کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے اُردو کی کوئی تصنیف اس کے پاسنگ بھی نظر نہیں آتی۔ ان الہامات شعری کو اُردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو فارسی میں مثنوی شریف یا گلستان کو نصیب ہے۔ جن حضرات کو فارسی سے بہرہ نہیں اور اس باعث وہ اقبال کے فارسی مصنّفات کے مطالعہ سے بصیرت افروزی حاصل نہیں کر سکتے، ان پر واجب ہے کہ اس کا وِرد کر کے دعوتِ فکر ونظر وعمل سے

بہرہ مند ہوں اور نجات کے صحیح راستہ کو معلوم کر کے شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوں۔
بالِ جبریل میں کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وہ مطلع ہے جو سرورق کی زینت ہے

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

تمام کتاب تعلیمات سے بھری ہوئی ہے۔ راہنماؤں کی کجراہ روی اخلاص ویقین کے فقدان اور طلسم مغرب کے فریب میں گرفتاری پر اقبال نے سخت سرزنش کی ہے اور عرفانِ خودی اور "مردِ مومن" بننے کا پیغام پہنچایا ہے اور دعوت دی ہے کہ مرکز وحدت پر پھر سے اُمت جمع ہو جائے، اور حریت، عزم ہمت اور عمل پیدا کر کے نیابتِ خداوندی کی اہل اور مستحق قرار پائے۔

۱۲۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں اوّل اقبال پیرِ رومیؒ کی زبان سے یہ خوشخبری سُناتے ہیں، کہ "خاور از خوابِ گراں بیدار شد" پھر پیرِ روم اقبال کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم معنی دین و سیاست پھر اہلِ مشرق کو سُنا دو۔ چنانچہ اس تمہید کے بعد اقبال اس پیغام کو بتفصیل اقوامِ شرق کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اوّل حکمتِ کلیمی اور حکمتِ فرعونی کے خصائص بتا کر ان کا موازنہ کرتے ہیں۔ پھر توحید کا درس دیتے اور نفی و اثبات کو "ساز و برگِ اُمتاں" ثابت کرتے ہیں۔ پھر فقر اور مردِ حُر کی ایمان افروز اور رُوح پرور تفسیر و تفصیل بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے بحث کی ہے۔ پھر افتراقِ ہندیاں

پر ماتم کرکے اتحاد کا سبق پڑھایا ہے۔ سیاسیاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد اُمتِ عربیہ سے خطاب کرکے ان کو اُن کا عہدِ ماضی یاد دلایا ہے۔ پھر تمام اقوامِ مشرق کو خطاب کرکے دریافت کرتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں اور سیاستِ افرنگ کا طلسم توڑ کر اقوامِ ایشیا کو عام بیداری کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ آخر میں سیّد علیہ الرحمۃ کی ہدایت کے مطابق حضور رسالت مآب صلعم میں فریاد کرتے ہیں۔

علامہ اقبال پروفیسر الیاس برنی صاحب کو تحریر کرتے ہیں "۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سرسیّد علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں۔ تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآب صلعم کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اُسی وقت کھُل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل ہو گئی ہے میری زبان پر جاری ہو گئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہو گی۔ ۴ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ (RING) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔"[1]

اس کے بعد دوسری مثنوی مسافر ہے جو مذکورہ بالا مثنوی سے قبل کی تصنیف ہے اور جو افغانستان کی سیاحت پر لکھی گئی تھی۔ تمہید میں نادر شاہ شہید کی حمایتِ دین کی توصیف کی ہے۔ پھر اقوامِ سرحد کو خطاب کرکے ان کو نصیحت کی ہے کہ "رمزِ دینِ مصطفٰے" کو جانیں اور اپنے بدن میں "تعمیرِ خودی" کریں۔ افغانستان پہنچ

کر شاعر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور پھر بار بر خلد آشیانی حکیم سنائی اور سلطان محمود غزنوی کے مزارات کی زیارت سے فائز ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس کو پیغام ملتا ہے جو وہ تمام عالم تک پہنچا رہا ہے۔ قندھار میں خرقہ مبارک کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا ہے جس سے اقبال کے حساس دل میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا دل دیوانگی کے عالم میں بھٹکنا چاہتا ہے۔ یہ اس کو ضبط کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے "مستی و وارفتگی کارِ دل است"۔ پھر احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ وہاں تلقین ہوتی ہے کہ "سر ملک و دیں" اعلیحضرت ظاہر شاہ کو بتادو۔ چنانچہ آخر کتاب میں ظاہر شاہ کو رموزِ مملکت و اسرارِ دین سکھاتے ہیں اور مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ مثنوی پہلے چھوٹے سائز اور اعلیٰ کاغذ پر حسین کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ مگر یہ اشاعت محدود تھی۔ بعد میں اس کو "پس چہ باید کرد" کے ساتھ ملا کر شائع کیا گیا۔

۱۳۔ ضربِ کلیم

۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ ضربِ کلیم کو اقبال نے اعلیٰحضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں پیش کیا۔ تمہید کے بعد تمام کتاب کی غزلوں اور نظموں کو چھ عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) اسلام اور مسلمان، (۲) تعلیم و تربیت۔ (۳) عورت۔ (۴) ادبیات، فنونِ لطیفہ (۵) سیاسیاتِ مشرق و مغرب۔ (۶) محراب گل افغان کے افکار۔

یہ کتاب درحقیقت ضمیمہ ہے بالِ جبریل کی تعلیمات کا۔ عنواناتِ بالا سے مندرجات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سیاسی، مذہبی، ملّی اور معاشرتی مسائل کی بابت علامہ کے جواہرِ افکار قولِ فیصل کا حکم رکھتے ہیں۔ پیچیدہ مباحث پر جس خوش اسلوبی کے ساتھ اقبالؔ نے فتوے لگائے ہیں، وہ اندازِ بیان انہی کے لئے مخصوص ہے۔ محراب گل افغانؔ[1] کے افکار میں قومِ افغان کے لئے جو درس و پیغام پوشیدہ ہے، وہ ان کی نجات کا واحد راستہ ہے۔ بلکہ تمام اقوام و ملل پر یکساں حاوی و منطبق ہوتا ہے۔ بالِ جبریل کے ساتھ اس کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے کہ یہ بھی اپنے حقائق و نکات کے اعتبار سے خاص اہمیت و مرتبہ رکھتی ہے۔

سر راس مسعود کو حضرت علاّمہ ضربِ کلیم کی بابت لکھتے ہیں: "باقی رہی کتاب سو یہ ایک TOPICAL چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ ایک اعلانِ جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام۔ اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے کہ "میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ"۔ نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے۔ اس کتاب کا Realistic ہونا ضروری ہے، اور نوائے چنگ کی تلافی Epigrammatic style سے کی گئی ہے"[2]

۱۴۔ ارمغانِ حجاز

حضرت علاّمہ کے مرض الموت میں ترتیب دی جا چکی تھی۔ مگر رحلت کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء کے آخر میں اشاعت کی نوبت آئی۔ کتاب کے دو حصّے ہیں۔ حصّہ

[1] محراب گل ایک فرضی نام ہے۔ [2] مکاتیب اقبال

اوّل میں فارسی کلام ہے اور حصّہ دوم میں اُردو۔ حصّہ اوّل کے کئی ذیلی ابواب ہیں (۱) حضورِ حق۔ (۲) حضورِ رسالتؐ۔ (۳) حضورِ ملّت (۴) حضورِ عالمِ انسانی۔ (۵) بہ یارانِ طریق۔ حضورِ ملّت اور حضورِ عالمِ انسانی کے ذیل میں تعلیمات کے لحاظ سے متعدد تقسیمیں ہیں۔ سب فارسی کلام رباعیات پر مشتمل ہے۔

اُردو نظمیں بلحاظِ عنوانات صرف تیرہ ہیں۔ مگر معانی و مباحث کے جو گنج ہائے گرانمایہ ان میں پوشیدہ ہیں، ان کے اعتبار سے تعداد کی قلّت کا لحاظ جاتا رہتا ہے۔ سیاست و معاشرت کے رازہائے سربستہ کا حل اور مذہب و ملّت کے مسائل کی بابت اٹل فیصلے ان نظموں کے ذریعے ہماری بصیرت افروزی اور رہنمائی کرتے ہیں۔

اقبال کی مقبولیّت

تراجم:۔

۱۔ ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے اسرارِ خودی کو انگریزی لباس پہنایا جس کا نام ہے "سیکریٹس آف دی سیلف"۔

۲۔ جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانسی مائنکے نے جو وہاں کا ایک مشہور فلسفی شاعر ہے، پیامِ مشرق کے ایک خاص حصّہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ پھر اسے چمڑے کے کاغذ پر جس پہ عموماً انجیل وغیرہ مقدّس کتابیں لکھی جاتی ہیں، اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر اور مشرقی انداز میں نقش و نگار کر کے علامہ اقبالؔ کی خدمت میں بطور ہدیہ ارسال کیا۔

۳۔ اقبال کے ڈاکٹری کے مقالہ کا جرمن زبان میں ترجمہ شایع ہو کر مقبول ہوا[1]

۴۔ جرمنی میں ایک بیاض ہندوستانی علم و ادب کے متعلق شائع ہوئی ہے جس میں مختلف شعرا کے کلام کا ترجمہ جمع کیا ہے۔ ٹیگور کی بھی ایک نظم ہے، اور علامہ اقبال کی پانچ نظمیں ہیں +

۵۔ مصر کے مشہور سیاح احمد رفعت نے علامہ کی بہت سی نظموں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ تراجم مصر کے مشہور جریدہ الاہرام میں شائع ہوئے۔

۶۔ حسین دانش ترکی فاضل نے علامہ کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ترکی میں کیا۔

۷۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ مترجمہ مولانا ظفر علی خاں صاحب۔

۸۔ فلسفہ عجم مترجمہ میر حسن الدین صاحب۔

۹۔ شکوہ وجواب شکوہ کا انگریزی ترجمہ از الطاف حسین صاحب۔

۱۰۔ اقبال کا فلسفہ سوسائٹی۔ رموزِ بیخودی کے نظریات کی انگریزی میں شرح از بشیر احمد ڈار صاحب۔

۱۱۔ شرح اسرارِ خودی از پروفیسر محمد یوسف سلیم چشتی صاحب۔

۱۲۔ مثنوی اسرارِ خودی کا اردو نظم میں ترجمہ از سید عبدالرشید صاحب فاضل، ایم اے۔

۱۳۔ پوئمس فرام اقبال کے نام سے اردو نظموں اور غزلوں کا ترجمہ از وی جی کیرنن

۱۴۔ پرشین سالس (از بورِ عجم کا ترجمہ) از پروفیسر آرتھر آربری

---

[1] اقبال از عطیہ فیضی صاحبہ

تصانیف :-

حضرت علامہ سے متعلق جو تصانیف شائع ہوئی ہیں، ان کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

اُردو :- (۱) اقبال از منشی احمد الدین صاحب

(۲) مقالاتِ یومِ اقبال (قومی کتب خانہ لاہور)

(۳) اقبال اور اس کا پیغام از ڈاکٹر تصدق حسین خالد صاحب

(۴) حیاتِ اقبال (تاج بک ڈپو لاہور)

(۵) شارحِ اقبال از ابوظفر عبد الواحد صاحب

(۶) اقبال کا مطالعہ از سید نذیر نیازی صاحب

(۷) اقبال کی شاعری از عبد المالک آروی صاحب

(۸) اقبال نامہ از چراغ حسن حسرت صاحب

(۹) روحِ اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

(۱۰) اقبال (انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی)

(۱۱) شادِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور قادری

(۱۲) اقبال کے خطوط جناح کے نام

(۱۳) مکاتیبِ اقبال مرتبہ شیخ عطاء اللہ صاحب

(۱۴) اقبال اور آرٹ از لطیف فاروقی صاحب

(۱۵) مقامِ اقبال از اشفاق حسین صاحب۔

(۱۶) اقبال کی خودی از بشیر مخفی صاحب۔

(۱۷) اقبال، اس کی شاعری اور پیغام از شیخ اکبر علی صاحب
(۱۸) پیامِ اقبال از شیخ عبدالرحمان طارق صاحب
(۱۹) جہانِ اقبال " " " " "
(۲۰) اقبال کے چند جواہر ریزے از پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب
(۲۱) فکرِ اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید صاحب
(۲۲) آثارِ اقبال " " " " "
(۲۳) حکمتِ اقبال " " " " "
(۲۴) رموزِ اقبال از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
(۲۵) تصوّراتِ اقبال از شاغل فخری صاحب
(۲۶) جوہرِ اقبال (مکتبۂ جامعہ مِلّیہ دہلی)
(۲۷) اقبال کا فلسفہ حیات و موت از حسن الاعظمی صاحب
(۲۸) اقبال امام ادب از رئیس احمد جعفری صاحب
(۲۹) اقبال از اختر اورینوی صاحب
(۳۰) اقبال از مجنوں گورکھپوری صاحب
(۳۱) قائدِ اقبال از گوشہ نشین
(۳۲) بزمِ اقبال مرتبہ محمد طاہر فاروقی
(۳۳) معارفِ اقبال از شیخ عبدالرحمان طارق صاحب
(۳۴) اقبال کامل از مولوی عبدالسلام ندوی صاحب
(۳۵) ذکرِ اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید صاحب

(۳۶) اقبال کا تصور زمان و مکان از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب

(۳۷) اقبال از محمد حسین صاحب

(۳۸) اقبال اور وطنیت (عبدالحق اکیڈمی)

(۳۹) اقبال پر ایک نظر

(۴۰) ملفوظاتِ اقبال

(۴۱) عرفانِ اقبال (یا افاداتِ نیازی)

(۴۲) مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج صاحب

(۴۳) حرفِ اقبال (المنار اکاڈمی لاہور)

(۴۴) خطباتِ اقبال مرتبہ رضیہ فرحت بانو صاحبہ

(۴۵) تعلیماتِ اقبال مرتبہ پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی

(۴۶) تلمیحاتِ اقبال از فضل الہی عارف صاحب

(۴۷) یادگارِ اقبال مرتبہ سید طفیل احمد صاحب بدر

(۴۸) یادِ اقبال

(۴۹) نذرِ اقبال (سب رس، حیدرآباد دکن)

۲۔ انگریزی (۱) اقبال۔ ہز پوئٹری اینڈ میسیج از شیخ اکبر علی صاحب

(۲) آسپکٹس آف اقبال (قومی کتب خانہ لاہور)

(۳) پوئٹ آف دی ایسٹ از عبداللہ انور بیگ صاحب

(۴) اقبالس ایجوکیشنل فلاسفی از خواجہ غلام السیدین صاحب

(۵) لیٹرس آف اقبال ٹو جناح

(۶) اقبال مرتبہ عطیہ بیگم فیضی صاحبہ

(۷) اقبال ۔ ہز آرٹ اینڈ تھاٹ از عبدالواحد صاحب

(۸) اقبال ایز اے تھنکر (شیخ محمد اشرف لاہور)

(۹) میٹا فزکس آف اقبال از ڈاکٹر عشرت حسین صاحب

(۱۰) اے اسٹڈی اِن اقبالس فلاسفی از بشیر احمد ڈار صاحب

(۱۱) اسپیچز اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال

خاص نمبر

اُردو کے اکثر رسائل و اخبارات نے علامہ کی یادگار میں خاص نمبر شائع کئے تھے، اور اب بھی ہر سال شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل جو مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ نیرنگِ خیال لاہور کا اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ علی گڑھ میگزین کا اقبال نمبر اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

۳۔ شیرازہ لاہور نے مئی ۱۹۳۸ء میں اقبال نمبر شائع کیا جس کو بعد میں نظر ثانی کے بعد "اقبال نامہ" کے نام سے کتابی صورت دی گئی۔

۴۔ رسالہ اُردو نے اقبال نمبر شائع کیا جو بعد میں "اقبال" کے نام سے کتابی شکل میں طبع ہوا۔

۵۔ جوہر دہلی نے اپنا خاص نمبر جوہرِ اقبال کے نام سے جون ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔

۶۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن کے رسالہ سب رس نے جون ۱۹۳۸ء

میں اقبال نمبر شائع کیا۔

کلیات

کلیاتِ اقبال کے نام سے ایک کتاب جس میں اُس وقت تک کی اقبال کی نظمیں وغیرہ جمع کی گئی تھیں، بانگِ درا کی اشاعت سے بہت پہلے مُدت ہوئی حضرت علامہ عبداللہ العمادی مرحوم کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی، میں نے اس کتاب کو تصنیفات کے ذیل میں اِس لئے نہیں لکھا کہ بانگِ درا خود علامہ کی نظرِ ثانی کے بعد شائع ہوئی تھی اور اس کی ناسخ ہے +

مقالات

اُردو میں علامہ اقبال کی بابت عرصہ سے مضامین شائع ہو رہے ہیں، جن میں آپ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا استقصا محال ہے۔ غیر ممالک میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اِس کا احتوا بھی دُشوار ہے۔ پھر بھی ان میں سے بعض مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر توفیق بے رُکن وفد ہلالِ احمر کے بیان کے مطابق حسین دانش نے ترکی میں علامہ کے نظریات پر وضاحت کے ساتھ لکھا۔

۲۔ آغا ہادی حسن صاحب وزیرِ تجارت نے جو پہلے انگلستان میں افغانستان کے سفیر تھے۔ امانِ افغان (کابل) میں پیامِ مشرق پر تبصرہ کے طور پر مضامین کا ایک سلسلہ تحریر کیا جو کئی نمبروں میں چھپا۔

۳۔ ڈاکٹر نکلسن نے پیامِ مشرق پر ایک مبسوط تبصرہ رسالہ اسلامیکا (جرمنی) میں تحریر کیا۔

۴۔ پروفیسر براؤن مشہور و مستند مستشرق نے اسرارِ خودی کے ترجمہ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ ۱۹۲۱ء میں تبصرہ لکھا۔

۵۔ ڈاکٹر فشر پروفیسر لیپزگ یونیورسٹی، ایڈیٹر اسلامیکا نے بھی پیامِ مشرق پر جرمن زبان میں تبصرہ لکھا اور اقبال کا گوئٹے سے موازنہ کیا۔

۶۔ اٹلی کے مشہور فاضل ڈاکٹر سکاریہ نے اٹلی کے ایک ادبی مجلہ میں اقبال سے متعلق ایک محققانہ مضمون لکھا۔

۷۔ مسٹر فارسٹر نے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ پر تبصرہ لکھا۔ اور اقبال کے کلام پر ایک مصلح قوم کی تعلیمات کی حیثیت سے نظر ڈالی۔

۸۔ مسٹر ایلسن سابق مدیر مسلم آؤٹ لک (لاہور) نے ٹیگور اور اقبال کا مقابلہ کر کے اقبال کو بہمہ وجوہ ٹیگور سے بہتر ثابت کیا ہے۔

۹۔ مسٹر مینن نے ۱۹۲۵ء کے انڈین ریویو میں ایک مضمون پیامِ اقبال کے عنوان سے شائع کیا۔ وہ اسرارِ خودی کو اخوتِ اسلامی کے موضوع پر ایک الہامی کتاب قرار دیتا ہے۔

۱۰۔ علامہ کے سفرِ افغانستان کے موقع پر افغانی جرائد نے مخصوص مقالات شائع کئے۔

۱۱۔ حضرت علامہ کی رحلت پر ایران اور افغانستان کے مؤقر علمی رسائل میں متعدد بسیط مقالات شائع ہوئے، اور ہر دو ممالک میں ہر سال اب بھی بعض اہم مضامین طبع ہوتے رہتے ہیں۔

تبصرہ

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گُل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

اقبالؒ

اقبال کا پیغام

از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد من ناید چو من مردِ فقیر (اقبالؔ)

انسانی زندگی کے تین اہم فرائض ہیں۔ (۱) اپنی ہستی سے آگاہ ہونا (۲) حقوق النّاس کو جاننا (۳) اور اپنے خالق و معبود کو پہچاننا۔ اور اس لئے ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود شناسی کی منزلوں سے آگے بڑھ کر اپنے خالق سے تعلق پیدا کرے اور معاشرت و تمدّن کے اصولوں پر بھی عامل ہو۔ جو اقوام اور افراد عقلِ سلیم سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ ان فرائض کی ادائیگی پر مستعد نظر آتے ہیں۔ مگر انسان میں جہاں ایک طرف صفاتِ ملکوتی کا پرتو نظر آتا ہے۔ وہیں دوسری جانب وہ صفاتِ شیطانی بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کا نفس اور اس کی خواہشات اس کو صراطِ مستقیم سے بھٹکاتی اور اس کو فرائض کی ادائیگی سے غافل بناتی ہیں۔ جب ہوا و ہوس اور نفسِ امارہ اس پر پوری طرح غالب ہو جاتے ہیں تو اس سے ادائے فرض میں کوتاہیاں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ آخر کار وہ جہالت و شیطنت کی تاریکی میں کھو جاتا ہے، اور اس قوم کے افراد انفرادی و اجتماعی حیثیتوں سے خدا سے ناواقف، اخلاق سے بے بہرہ، تمدّن سے ناآشنا، تہذیب سے غافل، معاشرت سے بے فیض، اور خود شناسی

سے دُور نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق کے منشا کو بھول جاتے ہیں، اور دین و دنیا کے فرائض اُن کو یاد نہیں رہتے) جب خلل و فساد حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو غیرتِ الٰہی جوش میں آتی ہے اور اسی قوم میں سے ایک برگزیدہ فرد کو متعین کیا جاتا ہے، تاکہ وہ اُن کی اصلاح کرے۔ یہ فرد انسان ہی ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ کمالاتِ ظاہر و باطن پائے جاتے ہیں جو اس کو اور تمام بنی نوع سے ممتاز اور برتر ثابت کرتے ہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں رسول یا پیغمبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ہر پیغمبر ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا پیغمبر بن کر آتا ہے۔ وہ قوم کے ماضی کا جائزہ لیتا ہے۔ ان کے عروج و زوال اور ترقی و پستی کے اسباب و وجوہ پر نظر ڈالتا ہے، اور حال پر ان کو منطبق کر کے وحی و الہام کے ذریعہ وہ راستہ دکھاتا ہے، جو ملت کے مستقبل کو انفرادی و اجتماعی طور پر روشن اور شاندار بنا دے۔ وہ فرائض سہ گانہ کی اہمیت کو ثابت کر کے قوم کو اس شاہراہ پر ڈال دیتا ہے جس سے ان کو فلاحِ دُنیا و عقبیٰ حاصل ہو جائے۔

پیغمبر عرب صلعم دیگر مرسلین کے خلاف وہ پیغام لے کر اس عالم میں مبعوث کئے گئے جو نسلِ انسانی کے تمام عقدوں کا حل اور ان کی تمام مشکلات کا علاج ہے۔ اس طبیبِ حاذق کے نسخۂ شفا کے بعد کسی اور معالج کے مشورہ کی ضرورت باقی ہی نہ رہی۔ اسی لئے آنحضرت صلعم تمام کائنات کے پیغمبر تھے اور آپ پر رسالتِ الٰہی ختم ہو گئی۔ کہ آپ کے بعد کوئی نبی مُرسل مبعوث نہ ہوا اور نہ ہو گا، اور دینِ الٰہی اور مذہبِ اسلام جس کی ترویج و تبلیغ حضرت آدمؑ کے وقت سے تمام پیغمبر اور اوتار کرتے آئے تھے۔ آپ کے بلاغ مبین کے بعد اس حد

تک کامل و مکمل و اکمل ہو گیا کہ اس میں کسی اصلاح و اضافہ کی گنجائش ہی نہ رہی
دربار خداوندی سے سلسلۂ بعثت تو منقطع ہو گیا۔ لیکن بنی نوع کی
ہدایت کے لئے ایک دُوسرا ذریعہ باقی رہا۔ یعنی مجدّدین کی آمد بند نہیں کی گئی۔ چنانچہ
گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں ہر قرن اور ہر عصر میں مجدّد پیدا ہوتے رہے۔ مجدّد
اور رسُول میں دو فرق ہیں۔ رسُول پر وحی آتی ہے۔ مجدّد پر نہیں آتی۔ رسُول صاحب
شریعت ہوتا ہے۔ مجدّد اسی شریعت کے بھُولے ہوئے اسباق یاد کراتا اور ملّت کو
رسُول کی راہ پر لگاتا ہے۔ ایک مجدّد درحقیقت قولاً و فعلاً نائب رسُول کی حیثیت
رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر عہد میں مصلحین پیدا ہوتے رہے۔ مجدّد کے لئے تو شریعت
اسلامیہ کی رُو سے ضروری ہے کہ وُہ ایک صدی میں ایک ہی بھیجا جائے گا لیکن
مصلح و ریفارمر کے لئے یہ شرط بھی نہیں۔ ایک ہی زمانہ میں چند ریفارمر بھی ایک
ہی مقصد کی نشر و تبلیغ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ میں ایسے مجدّدین و مصلحین
اپنے اپنے اوقات میں پیدا ہوتے اور ملّت مسلمہ کو اُن کے فرائض دین و دُنیا سے
آگاہ کر کے تجدید و احیاء کا کام کرتے رہے ہیں۔

اسلام میں شریعت و طریقت دونوں کی تعلیمات کے مطابق تخلیقِ انسان
کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ مندرجہ بالا فرائض سہ گانہ کو ادا کرے، اور اس طرح
بشریت و عبدیت کا ایک اعلیٰ نمونہ اور "انسان کامل" بننے کی سعی کرے۔ انسان
دُنیا میں "نائب خدا" اور "خلیفۃ اللہ" بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دُنیا اس کے لئے پیدا
کی گئی ہے، وُہ دُنیا کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ اسی لئے اسلام نے جو دینِ فطرت
ہے تکمیلِ انسانی کی تعلیم دی۔ اور مسلمان صوفیہ نے بھی اسی تعلیم کی تبلیغ میں اپنی

اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ تاکہ انسان "عبدیت و بشریت" کی تکمیل کرکے نیابت خداوندی" کا وارث بننے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اگر ایک طرف وہ "خلیفہ زماں" بنے تو دوسری جانب وہ ان مدارجِ عالیہ پر فائز ہو جہاں پہنچتے ہوئے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔

اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب یہ تعلیم نہیں دیتا۔ ویدانت کا فلسفہ بتاتا ہے کہ "جب مادیت برباد ہو جائے گی، تب روح بیدار ہوگی۔" حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو ایک بار کسی نے "اے نیک شخص" کہہ کر خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "مجھے نیک نہ کہو دُنیا میں کوئی نیک نہیں" یہ انجیل کی روایت ہے۔ اور یہی عیسویت کی تعلیم ہے۔ اس عہد کے مفکرین و محققین مادہ سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ وہ اس طلسم ہی میں اُلجھ کر رہ گئے، اور روح اور مقصدِ حیات سے منزلوں دُور جا پڑے۔ مغرب کے فلاسفہ کو ان کے فلسفہ نے اس قدر گمراہ کیا کہ ذاتِ واجب ہی میں ان کو اشتباہ پیدا ہونے لگا۔ غرض تمام عالم کے مسالک و مذاہب نے انسان کو یا تو دُنیا سے کنارہ کش ہو کر رہبانیت کی زندگی گزارنے کی تعلیم دی، یا یہ سمجھایا کہ اس حیاتِ دنیوی کے ماسوا تیرے لئے اور کوئی منزل نہیں، اور اس طرح انسان کو خالق سے غافل بنایا۔ اور یا انسان کو ایسا بے بس و مجبور ظاہر کیا کہ اسے ہمتِ پرواز اور شوقِ جستجو ہی باقی نہ رہا۔ لیکن اسلام نے دکھا دیا کہ "تکمیلِ بشریت و عبدیت" کے بعد ایک انسان جس طرح پادشاہِ ملک، تاجدارِ سلطنت اور شہنشاہِ عالم بن سکتا ہے۔ اسی طرح وہی بشر ایک آن میں ساتوں آسمانوں کو طے کرکے مکان و لامکاں کی حدود سے تجاوز کرکے سرحدِ ادراک سے بھی ماوراء وہاں تک جہاں کسی مخلوق کے واہمہ کو بھی رسائی

نہیں پہنچ سکتا ہے، اور "بشریت و عبدیت" کو وہ معراج نصیب ہو سکتی ہے جو ممکنات و موہومات کسی کو بھی حاصل ہونی ناممکن ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں (اقبال)

علامہ اقبال، اسرارِ خودی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اِس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟"

"اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس کے حکما و علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا، جس قدر کہ ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اُتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی

مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی +

"ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکمانے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "انا" کی حیات کا یہ مشہور تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے عمل سے متعین ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ انسانی "انا" کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گزشتہ طریق عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا، وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے ("ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ اور کلام ہی خدا تھا") تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتہ کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکمانے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ . . . .

. . . . . . اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکمانے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا۔ اور اس میں شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جب "انا" کی تعیین عمل سے ہے۔ تو "انا" کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ترکِ عمل ہے یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک تھا، اور اس بات کا متقضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کر دے۔ بنی نوع انسان کی ذا

تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب احترام سے لیا جائے گا کہ اِس عظیم الشّان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرایہ میں اپنے مُلک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مُراد ترکِ کُلّی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے، اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔ بلکہ ترکِ عمل سے مُراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی رستہ پر چلے۔ مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے، سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا، اور سری کرشن کی قوم اُن کی تجدید کے اثر سے محروم رہ گئی۔"

"مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک "انا" ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے مگر مسئلہ "انا" کی تحقیق و تدقیق میں مُسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے، اور وُہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی۔ اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور اُن کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وُہ اَن تھک مفسّر تھے۔ اسلامی تخیّل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی اُن کی تعلیم سے نہایت متأثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اِس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمّل ہو سکتی تھی، جو جزو سے کل

تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ اُنہوں نے جزو اور کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیّل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" کا اور "شرارِ سنگ" میں "جلوۂ طور" کا بلا واسطہ مشاہدہ کیا۔"

"مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا۔ یعنی اُنہوں نے دِل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار نتیجہ یہ ہُوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہؒ اور حکماء میں "واحد محمود" نے اسلامی تخیّل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ مُلّا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب دبستانِ مذاہب میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پُورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ابن تیمیہؒ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا۔ مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"شعراء میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر کہ "تصوّف برائے شعر گفتن خوب است" اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے۔ مگر باوجود اس بات کے ان کا کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اِن حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیّل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا۔ مرزا بیدلؒ لذّتِ سکون کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارا نہیں ؎

نزاکت ہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

اور امیر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ؎

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا" (دیباچہ اسرارِ خودی)

بے عملی کی اس مہلک وبا کی تخلیق اور ہمہ گیری کے سلسلہ میں دو باتیں اور قابلِ غور ہیں :-

جب اسلام میں سلطنت و ملوکیت آئی تو امتدادِ زمانہ کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کی بُرائیاں اور مفاسد بھی پیدا ہونے لگے، اور آخر کار حُبِ دُنیا، عیش و تنعّم جاہ و جلال، شوکت و حشمت، جبر و تشدّد، سفّاکی و خونریزی، اور انانیت و فرعونیت کا وُہ طوفان اُمنڈا کہ چنگیز و ہلاکو کو مات کر دیا :-

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج (سعدیؒ)

بسم اللہ ہی غلط تھی۔ خرابیاں پیدا ہونی لازم تھیں۔ اسلام ملوکیت و استبداد کی بیخ کنی کرنے آیا تھا۔ چنانچہ قرنِ اوّل میں اسلام نے جمہوری نظام کے وُہ بہترین نمونے ملّتِ مسلمہ اور تمام عالم کے لئے قائم کر دیئے تھے، جن کی تقلید کسی نہ کسی شکل میں آج بھی تمام جمہوری حکومتیں کرتی ہیں۔ مگر جب خود پیروانِ اسلام نے اِس زرّیں اصُول کو توڑا تو اس کے تابع و لاحق مفاسد کیوں نہ پیدا ہوتے چنانچہ قرونِ وُسطےٰ میں جباریّت و شدادیّت کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں۔ جب

یہ خرابیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو مصلحین و مجددین کو روک تھام لازم تھی چنانچہ
"کسرِ نفس"، "ترکِ خودی"، "تواضع" اور "عجز" کی تعلیم پر زور دیا گیا، تاکہ رؤسا و وزراء
اور سلاطین و اُمراء کے جبر و تشدد کا انسداد ہو جائے، اور وہ رعونت و تکبر، سفاکی و
قہاری اور انانیت و فرعونیت کے مہلک امراض سے شفا پا کر عملی دنیا میں بھی ایک
راستباز اور انصاف پسند اور صالح و متقی شخص بن سکیں، اور منازلِ سلوک جن سے
وہ اپنی گمراہی کی بدولت کوسوں دُور ہو گئے تھے طے کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیں
اور اس طرح اپنی تخلیق کے فرائض کو ادا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ قرونِ
وسطیٰ کے شعراء و حکما تک کی تعلیمات اسی قسم کے مضامین سے پُر نظر آتی ہیں۔ اس
مصلحانہ اقدام کا نتیجہ حسبِ منشا نکلا کہ جباریت و شدادیت کا طوفان دب گیا۔
رؤسائے ملت کی اصلاح سے عوام کی حالت سدھرتی ہے۔ چنانچہ خواص کے ساتھ
عوام کی اصلاح کا مقصد بھی حل ہو گیا۔ لیکن مُدّتِ مدید اور عرصۂ دراز کے بعد یہی
تعلیم جو اس قدر مفید تھی بے حد نقصان رساں بن گئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ "کسرِ نفس"،
"عجز"، "بے بسی"، "بے چارگی"، "خودشکنی" کے مضامین غیر محتاط اور نقال شعراء کے
ذریعہ عام و خاص سب کے کانوں میں پہنچے۔ عوام اس درس کے ظاہری اور سطحی
مفہوم کو پا سکتے تھے۔ اُنہوں نے اسی کو لائحہ حیات بنایا اور اپنے آپ کو ایک بیکس و
بے بس اور مجبور و معذور ہستی تصور کرنے لگے۔

ایک سبب اور بھی ہوا۔ جب اسلام اطراف و اکنافِ عالم میں پھیل گیا
تو مختلف قدیم مذاہب کے فلسفے مسلمانوں تک پہنچے۔ یونان کی حکمت و فلسفہ کا
خاص طور پر رواج ہوا۔ عجمی مسلمانوں کے رجحانات کے لحاظ سے "افلاطونیت جدیدہ"

کی تعلیمات زیادہ جاذبِ توجہ ثابت ہوئیں۔ چنانچہ خواص میں بالخصوص صوفیہ اس فلسفہ سے متاثر ہوئے، اور افلاطون کے "تشاؤم و قنوط" اور "بے عملی" کے نظریوں نے مسلمانوں کو بھی متشائم اور قانط بنا دیا۔ اور ان "گوسفندانِ قدیم" کی تعلیمات نے تمام قوم کو ایک عجیب مشککیت اور "بے عملی" کے طلسم میں گرفتار کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل خود اقبال کی زبان سے سنیئے:-

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گفت سرِ زندگی در مُردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیل ہائے ما فرماں رواست — جامِ او خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند — عالمِ اسباب را افسانہ خواند
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات
فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت — حکمتِ او بُود را نابود گفت
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است — مُردہ دِل را عالمِ اعیاں خوش است
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام — لذتِ رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب — طائرش از سینہ وزدم بے نصیب
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش — از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قوم ہا از سُکرِ او مسموم گشت — خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

(اسرارِ خودی)

غرض ان اسباب کی بنا پر صدیوں سے امتداد نے یہ نقشہ پیش کیا کہ اب ہر طبقہ اسی واہمہ میں گرفتار نظر آنے لگا۔ اور یہ ملت جس کے ایمان کے اہم اجزا "عمل اور خودی" تھے۔ اس غلط فہمی میں مستقل طور پر مبتلا ہو گئی کہ وہ بالکل ہیچ کارہ و ہیچ میرز ہے۔ اس غلطی نے جمود اور بے عملی کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے جن کا لازمی نتیجہ پستی و ادبار اور نکبت و زوال تھا۔

اقبال ایک حساس طبیعت اور مفکر فطرت لے کر آئے تھے، انہوں نے قوم کی گری ہوئی حالت کو دیکھا تو ملت کی اس ذلت و پستی پر اُن کا دل کڑھا۔ ان کے تفکر نے عہدِ ماضی کے مدوجزر پر غائر نظر ڈال کر کچھ نتائج مرتب کئے۔ قوم کی نبض دیکھ کر اس کے امراض کا پتہ لگایا، اور پھر وہ نسخۂ شفا ترتیب دیا جو قوم کے حال کو سُدھار سکتا، اور ملت کے مستقبل کو درخشاں و تاباں بنا سکتا ہے۔ آپ نے تمام مشرق کو ایک ہی سے امراض میں گرفتار دیکھا اور جان لیا کہ اگر جلد تدبیر نہ کی گئی تو تباہی و بربادی یقینی ہے۔ اس لئے اس "مصلحِ وقت" نے اپنا پیغام تمام مشرق بلکہ سارے عالم کو سنا دیا۔ تاکہ وہ ضلالت و گمراہی سے بچ کر راہِ نجات پا سکیں، اور اپنے آپ کو بربادی کے غار میں گر کر فنا ہونے سے بچا لیں۔ اس "مجدّدِ عصر" نے "گوسفندانِ قدیم" کی غلط اور تباہ کُن تعلیمات کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا، اور اسلام کا وہ عالمگیر پیغام جو عالمِ بشریت کا واحد نجات دہندہ ہے، بہ بانگِ دہل ملتِ مسلمہ، اقوامِ مشرق اور تمام دُنیا کو پہنچا دیا۔ تاکہ اس "نغمہ حجازی" کو سُن کر "عروقِ مُردہ مشرق میں پھر "خونِ زندگی" دوڑنے لگے، اور یہ خفتہ و مُردہ قوم پھر سے بیدار و زندہ ہو کر اقوامِ عالم میں اپنی جائز و حقیقی جگہ حاصل کر سکے۔

مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہو گیا کہ "خود شناسی اور عرفانِ نفس" تخلیقِ انسان کا مقصدِ اولین ہے کہ یہی درس اس کو تہذیبِ اخلاق، سیاستِ مدن اور معرفتِ الٰہی تک پہنچاتا، اور اس کی نجاتِ عقبیٰ و اُولیٰ اور ارتقائے جسم و رُوح کا ضامن بنتا ہے۔ "دینِ فطرت" کا پرستار ہوتے ہوئے یہ امر موجبِ حیرت تھا کہ "پھر مسلمان خودی سے اس قدر غافل کیوں ہے؟" اور "اُس نے خود شکنی، بے چارگی و بے عملی کو اپنی تقدیر کیوں سمجھ رکھا ہے؟" انہی اسباق کو جن کے "زیبِ طاقِ نسیاں" بنا دینے سے ملّتِ موجودہ زبوں حالی میں مبتلا تھی اور ہے، اقبال نے اپنے الفاظ میں پیش کیا۔ یہی درس علامہ کا وہ پیغام ہے جو اُن کو دیگر حکماء، صلحاء و مصلحین سے ممتاز بناتا اور ان کی برتری و تفوق کا ڈنکا بجا کر ان کو ملک الشعراء، خاتم الشعراء، فقیہ العصر اور مصلحِ زماں ثابت کرتا ہے۔ یہ تمام پیغام صرف ایک لفظ **خودی** میں مضمر ہے۔ مگر اس ایک مختصر لفظ کی تشریح و توضیح مستقل تصنیف چاہتی ہے۔ میں سہولت کی غرض سے اس ایک لفظ کو تین مختلف عنوانات کے ماتحت جو ایک دوسرے سے لازم و لاحق ہیں، تقسیم کروں گا تاکہ افہام و تفہیم میں دشواری پیش نہ آئے۔

۱۔ خودی

(خودی دو قسم کی ہوتی ہے ایک شیطانی اور دوسری یزدانی۔ شیطانی خودی وہ ہے جس کا نمونہ روزِ ازل شیطان نے پیش کیا تھا کہ باہمہ دعوائے عبادت و عبودیت اس معبودِ حقیقی اور آمرِ مطلق کے حکم سے سرتابی کی۔ نخوت و غرور و تکبر کے باعث اس نے اپنی اور آدم کی تخلیق میں امتیازات قائم کئے، اور اس کی انانیت

خودی نے اسے سجدہ کرنے کی توفیق نہ ہونے دی۔ یہی خودی جب انسان میں پیدا ہوتی ہے تو اس کو شداد و ہامان بنا کر "خسر الدنیا و الآخرۃ" کا مصداق بنا دیتی ہے۔ شیطانی خودی رکھنے والا انسان تکبر و رعونت اور غرور و نخوت کا پتلا بن جاتا ہے اور وہ اپنے قائم کردہ امتیازات کی بدولت ایسی گمراہی اور ضلال میں مبتلا ہوتا ہے جو اسے فرائض حیات سے منزلوں دور ہٹا دیتے ہیں۔ صوفیائے اسلام کی تعلیمات میں جہاں کہیں "ترک خودی" کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اسی شیطانی خودی سے محترز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

دوسری خودی وہ ہے جو "من عرف نفسہ عرف ربہ" کی مصداق ہے۔ اس خودی کی معرفت خصائص رذیلہ سے محفوظ رکھتی اور سیئات اعمال سے پناہ دیتی ہے۔ عارف خودی کو فرائض زندگی سے آگاہ کر کے اس کو بندۂ خدا اور مرد با خدا بناتی ہے۔ اور اگر اس کو ایک طرف "خلیفۃ اللہ فی الارض" کا اہل بناتی ہے، تو دوسری جانب اس کو قرب الٰہی کا مستحق ٹھہرا کر محسود جن و ملک ثابت کرتی ہے۔ اسی خودی کو حاصل کرنا انسان کی زندگی کا مقصود ہے، اور یہی تعلیم اسلام کی اصلی ہدایت ہے۔ علامہ اقبال نے "خودی" کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کی تشریح علامہ خود اسرار خودی کے دیباچہ میں اس طرح فرماتے ہیں:-

"شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذت حیات "انا" کی انفرادی حیثیت، اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے .... یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے، اس کا مفہوم محض "احساس نفس" یا "تعیین ذات" ہے

مرکب لفظ "بیخودی" میں بھی اس کا یہی
میں بھی لفظ خودی کے یہی معنی ہیں :

غرق قلزم وحدت دم از خودی نزند
بود محال کشیدن میان آب نفس

نیز رموزِ بیخودی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت، دفعِ مضرت تعیین عمل و ذوقِ حیاتِ عالیہ، احساسِ نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے، اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں، تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوّتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لئے بمنزلہ قوّتِ حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کر کے "قومی انا" کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے"۔

علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو مسئلہ خودی کی تشریح لکھی تھی۔ ڈاکٹر نکلسن نے علامہ کی تحریر اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمہ میں اپنے دیباچہ کے ذیل میں درج کی ہے۔ اس تحریر کے بعض حصّہ کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ علامہ فرماتے ہیں :-

اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفی خودی
ہے۔ یہ نصب العین صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے
زیادہ سے زیادہ منفرد اور یکتا بن جائے۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے
اپنے اندر اوصافِ خداوندی پیدا کرو" چنانچہ انسان اس یکتا ترین فرد (خدا)
سے مشابہت اور قرب پیدا کرنے سے خود بھی فردِ یکتا بن جاتا ہے۔

"حیات کیا ہے؟ حیات ایک انفرادی شے ہے۔ اس کی سب سے اعلیٰ
صورت" خودی" ہے۔ جس کے حصول کے بعد فرد ایک مکمل اور قائم بالذات مرکز
بن جاتا ہے۔ انسان جسمانی و روحانی اعتبار سے ایک قائم بالذات مرکز ہے لیکن
وہ ابھی تک مکمل فرد نہیں ہوا ہے۔ وہ خدا سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی اس
کی انفرادیت کم ہوتی جاتی ہے، جو خدا سے قریب ترین نقطہ پر پہنچ جاتا ہے۔ وہی مکمل
ترین شخص ہے، اس لئے نہیں کہ وہ بالآخر خدا میں جذب ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے
برعکس وہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ (حضرت مولانا رومؒ نے اس مسئلہ کو
بہت خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا ہے) انسانِ کامل صرف اس مادی دنیا ہی کو
اپنے اندر جذب نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس کو تسخیر کر لینے کے ذریعہ خدا کو بھی اپنی خودی
میں جذب کر لیتا ہے۔ . . . .

"خودی اپنے راستہ سے تمام مزاحمتوں کو دور کر کے مختار بن جاتی ہے۔
خودی کچھ حد تک مختار اور کچھ حد تک مجبور ہے۔ اسے اختیارِ کامل اس وقت
حاصل ہوتا ہے، جب وہ اس فردِ اعظم (خدا) تک پہنچ جاتی ہے، جو مختارِ مطلق ہے۔
مختصر یہ کہ اختیار پانے کے لئے ایک سعیِ پیہم کا نام حیات ہے۔

"انسان کے اندر حیات کا مرکز خودی یا شخصیت ہے۔ شخصیت کشاکش کی
ایک کیفیت ہے، اور اس کیفیت کی بقا سے ہی قائم رہتی ہے۔ اگر یہ کیفیت کشاکش
قائم نہ رہے تو اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہی شخصیت یا کیفیت کشاکش و اضطراب
انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اس لئے یہ فکر رکھنا ضروری ہے کہ کہیں
اضمحلال و سکون نہ پیدا ہو جائے۔ ہر وہ شئے جو اس کیفیتِ کشاکش کے بقا میں
معاون ہوتی ہے ہمیں غیر فانی بنانے میں مددگار بنتی ہے۔ خودی کے اس تصوّر
سے اقدار کا معیار قائم ہو جاتا ہے اور خیر و شر کا معمّا بھی حل ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شئے
جو خودی کو مستحکم بناتی ہے خیر، اور جو اُسے ضعیف بناتی ہے شر ہے۔ آرٹ، مذہب،
اخلاق سب کو خودی کے معیار ہی سے جانچنا چاہئے . . . . . "

"خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ عشق کا لفظ میں نے بہت وسیع معانی
میں استعمال کیا ہے، جس میں تسخیر کرنے اور جذب کرنے کی آرزو شامل ہے۔ اس
کی اعلیٰ صورت اقدار اور مقاصد کی تخلیق اور پھر ان کے حصول کی کوشش ہے۔
عشق، عاشق و معشوق دونوں کو فرد کامل کی شکل میں جلوہ گر کرتا ہے۔ کمال خودی
کے حصول کی کوشش جہاں سالک کو خودی کا عرفان بخشتی ہے، وہیں مطلوب
کی خودی کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ عشق ثانی کے ظہور بغیر سالک کو ہرگز تشفّی نہیں حاصل
ہوتی۔ جس طرح عشق خودی کو مستحکم بناتا ہے، سوال خودی کو ضعیف کرتا ہے۔ وہ سب
جو بغیر ذاتی سعی کے حاصل ہو سوال کے ذیل میں آجاتا ہے۔ ایک دولت مند شخص
کا بیٹا جسے اپنے باپ کی دولت ورثہ میں ملے سائل اور گداگر ہے۔ اسی طرح وہ بھی
جو دوسروں کے خیالات کے مطابق سوچتا اور خیال کرتا ہوا اپنی خودی کے استحکام

کے لئے ہمیں عشق حاصل کرنا چاہئے۔ یعنی وہ عمل جو ہر شئے کو مسخر کر لے، اور سوال (بے عملی) کی ہر صورت سے گریز کرنا چاہئے۔ آنحضرت صلعم کا اسوۂ حسنہ کم سے کم مسلمانوں کے لئے تو "عمل" کا بہترین درس بہم پہنچاتا ہے۔

"نظم کے دوسرے حصہ میں میں نے اسلامی اخلاق کے عام اصولوں کی جانب اشارے کئے ہیں، اور خودی کے تعلق سے ان کے مطالب واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ خودی کے ارتقا کے تین درجے ہیں:۔

اول: اطاعت

دوم: ضبطِ نفس، جو خود شناسی یا خودی کی اعلیٰ صورت ہے۔

سوم: نیابتِ الٰہی

دُنیا میں انسان کی ترقی کا تیسرا اور آخری درجہ "نیابتِ الٰہی" ہے۔ نائب روئے زمین پر خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ خودی کی تکمیل کا آئینہ، مقصودِ انسانیت اور ذہنی و جسمانی اعتبار سے حیات کا شاہکار ہوتا ہے۔ ہماری ذہنی پراگندگی اس میں منضبط ہو چکتی ہے۔ قدرتِ کاملہ اور علمِ کامل اس میں بیک وقت جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کی زندگی میں فکر و عمل اور جذبہ و عقل ایک ہو جاتے ہیں۔ نخلِ انسانیت کا آخری ثمر یہی ہے اور بالآخر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونا، ان تمام آلام و مصائب کو حق بجانب قرار دیتا ہے، جو مدارجِ ارتقا میں پیش آتے ہیں۔ بنی نوعِ انسان کا اصل حاکم وہی ہے۔ اس کی سلطنت روئے زمین پر خدا کی سلطنت ہے۔ وہ اپنی فطرت کی دولت سے دوسروں کو دولتِ زندگی بخشتا ہے، اور ان کو اپنے سے زیادہ سے زیادہ قریب لاتا ہے۔ ہم جتنا ارتقائی منزلوں پر چڑھتے جاتے ہیں، اتنا ہی اس

قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس سے قریب ہونے کی کوشش میں ہم زندگی کے اعلےٰ مدارج حاصل کرتے ہیں . . . . ‘‘

اقبالؔ کے نزدیک کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ نشۂ خود شناسی میں سرشار ہے۔

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد | شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد
چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما | بست صورت لذّتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت | بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

بچہ تک احساسِ خودی رکھتا ہے اور ذوقِ جستجو میں سرگرم نظر آتا ہے۔

از ہمہ بیگانہ آں مامک پرست | گر یہ ست و شیرست و خواب مست
جستجو سرمایۂ پندارِ او | از چرا چوں، کے، کجا، گفتارِ او
چشم گیر ایش فتد بر خویشتن | دستکے بر سینہ می گوید کہ ’’من‘‘

لیکن ہم ہیں کہ نیرنگِ عالم کے فریب میں آ کر کہیں سے کہیں بھٹک گئے ہیں اور ’’علمِ غیر‘‘ و ’’فکرِ غیر‘‘ کے طلسم نے ہم کو دامِ باطل میں اسیر کر کے اپنی ہستی سے بیگانہ بنا رکھا ہے:۔

علمِ غیر آموختی اندوختی | روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری | من ندانم تو توئی یا دیگری
عقل تو زنجیریِ افکارِ غیر | در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار | در دلِ تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ | سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگراں | جام ہم گیری بوام از دیگراں

آفتاب ہستی یکے در خود نگر — از نجوم دیگراں تابے مخر

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے — ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

(زندگی کیا ہے؟ اپنی خودی کا احساس کرنا، اپنے ماحول کو جاننا، اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنا۔ آخری دونوں باتیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں، جب تک پہلی نہ مل جائے۔ اِس لئے "احساسِ نفس" مقصدِ اولین بن جاتا ہے۔ لیکن مشرق و مغرب اِس راز سے ناواقف نظر آتے ہیں:۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نُور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

خودی کی موت سے رُوحِ عرب ہے بے تب و تاب — بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر — قفس ہُوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہُوا مجبور

کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

اقوامِ عالم اِن رموز سے بے خبر ہونے کی بدولت ان چیزوں کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں، جو ان کو راہِ راست سے بھٹکاتی ہیں۔ اگر خودی نہیں، تو تمام دُنیاوی علوم و فنون بیکار ہیں:۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود — کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود!

گر ہُنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ندہند

بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہد بود

اور اگر احساسِ خودی ہو جائے تو پھر "تمام مرحلہ ہائے ہُنر طے ہو جاتے ہیں":

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے؟

دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اِک نگاہ اُلٹتی ہے تختِ کَے؟

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے؟

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے؟

جس روز دِل کی رمز مغنّی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہُنر ہیں طے!

موجودہ تہذیب و تمدّن نے ہم کو اسرارِ خودی سے بہت دُور کر رکھا ہے
لیکن اگر خودی نہیں تو یہ نعمت و جاہ، یہ شکوہ و سروری اور یہ دُنیا سب ہیچ ہے۔

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر!

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گُہر میں آبِ گُہر کے سوا کچھ اور نہیں

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

کسے نہیں ہے تمنّائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

جسے عرفانِ نفس حاصل نہ ہُوا وہ اِس فریب سے نہ نکل سکا:—

کسے کہ از دو جہاں خویش را بروں نشناخت
فریب خوردۂ ایں نقشِ باطل است ہنوز

علم و عقل کی رہنمائی نقوشِ باطل سے زیادہ نہیں۔ خود شناسی ہی سچی قیادت کر سکتی ہے:۔

احتسابِ خویش کن از خود مرو — یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو
تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس — اندریں کشور مقامِ خود شناس
ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند — برنگوں شاخ آشیانِ خود مبند
نغمہ داری در گلو اے بے خبر — جنسِ خود بشناس و با زاغاں مپر
خویشتن را تیز زن شمشیر دہ — باز خود را در کفِ تقدیر دہ
اندرونِ تست سیلِ بے پناہ — پیشِ او کوہِ گراں مانندِ کاہ

اسلام کی تعلیم عرفانِ خودی ہے۔ عارفِ خودی کے سامنے ساری دُنیا جھک جاتی ہے۔ وُہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہوتا ہے اور ہر شے اُس کے اشارہ پر عمل پیرا نظر آتی ہے۔ وہ ایک چشم زدن میں زمانہ کو منقلب کر سکتا ہے۔ مکان و لامکاں سب جگہ اسی کا ڈنکا بجتا ہے۔ اور زمین و آسمان، لیل و نہار سب اس کے فرماں بردار بن جاتے ہیں:۔

رمزِ دینِ مصطفیٰ دانی کہ چیست؟ — فاش دیدن خویش را شاہنشہی است
چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش — زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش
آں مسلمانے کہ بیند خویش را — از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست — تیغ "لا موجود الا اللہ" اوست

در مکان و لامکاں غوغائے او — نہ سپہر آوارہ در پہنائے او
تا دلش سرّے ز اسرارِ خداست — حیف اگر از خویشتن ناآشناست
بندۂ حق وارثِ پیغمبراں — او نگنجد در جہانِ دیگراں
تا جہانے دیگرے پیدا کند — این جہانِ کہنہ را برہم زند
زندہ مرد از غیرِ حق دارد فراغ — از خودی اندر وجودِ او چراغ
پائے او محکم برزمِ خیر و شر — ذکرِ او شمشیر و فکرِ او سپر
صبحش از بانگے کہ برخیزد زجاں — نے ز نورِ آفتابِ خاوراں
فطرتِ او بے جہات اندر جہات — او حریم و در طوافش کائنات
ذرّۂ از گردِ راہش آفتاب — شاہد آمد بر عروجِ او کتاب
فطرت او را کشاد از ملّت است — چشمِ او روشن سواد از ملّت است

اندکے گم شو بقرآن و خبر
باز اے ناداں بخویش اندر نگر

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی ذوقِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہوگئی بیدار — شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و برّاق
اس کی نگہِ شوق پہ ہوتی ہے نمودار — ہر ذرّہ میں پوشیدہ ہے جو قوّتِ اشراق

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مُردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

عارفِ خودی کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جس کی سرحد موت سے بھی ماوراء ہے اور موت بھی اس کو فنا نہیں کر سکتی :-

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دلِ ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتۂ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے

معرفتِ خودی چند لمحوں میں حاصل ہو جانے والی چیز نہیں۔ گو کبھی کبھی یہ عرفان ایک برقِ تجلّی کی مانند سالک پر آناً فاناً میں کسی مردِ باخدا کے ذریعہ طاری ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسے حالات کا شمار شاذ و نادر میں ہے۔ عموماً یہ کیفیت مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس کے لئے بھی اسباب کا جمع کرنا یا جمع ہو جانا ضروری ہے :-

ضربتے باید کہ جانِ خفتہ برخیزد ز خاک
نالہ کے بے زخمہ از تارِ رباب آید بروں

اقبال اس معرفت کے تین مدارج قائم فرماتے ہیں :-

زندگی خود را بخویش آراستن　　بر وجودِ خود شہادت خواستن
شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن　　خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے　　خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق　　خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیش ازیں نور ار بمانی استوار
حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار

یہ شعور انسان کیونکر حاصل کرسکتا ہے؟ دُنیا اور ما فیہا اس کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ متجسسانہ ہر طرف نظر ڈالتا ہے۔ مگر نگاہ بے نیلِ مرام واپس آتی ہے۔ اس نکتہ کو اقبال نے کس نزاکت کے ساتھ بیان کیا ہے:-

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابے　　ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لؤلؤ لالاست در گریبانت　　درونِ سینہ چو من گوہر دلے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت
بکوہ رفتم و پرسیدم ایں چہ بیدردی است　　رسد بگوش تو آہ و فغانِ غم زدۂ؟
اگر بہ سنگِ تو لعلے ز قطرۂ خون است　　یکے درآ بہ سخن با منِ ستم زدۂ
بخود خزید و نفس درکشید و ہیچ نگفت
رہ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم　　سفر نصیب، نصیبِ تو منزلے ست کہ نیست؟
جہاں ز پرتوِ سیمائے تو سمن زارے　　فروغ داغ تو از جلوۂ دلے ست کہ نیست؟
سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت
شدم بہ حضرتِ یزداں گزشتم از مہ و مہر　　کہ در جہانِ تو یک ذرّہ آشنایم نیست

جہاں تہی ز دل و مشتِ خاک من ہمہ دل | چمن خوش است شلے در خورِ نوایم نیست
تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

عقل و علم بھی اس امر میں رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں:۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں | اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن | یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

اِس منزل کی رہبری کا مقام خود ہمارے ہی اندر رہے، اور ہم ہی خود اپنے رہنما ہو سکتے ہیں:۔

تُو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا | کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نُورانی

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر | کہ تُو ہستی و وجُود دو جہاں چیزے نیست

راہ کور است بجز غوطہ زن اے سالک راہ | جادہ را گُم نکند در تہِ دریا ماہی

ضمیرِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست | نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست | بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟ | کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی، جز خود نہ بینی | تلاشِ خود کنی، جز او نیابی

عرفانِ خودی حاصل ہو جانے کے بعد عارفوں پر جو تجلیات ہوتی ہیں

اُن کا اندازہ ظاہر بیں نظروں کو نہیں ہوسکتا۔ جو نُور اور روشنی عارف کو حاصل ہوتی ہے، وہ اس کی نظر کو غیر محسوس گہرائیوں تک پہنچا دیتی ہے :۔

دگر است آں کہ زند سیر چمن مثلِ نسیم
آں کہ در شُد بہ ضمیرِ گل و نسرین دگر است

یہ "نورِ خودی" "سالکِ راہ کو" جلوۂ حقیقت "بے نقاب کر دکھاتا ہے" اور اس کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں عقل و ادراک کی رسائی ممکن نہیں :۔

یہ بزمِ ما تجلی ہاست بنگر — جہاں ناپید و او پیداست بنگر
علم کا موجود اور، فقر کا موجود اور — اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہ، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہ

عقل صغریٰ اور کبریٰ ہی میں گرفتار رہ جاتی ہے۔ دلائل و براہین کا جال اس کو عقدۂ حقیقت کھولنے سے باز رکھتا ہے :۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر — علم و حکمت از کتب، دیں از نظر
چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش — زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

گزر از آنکہ ندید است و جز خبر ندہد — سخن دراز کند لذتِ نظر ندہد
شنیدہ ام سخن شاعر و فقیہ و حکیم — اگرچہ نخل بلند است برگ و بر ندہد

یہ نکتہ تو صرف عارفِ خودی ہی کھول سکتا ہے :۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر — با نگاہِ دیگرے او را نگر

اسرارِ معرفت آشکار ہو جانے پر عارف کا عشق صادق اور ایمان کامل ہوتا ہے۔ ہم میں اور ایسے شخص میں یہ فرق ہے :۔

سرِّ دیں مارا خبر او را نظر — او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ایمان کامل اور عشقِ صادق مومن و عاشق کو وہ قوت، ہمت اور سرگرمی عطا کرتے ہیں، جس کا تصور بھی عام اشخاص کے لئے ممکن نہیں :۔

تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقامِ گفتگو است
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

عشق کے اس مقام تک عقل کی ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی۔ عقل طلسم دلائل میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور عشق مقاماتِ عالیہ طے کر لیتا ہے :۔

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل ۔۔۔ عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ۔۔۔ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

علم بھی باہمہ بزرگی و جلال عشق کے مدارج سے پست نظر آتا ہے :۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں

عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب

عشق کے احکام میں وہ اسرار پنہاں ہوتے ہیں۔ جن کو عام نظریں نہیں معلوم کرسکتیں۔ عاشق ان رموز سے واقف ہوتا ہے، اس لئے ان احکام پر سر تسلیم خم کرنے کو اپنا مقصود و محبوب جانتا ہے:۔

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق اگر فرماں دہد از جان شیریں ہم گزر
عشق محبوب است و مقصود است و جاں مقصود نے

ایمانِ کامل عشقِ صادق کی طرح عجیب اسرار و رموز کا حامل ہے:۔

عقل را سرمایہ از بیم و شک است | عشق را عزم و یقیں لاینفک است
بہ پیچ و تاب خرد گرچہ لذّتِ دگر است | یقینِ سادہ دلاں بہ زنکتہائے دقیق
یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی | یقین اللہ مستی خود گزینی

ایسا عاشق حقیقت اور عارفِ ذات بن جانا ہی مقصودِ حیات اور مطلوب اسلام ہے۔ جو ان مدارج کو نہ پاسکا وُہ کافر ہے۔ اس کو مومن کہنا ہی زیبا نہیں

ز رسم و راہِ شریعت نہ کردہ ام تحقیق | جز اینکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق
اگر ہو عشق تو ہے کُفر بھی مُسلمانی | نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
منکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است | منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

غرض عارفِ خودی عرفانِ حق حاصل کرلینے کی بدولت "صاحبِ آفاق"

اور "سلطانِ موجودات" بن جاتا ہے۔ اس کی ہمّت و حوصلہ کے لئے دوسروں کی قید و بندگراں ہوتی ہے، اور وہ اپنا عالم آپ پیدا کرتا ہے:۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات

خودی ہے مُردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

جہانِ ما کہ پایانے ندارد
چو ماہی در یمِ ایام غرق است

یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی
یمِ ایّام در یک جام غرق است

علم از تحقیق لذّت می بَرد
عشق از تخلیق لذّت می بُرد

ہر کہ او را لذّتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہانِ دیگراں

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں
کائناتِ تازۂ آید بروں

علامہ اقبال نے اسی لئے بار بار عرفانِ نفس اور خود شناسی کا پیغام دیا ہے:۔

خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شو

اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش
یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش

دلا دریوزۂ مہتاب تا کے
شبِ خود را برافروز از دمِ خویش

بخود باز آ خودی را پختہ تر گیر — اگر گیری پس از مردن نمیری
طواف کعبہ زدی گرد دیر گردیدی — نظر بخویشتن نہ پیچیدۂ دریغ از تو

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

۲۔ توحید

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ عَرَفَ رَبَّہٗ (جس کو اپنے نفس کا عرفان ہوا اُسے عرفانِ خدا حاصل ہو گیا) کے بموجب عرفانِ خودی کے ساتھ ہی ساتھ عرفانِ باری حاصل ہوتا ہے۔ نفی کے بغیر اس مقامِ اثبات تک رسائی نہیں ہوتی۔ تمام ممکنات و موجودات وغیرہ کو شمشیرِ لا سے فنا کر دینے کے بعد انسان کو ذاتِ واجب کا اثبات منکشف ہوتا ہے۔ جس کسی کی رسائی اثبات تک نہیں ہوتی، اور جو لا (نفی) ہی میں گرفتار رہ جاتا ہے، وہ ابدی مرگ کا شکار ہوتا ہے۔ عشق کی تکمیل اور ایمان کی پختگی بغیر اثبات کے نہیں ہوتی۔ مقامِ توحید کی معرفت کے بعد سالک کی نظروں میں خدا کے سوا کسی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں دراز کرتا۔ وہ کسی سے مرعوب و خائف نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کے لئے کسی شے کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ ذاتی اغراض و مقاصد اس کے لئے لفظ بے معنی ہوتے ہیں۔ اُس کی نفرت، اُس کی محبّت، اُس کا عمل، اُس کی عبادت ہر شے خدا کے لئے ہوتی ہے۔ "عبدیّت و للّٰہیت" اُس کو بے پناہ قوتیں عطا کرتی ہے۔ وہ خدا کے سامنے جھکتا ہے تو خدا ہر شے کو اُس کے سامنے جھکا دیتا

ہے۔ اقبال نے ان تمام امور پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے :-

نکتہ می گویم از مردانِ حال
امتاں را لا جلال اِلّا جمال

لا و اِلّا احتسابِ کائنات
لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون
حرکت از لا زاید از اِلّا سکون

تا نہ رمزِ لا اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست
ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید
از گِلِ خود خویش را باز آفرید

پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات
تازہ از ہنگامۂ او کائنات

از جنونش ہر گریباں چاک نیست
در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد
می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

لا مقامِ ضربہائے پے بہ پے
ایں غوِ رعد است نے آواز نے

ضربِ او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود

مردِ مومن از کمالاتِ وجود
او وجود و غیرِ او ہر شے نمود

گر بگیرد سوز و تاب از لا اِلٰہ
جز بکامِ او نگردد مہر و مہ

در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و الا ساز و برگِ اُمتاں　　　نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

در محبت پختہ کے گردد خلیل

تا نگردد لا سوئے الا دلیل

عرفانِ نفس اور عرفانِ خدا (خودی اور توحید) حیات کا مقصودِ حقیقی اور تمام کائنات کی اصلی منزل ہے۔ یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔ اور یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن وائے بر حالِ ما کہ ہم اِس اصلی سبق کو بھولے بیٹھے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص اور مؤثر رنگ میں توحید کی حقیقت و اہمیت جتا کر اس صراطِ مستقیم کی طرف بڑے جوش سے دعوت دی ہے اور ہماری غفلت و بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے اس اہم فریضہ کو بار بار طرح طرح سے ہمیں یاد دلایا ہے۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　　خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے　　　صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا　　　فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند　　　بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری　　　نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند　　　بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں　　　مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے　　　ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے　　　طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہئے

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا　　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

واۓ ما اے وائے ایں دیرِ کہن　　　تیغ لا در کف نہ تو داری نہ من
دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں　　　ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں
تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن　　　اے مسلماں مردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را　　　جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفیؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

۳۔ عمل

دین اسلام دو چیزوں کی ترکیب سے مکمل ہوتا ہے۔ ایمان اور عمل۔ ایمان عرفانِ خدا کے بعد تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ دوسری شے عمل ہے۔ عارفِ خودی اور عارفِ خدا کے اندر وہ غیر فانی قوتِ عمل ہوتی ہے جس کے سامنے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ عمل کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے پیغام میں اسی لئے عمل پر بہت زور دیا ہے۔ عمل جس طرح زادِ آخرت ہے، اسی طرح توشہ دنیا بھی ہے۔ عمل کے بغیر کوئی منزل بھی طے نہیں ہو سکتی۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ سرگرمِ عمل ہے پھر بندۂ مومن کس طرح بے عمل کے زندہ رہ سکتا ہے۔ غلط فلسفوں اور گمراہ فلسفیوں نے جب بے عملی کی تعلیم دی، اقبال اس کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کرتا

ہے، اور عمل کا وہ پیغام جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیا گیا تھا، آج پھر تازہ کرتا ہے اس عمل ہی کا دوسرا نام "جہاد" ہے، جو اُمّتِ مرحومہ کی کامیابی و کامرانی کا واحد راز تھا، اور عمل و جہاد کا ترک ہی ملّتِ مُسلمہ کی موجودہ پستی و زبوں حالی کا ذمہ دار ہے۔

عمل رازِ حیات و سِرِّ کائنات ہے۔ عمل سے ہی افراد بنتے اور قومیں سنورتی ہیں۔ مردِ مومن اسی کا پُتلا ہوتا ہے۔ اس کی قوت، ہمت، حوصلہ، شجاعت، عزم، استقلال، ثبات، جوش، ولولہ، علوِّ ظرف اور بلند نظری کی مثال اور نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کی بلند ہمّتی اور جوشِ عمل پہاڑوں کو فنا کر سکتی اور سدِّ سکندری کو ملیامیٹ کر سکتی ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کا فرماں بردار ہو جاتا ہے، اور آسمان و زمین اس کے اشاروں پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ خود تقدیرِ آسمانی اس کے ارادہ و منشا کی پابند بن جاتی ہے:—

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

علّامہ اقبال نے اپنے پیغام کے اقانیمِ ثلثہ میں سے اس تیسرے رکن کی تبلیغ بھی مختلف عنوانات سے بار بار فرمائی ہے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تُو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو، حاصل بھی تُو

کانپتا ہے دِل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا — ناخُدا تُو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحِل بھی تُو
وائے نادانی کہ تُو محتاجِ ساقی ہو گیا — مے بھی تُو، مینا بھی تُو، ساقی بھی تُو، محفل بھی تُو

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تُند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہو جا

تُو اگر خوددار ہے منّت کشِ ساقی نہ ہو — عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے، قُم باذن اللہ — وہی زمیں، وہی گردوں ہے، قُم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے — تری رگوں میں وہی خوں ہے، قُم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا — فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قُم باذن اللہ

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا — ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ
دہقاں اگر نہ ہو تن آساں — ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ

شیشے کی صُراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو — شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دُنیا نہیں افلاک کے نیچے — بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

بگذر از دشت و در و کوہ و دمن — خیمہ را اندر وجودِ خویش زن

طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز　　　ناقہ را سر دہ بمیدانِ ستیز

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں　　　آں یدِ بیضا بر آر از آستیں
خیز و از کارِ اُمم بکشا گرہ　　　نشۂ افرنگ را از سر بنہ
نقشے از جمعیتِ خاور فگن　　　واستاں خود را ز دستِ اہرمن

روز و شب آئینۂ تدبیرِ ماست　　　روز و شب آئینۂ تقدیرِ ماست
با تو گویم اے جوانِ سخت کوش　　　چیست فردا؟ دخترِ امروز و دوش
ہر کہ خود را صاحبِ امروز کرد　　　گرد او گردد سپہر گرد گرد
او جہانِ رنگ و بو را آبروست
دوش ازو امروز ازو فردا ازوست

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

. . . .　　　اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دما دم خویشتن را بر فساں زن　　　ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب و تواں را امتحان است　　　عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

ہست این میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ باندازہ جام است اینجا
ماکہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم
علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز
مئے کہ شیشہ گداز د بساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
زخویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

شریعت

دین انسانی خیالات کی پیداوار اور عکس نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ دینِ فطرت حضرت آدم ع کے زمانہ سے ایک ہی ہے۔ اسی کی تبلیغ مختلف اوقات و ازمنہ میں مختلف انبیا و رسل فرماتے رہے ہیں۔ دین کا مقصد

حیاتِ انسانی کو مکمل بنانا ہے۔ فرائضِ زندگی کے تمام مدارج سے آگاہ کرنے والی شے دین ہی ہے۔ ڈسپلن اور اطاعت دینِ خداوندی کے فیضان سے مستفید ہونے کے لئے لازمی اجزا ہیں، جو اس حبل المتین کو مضبوط پکڑ لیتا ہے، دنیا و عقبیٰ اسی کے ہو جاتے ہیں: ۔

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم　　دیں سرِّ محمدؐ و براہیمؑ

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات　　روشن از نورش ظلامِ کائنات

گر جہاں داند حرامش را حرام　　تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

از شریعت احسن التقویم شو　　وارثِ ایمانِ ابراہیم شو

شریعت ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایمان کے ضروری ارکان توحید اور رسالت ہیں۔ علامہ نے اِن اہم فرائض کی جانب کس طرح توجہ دلائی ہے، اور کیونکر اس دعوت و تبلیغ کی خدمت کو ادا کیا ہے، دیکھئے: ۔

۱۔ توحید

عقل جب تک توحید کو نہیں پالیتی دُنیا میں گمراہ بھٹکتی پھرتی ہے اور منزل سے آشنا نہیں ہوتی۔ توحید کی معرفت افراد کو عالم و حکیم اور توانا و سرگرم عمل بنا دیتی ہے۔ موحّد کا دِل تمام شکوک و خطرات سے صاف ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ کائنات کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور وہ غیر اللہ کے طلسم کو توڑ دیتا ہے۔ معبودانِ باطل اس سے ترساں و لرزاں نظر آتے ہیں۔ دوسروں کا منّت کش ہو کر رہنا اس کو شرک معلوم ہوتا ہے۔ وہ حیدرِ کرّار اور خالد جانباز بن کر زندگی بسر کرتا

ہے اور اپنا جہان آپ تعمیر کرتا ہے:۔

در جہانِ کیف و کم گردید عقل ۔۔۔ پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست ۔۔۔ کشتیِ ادراک را ساحل کجاست

ملتِ بیضا تن و جاں لا اِلٰہ ۔۔۔ ساز ما را پردہ گرداں لا اِلٰہ

لا اِلٰہ سرمایۂ اسرارِ ما ۔۔۔ پردہ بند از شعلۂ افکارِ ما
حرفش از لب چوں بدل آید ہمی ۔۔۔ زندگی را قوت افزاید ہمی

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است ۔۔۔ در آتِی الرَّحْمٰنِ عَبْداً مضمر است
تا ز اسرارِ تو بنماید ترا ۔۔۔ امتحانش از عمل باید ترا
دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو ۔۔۔ زور ازو قوت ازو تمکیں ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند ۔۔۔ خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
قدرتِ او برگزیند بندہ را ۔۔۔ نوعِ دیگر آفریند بندہ را
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود ۔۔۔ کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

نقطۂ ادوارِ عالم لا اِلٰہ ۔۔۔ انتہائے کارِ عالم لا اِلٰہ

توحید کی معرفت جس طرح مومن کے ایمان کا رُکنِ رکین ہے۔ اسی طرح اس کے لئے توحید کی اشاعت و تبلیغ ضروری ہے۔ بُتانِ عالم کی شکست و ریخت

اس پر لازم اور بنی نوع کو پیغامِ بیداری و نجات پہنچانا اس پر واجب ہے:-

صد نوا داری چو خوں در تن رواں | خیز و مضراب بہ تارِ او رساں
زانکہ در تکبیر رازِ بود تست | حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصود تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے | گر مسلمانی نیاسائی دمے
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ | از علومِ اُمّی پیغام دہ

اے کہ خوردستی ز مینائے خلیل | گرمیِ خونت ز صہبائے خلیل
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن | تیغِ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا هُوْ بزن
جلوہ در تاریکیِ ایام کن | آنچہ بر تو کامل آمد عام کن
لرزم از شرمم تو چوں روزِ شمار | پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نسپردۂ

۲- رسالت

پیغامِ خدا کی تبلیغ کے لئے انبیا و رسل آتے رہے ہیں۔ رسول معبودانِ باطل کے فریب کو توڑتا اور غیر اللہ سے آزاد کرا کے توحید کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ رسول پر وحی آسمانی آتی ہے، اس لئے اس کی تعلیم درحقیقت خود خدا کی دی ہوئی تعلیم ہوتی ہے، اور کتابِ آسمانی وہ دستور العمل اور قانونِ حیات ہوتا ہے جو خود خدا بندوں کے لئے تجویز اور پسند کرتا ہے۔ رسول کی نگاہ

علم و حکمت کی ان گہرائیوں کو چیرتی ہے جس کا ادراک عقل کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

کارِ رسالت کی تشریح اقبال نے یوں کی ہے:۔

تا نبوّت حکمِ حق جاری کند — پشتِ پا بر حکمِ سلطاں میزند
در نگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر — غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر
پختہ سازد صحبتش ہر خام را — تازہ غوغائے دہد ایام را
درسِ او اللہ بس باقی ہوس — تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس
از نمِ او آتش اندر شاخِ تاک — در کفِ خاکے از دمِ او جانِ پاک
معنیِ جبریل و قرآن است او — فطرۃُ اللہ را نگہبان است او

من نمی دانم چہ افسوں میکند — روح را در تن دگرگوں میکند
صحبتِ او ہر خزف را در کند — حکمتِ او ہر تہی را پُر کند
بندۂ درماندہ را گوید کہ "خیز" — ہر کہن معبود را کن ریز ریز
مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن — از دو حرفِ ربّیَ الاعلیٰ شکن

رسالت کے بغیر کارِ جہاں تمام نہیں ہوتا۔ انسان انسانیت سے عاری رہ جاتا ہے، اور آئینِ عالم بے ضبط و نظام ہوتا ہے۔ رسالت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ جسم میں رُوح۔ بغیر رسُول کے آئے آئینِ حیات مرتّب نہیں ہوتا، اور جسم بغیر رُوح رہ جاتا ہے:۔

حق تعالےٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جان دمید

حرفِ بے صوت اندریں عالم بُدیم ازرسالت مصرع موزوں شدیم
ازرسالت در جہاں تکوینِ ما ازرسالت دینِ ما آئینِ ما

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی تھے۔ سرکارِ دو عالمؐ کی بعثت کے بعد یہ سلسلہ ابدالآباد تک کے لئے ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ حضورؐ کو وہ شریعتِ حقّہ عطا کی گئی جس کے بعد کسی دین کی ضرورت نہیں۔ دینِ اسلام دُنیا کی ساری مشکلات کا حل اور تمام عقدہ ہائے دشوار کی کشود کار کا نظام پیش کر چکا، جس کے بعد اب کسی اور نبی کی حاجت باقی نہیں رہی۔ اسی لئے عقیدۂ ختمِ رسالت تکمیلِ ایمان کا لازمی جزو ہے۔ جس کے بغیر ایمان ناقص رہتا ہے۔ آنحضرتؐ نے وہ دین و آئین پیش کیا جو تمام عالم کو ایک وحدت میں منسلک کرنے والا ہے، اور روحانیت و معاشرت و سیاست کا مکمل نظام ہے۔ جس میں قیامت تک کمی و بیشی کی گنجائش نہیں۔ آج منکرین و مخالفین بھی اسی دینِ متین کے اصول و قوانین کی پابندی کر رہے ہیں۔ اور دشمنانِ اسلام کو بھی اس کے سوا اور کسی دامن میں پناہ نظر نہیں آتی۔ چنانچہ موجودہ مہذب دُنیا بتدریج انہی آئین کو اپنا دستور العمل بنا رہی ہے، جو ساڑھے تیرہ سو برس قبل نبی اُمّیؐ نے تلقین فرمائے تھے:۔

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است وحدتِ مُسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گُہر از بحرِ بے پایانِ اوست ما کہ یک جانیم از احسانِ اوست
تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود ہستیِ ما با ابد ہمدم شود

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد　　بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را　　او رسل را ختم، و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت　　داد ما را آخریں جامے کہ داشت

لا نبی بعدی ز احسانِ خداست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است

آنحضرت صلعم نے پیغامِ رسالت کیونکر ادا کیا اور نظامِ عالم میں کیا کیا انقلابات پیدا کئے اور کس طرح دنیا کو گمراہی سے نکال کر نجات کا سچا راستہ دکھایا، اس کو روحِ ابوجہل کی زبان سے علامہ اقبال نے بیان کیا ہے۔ ابوجہل گمراہی و سرکشی کا مجسمہ ہے۔ اس کے قلب و نظر پر مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس لئے وہ آنحضرت کے نجات دہندہ کارناموں کی رُوح کو نہیں پا سکتا، اور اس کی نگاہ میں یہ تمام تعلیمات و اصلاحات قابلِ اعتراض ہیں۔ چنانچہ طنز و تعریض کے طور پر کہتا ہے

سینۂ ما از محمد داغ داغ　　از دمِ او کعبہ را گُل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود　　نوجواناں را ز دستِ ما ربود　　(استبدادیت کی بیخکنی)
ساحر و اندر کلامش ساحری است　　ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است　　(حُسنِ تبلیغ)
تا بساطِ دینِ آبا در نورد　　با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد　　(بُت شکنی)
پاش پاش از ضربتش لات و منات　　انتقام از وے بگیر اے کائنات　　″
دل بغائب بست و از حاضر گسست　　نقشِ حاضر را فسونِ او شکست　　(توحید)
دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست　　آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست　　″
پیشِ غائب سجدہ بردن کوری است　　دینِ نو کور است و کوری دوری است　　″

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب (مساوات)

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خوان نشست ״

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب میدانم کہ سلمان مزدکی است (اخوت)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ معترضین آج بھی ان تعلیمات کو اسی طرح مسخ کرتے اور انسانیت کے لئے مُضر بتاتے ہیں جیسا کہ رُوحِ ابوجہل نے خیال کیا تھا۔

" ارمغانِ حجاز" میں ابلیس کی زبان سے بھی اسلام کی ان انقلابی تعلیمات اور تعمیری نظام کا ماتم ملاحظہ کیجیئے :-

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سَو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

مَوت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

سرکارِ دو عالمؐ کا مرتبہ دیکھئے حسین ابن منصور حلاج کی زبانی کہتے ہیں :-

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است

عبدہٗ از فہم تو بالا تر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

جوہرِ او نے عرب نے اعجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است

عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا

عبدہٗ ہم جاں فزا ہم جاں ستاں — عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگ گراں

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر

عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ است — ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بُو است

عبدۂ با ابتدا بے انتہاست | عبدۂ را صبح و شام ما کجاست
کس ز سرِّ عبدۂ آگاہ نیست | عبدۂ جز سرِّ الا اللہ نیست
لا الہ تیغ و دمِ او عبدۂ | فاش تر خواہی بگو ھو عبدۂ
عبدۂ چند و چگونِ کائنات | عبدۂ رازِ درونِ کائنات

مدّعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ ما رمیت

۳۔ عمل

ایمان بغیر عمل کے ایسا ہے جیسا کہ کوئی حکومت یا سوسائٹی بغیر آئین و نظام کے۔ اِس لئے عمل پر شریعت نے بہت زور دیا ہے، اور قرآن شریف میں ایمان کے بعد ہر جگہ عمل کا ذکر ہے۔ تعلیماتِ اسلام کی انسائیکلوپیڈیا کلامِ مجید ہے اور اس کی تفسیر آنحضرتؐ کے اقوال و اعمال۔ اِس لئے اتباعِ قرآن اور اتباعِ رسولؐ ہی وہ عملِ صالح اور دستور العمل ہے جس کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ پس ہر مسلم پر ان کی پیروی و تقلید موجبِ نجات اور فریضۂ حیات ہے۔ اقبالؔ اطاعت کی اہمیت جتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

تو ہم از بارِ فرائض سر متاب | برخوری از عِندَہٗ حُسنُ المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار | می شود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرماں پذیری کس شود | آتش ار باشد ز طغیاں خس شود
ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند | خویش را زنجیری آئیں کند

کائنات کا ذرّہ ذرّہ ایک آئینِ مسلّم کا تابعدار ہے، اور یہی ہر شے کے فروغ و ترقی کا سبب ہے۔ مثالوں سے اس امر کو ثابت کر کے نصیحت فرماتے ہیں :۔

بادر از زندانِ گُل خوشبو کند　　قید بُو را نافۂ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم　　پیش آئینے سرِ تسلیم خم
سبزہ بر دین نمو روئیدہ است　　پائمال از ترکِ آں گردیدہ است
لالہ پیہم سوختن قانونِ او　　رقص پیرا در رگِ او خونِ او
قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل　　ذرّہ ہا صحراست از آئینِ وصل
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی　　تو چرا غافل زایں ساماں روی
باز اے آزاد دستورِ قدیم　　زینتِ پا کُن ہماں زنجیرِ سیم

شکوہ سنجِ سختی آئیں مشو
از حدودِ زندگی بیروں مرو

مسلمان پر اتباعِ سنّت فرض ہے کہ یہی اس کی انفرادی و اجتماعی تعمیر و اصلاح کا واحد وسیلہ ہے :۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست　　اصلِ سُنّت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقاتِ یقیں　　پختہ تر از وے مقاماتِ یقیں
ملّت از آئینِ حق گیرد نظام　　از نظامِ محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علمِ او پیداستے　　ہم عصا و ہم یدِ بیضاستے

با تو گویم سِرّ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع

اور اتباعِ شریعت نام ہے اتباعِ رسولؐ اور اتباعِ قرآن کا۔ اتباعِ رسولؐ کی بابت لکھتے ہیں:۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ — گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت — بہرۂ از خلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم — رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دور ایستی — از میانِ معشرِ ما نیستی

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است — آب و تابش از یمِ پیغمبر است

می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ است
زندۂ تا سوزِ او در جانِ تست — ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تست

قرآن اور اتباعِ قرآن کی اہمیت اس طرح جتاتے ہیں:۔

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینۂ دل معنی بس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں بہر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش

می دہد قرآں جہانے دیگرش

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از امّ الکتاب
با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟　　مژدۂ لاقیصر و کسریٰ کہ داد؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی است　　فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست　　نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں　　زندہ و پایندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق　　سرعت اندیشہ پیدا کن چو برق
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ　　ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ
آفریدی شرع و آئینے دگر　　اندکے با نورِ قرآنش نگر
از بم و زیرِ حیات آگہ شوی　　ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

از یک آئینی مسلماں زندہ است　　پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست　　اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو　　ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

شریعت میں عمل صرف اس کا نام ہے کہ مومن تعلیماتِ قرآن اور سنّتِ نبوی کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو۔ اسی اصول کو جگہ جگہ اقبال نے واضح کیا ہے۔ اس توضیح کے بعد ارکانِ اسلام کی پابندی کی تلقین کو ملاحظہ کیجئے:-

لا اِلٰہ باشد صدف گوہر نماز — قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است — قاتلِ فحشا و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند — خیبرِ تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج — ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایۂ جمعیتے — ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے
حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ — ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حتیٰ تنفقوا محکم کند — زر فزاید الفتِ زر کم کند

ایں ہمہ اسباب استحکام تست
پختہ محکم اگر اسلام تست

ان ارکان کا ترک ہی ملتِ مسلمہ کی تباہی و بربادی کا واحد ذمہ دار ہے۔

مومن و پیش کساں بستن نطاق — مومن و غداری و فقر و نفاق
با پشیزے دین و ملت را فروخت — ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت
لا اِلٰہ اندر نمازش بود و نیست — نازہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰۃ او نماند — جلوۂ در کائناتِ او نماند
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ
رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور — دینِ او اندر کتاب و او بگور
صحبتش با عصرِ حاضر در گرفت — حرفِ دیں را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد — آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات — رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰۃ

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام　　فرد ناہموار ملّت بے نظام

سینہ ہا از گرمیِ قرآں تہی　　از چنیں مرداں چہ اُمید بہی

اسی لئے علاّمہ نے اس عمل کی جو مطابق شریعت ہو بار بار تلقین کی ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

یک شو و توحید را مشہود کن　　غائبش را از عمل موجود کن

لذّتِ ایماں فزاید در عمل　　مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

شرف نسا کی زبان سے بھی اسی راز کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ شرف نسا کا معمول تھا کہ قرآن اور تلوار اپنے پاس رکھتی تھی۔ موت کے وقت اپنی ماں سے کہتی ہے :۔

گفت اگر از رازِ من داری خبر　　سُوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر

ایں دو قوّت حافظِ یک دیگر اند　　کائناتِ زندگی را محور اند

اندریں عالم کہ میرد ہر نفس　　دُخترت را ایں دو محرم بُود و بس

وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن　　تیغ و قرآں را جُدا از من مکن

دل بآں حرفے کہ می گویم بنہ　　قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ

مومناں را تیغ با قرآں بس است　　تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

اسی لئے علاّمہ نے کہا ہے اور سچ کہا ہے :۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

طریقت

طریقت کیا ہے؟

طریقت شریعت سے جدا کوئی شے نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کے اسرار و رموز کا نام طریقت ہے، اسی کو تصوف کہتے ہیں۔ جو تصوف شریعت سے علیحدہ راستہ پہ چلائے، وہ مذہب اسلام سے ہرگز کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ چونکہ طریقت یا تصوف عام ذہن سے برتر ہوتا ہے۔ اسی لئے عوام اس کو شریعت کے ماورا و ماسوا خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر واقعہ کے خلاف ہے۔ اسلامی تصوف قرآن پاک اور سیرت النبیؐ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا وجود عہد رسالت سے ثابت و محقق ہے۔ مستشرقین فضلا نے بھی اپنی تحقیقات سے اسی نتیجہ کا انکشاف کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعد کو ماحول اور زمانہ نے اس میں دوسرے تخیلات کو مدغم کر دیا لیکن اس تاثیر و تاثر نے تصوف اسلامی کی روح پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ اس روح کے لئے جسم پھر بھی شریعت ہی رہی۔ علامہ اقبال کو بھی اس حقیقت کا صحیح احساس ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

پس طریقت چیست اے والا صفات؟ — شرع را دیدن با عماق حیات

فاش میخواہی اگر اسرار دیں — جز بہ اعماق ضمیر خود مبیں

گر نہ بینی، دین تو مجبوری است — این چنیں دیں از خدا مہجوری است

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

تا بہ بینی زشت و خوب کار چیست — اندر ایں نہ پردہ اسرار چیست

ہر کہ از ستر نبی گیرد نصیب ... ہم بہ جبریل امین گردد قریب
اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم ... تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرار دیں را فاش کن ... نکتۂ شرع مبیں را فاش کن

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

طریقت کی اس حقیقت سے اعراض و اغماض کرنے کے سبب سے ہی ملّت مرحومہ پر پستی و ادبار کی گھٹا چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور علمائے سُوء نے اس نکتہ پر پردہ ڈال کر ہی اُمّت کو تباہی و بربادی کی طرف رہنمائی کی ہے:۔

مکتب و مُلّا سخن ہا ساختند ... مومناں این نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مرد ... آتش او در ضمیر او فسرد
صُوفیانِ باصفا را دیدہ ام ... شیخ مکتب را نکو سنجیدہ ام
عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید ... آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید
ہر یکے دانائے قرآن و خبر ... در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل اُفتادہ در بندِ ہوس ... منبرِ شاں منبرِ کاک[1] است و بس

زیں کلیماں نیست اُمید کشود
آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سُود؟

حضرتِ علامہ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] کاک ایک قسم کی چھوٹی سی روٹی ہے۔ منبر کاک اس چوبی میز کو کہتے ہیں جس پر نانبائی روٹی رکھ کر بیچتا ہے۔ (مثنوی اقوامِ شرق و مسافر)

"دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رُو سے ہر شئے پر مقدم ہے، نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معیّن کرتا ہے۔ ان حدود کے معیّن کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ خودی قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے حدودِ خودی کے تعیّن کا نام شریعت ہے اور شریعت اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رُو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی، اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"[1]

فقر

طریقت میں فقر کے معنی محتاجی و مفلسی کے نہیں ہیں۔ صوفی فقیر جاہ، مال، عزت، منصب، سوال، ناداری سب کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ ان سب اعتبارات سے مافوق ہوتا ہے۔ اس کی ہمت ان سب چیزوں سے بالا و برتر ہوتی

---

[1] مکاتیبِ اقبال

ہے۔ وہ غیر کا احسان ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں میں جب سے یہ دُنیوی فقر و احتیاج اور حُبِّ جاہ و مال آئی، اُسی وقت سے ان کا زوال شروع ہو گیا:

اے فراہم کردہ از شیراں خراج | گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج
جملہ اسقامِ تو از ناداری است | اصلِ علّت ہا ہمیں بیماری است
می رباید رفعت از فکرِ بلند | می کشد شمعِ خیالِ ارجمند

از خمِ ہستی مئے گلفام گیر
نقدِ خود از کیسۂ ایّام گیر

"خمِ ہستی" کی وہ "مے گلفام" اور "نقد کیسۂ ایّام" کیا ہیں؟ دیکھئے کیسی لطیف مثالوں سے سمجھاتے ہیں:۔

فطرتے کو بر فلک بندد نظر | پست می گردد ز احسانِ دگر
از سوال افلاس گردد خوار تر | از گدائی گدیہ گر نادار تر
مشتِ خاکِ خویش را از ہم مپاش | مثلِ مہ رزقِ خود از پہلو تراش
رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو | موجِ آب از چشمۂ خاور مجو
تا نباشی پیشِ پیغمبر خجل | روز فردائے کہ باشد جاں گسل
ہمت از حق خواہ با گردوں ستیز | آبروئے ملّتِ بیضا مریز

اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب | می نخواہد از خضر یک جام آب
تر جبیں از خجلتِ سائل نشد | شکلِ آدم ماند و مشتِ گل نشد
زیرِ گردوں آں جوانِ ارجمند | می رود مثلِ صنوبر سر بلند

در تہی دستی شود خود دار تر
بخت او خوابیدہ او بیدار تر

اسلام فقر میں پیدا ہوا، فقیری کی گود میں پلا بڑھا، اور فقیری نے ہی اس کو سلطانی و شاہنشاہی بخشی۔ یہ فقر ہمارے اِس ظاہری فقر سے بالکل جُداگانہ چیز ہے، اور فرمانِ مصطفوی اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (فقیری پر مجھے فخر ہے) میں پوشیدہ ہے۔ بندۂ مومن جب فقیری کے اس راز سے واقف ہو جاتا ہے، تو دُنیا اور دُنیا کی سب جاہ و حشمت خود اس کے قدموں میں لوٹتی نظر آتی ہے۔ نادار ہی سے اس فقیری میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

فقر خواہی از تہیدستی منال — عافیت در حال و نے در جاہ و مال
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد — نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد

اسلام کی اصطلاح میں فقر کیا ہے، اور کیا قوت رکھتا ہے؟ علامہ کی زبان سے سُنئے:-

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟ — یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل
فقر کارِ خویش را سنجیدن است — بر دو حرفِ لاالٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر — بستۂ فتراک او سلطان و میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم، ایں متاعِ مصطفٰے است
فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند — بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند
بر مقامِ دیگر اندازد ترا — از زجاجِ الماس می سازد ترا
برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم — مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم

باسلاطیں درفتد مردِ فقیر | از شکوہ بوریا لرزد سریر
از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر | وارہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بآں صحرا مقام | کاندرو شاہیں گریزد از حمام
قلب او را قوت از جذب و سلوک | پیش سلطاں نعرۂ او لاملوک

حکمت دیں دل نوازی ہائے فقر | قوت دیں بے نیازی ہائے فقر

فقر قرآں، احتساب ہست و بود | نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات | بندہ از تاثیر او مولا صفات

فقر چوں عریاں شود زیر سپہر | از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
فقر عریاں، گرمی بدر و حنین | فقر عریاں، بانگ تکبیر حسین
فقر را تا ذوق عریانی نماند | آں جلال اندر مسلمانی نماند

مختصر یہ کہ وہ فقر جو توحید کا رازدار اور متاعِ مصطفوی کا امین ہو جس کا ساز و برگ قرآن عظیم ہو اور جس کے عناصر صدق، اخلاص، نیاز، سوز، درد، ذوق و شوق، تسلیم و رضا، دل زندہ اور نگاہ راہ بیں ہوں، وہ فقر اسلام کا مقصود ہے۔ جس پر آنحضرت صلعم نے بھی فخر فرمایا تھا۔ جس کی قوت و شوکت کی تفصیل اوپر کے اشعار میں آئی، جو تمام عالم کی سلطنتوں کو چشم زدن میں تہ و بالا کر سکتا ہے اور جو بطن گیتی اور سینۂ افلاک کے پوشیدہ اسرار و رموز کو حل کرنا ایک کھیل جانتا

ہے۔ جب سے مسلمانوں نے یہ فقر کھو دیا، دین بھی اُن کا نہ رہا، اور دُنیا نے بھی اُن سے مُنہ موڑ لیا۔

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طُوفانی

پسند روح و بدن کی ہے وانمود اسکو
کہ ہے نہایت مومن خودی کی عریانی

وجود صیرفیِ کائنات ہے اس کا
اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وُہ فانی

اسی سے پُوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بُو کی طغیانی

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانیؒ و سلیمانیؑ

اِس لیئے علاّمہ اسی دولتِ فقر کی مسلمانوں کے حق میں دُعا کرتے ہیں:۔

. . . .
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

قبضہ میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرّارؓ

فقرِ دین اور فقرِ دُنیا کا فرق اقبال نے خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

اِک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری
اِک فقر سے کھُلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اِک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اِک فقر سے مٹی میں خاصیّتِ اکسیری

اِک فقر ہے شبیریؓ، اِس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیریؓ

فقرِ کافر خلوتِ دشت و دَر است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است

زندگی آں را سکونِ غار و کوہ　　　زندگی ایں را ز مرگ با شکوہ
آں خدا را جستن از ترکِ بدن　　　ایں خودی را بر فسانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و وا سوختن　　　ایں خودی را چوں چراغ افروختن

اس اسلامی فقر پر جس کا ظاہر غربت ہو اور باطن اسلامی روح مسلمان کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ اور کبھی یہ امر اس کی کمزوری کا باعث نہیں بن سکا۔ ملفوظاتِ اقبال میں سعادت علی خاں صاحب حضرت علامہ کی محفل کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں: "محفل میں ایک صاحب نے کشمیریوں کی غربت و جہالت کا ذکر کیا۔ مرحوم مسکرا دیئے۔ غربت و جہالت ثروت و ایمان و حریت کی راہ میں نہ کبھی سدِ راہ ہو سکے ہیں اور نہ ہوں گے۔ ہم تو امتیِ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں۔ مسلمان کے لئے غربت و جہالت کی آڑ لینا اس کی روحانی کمزوری کی بیّن دلیل ہے۔"

"کسی نے علامہ سے فقر کی بابت پوچھا تو فرمایا۔ فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں، بلکہ استغنا اور دولت سے لاپرواہی ہے۔ دولت جوہرِ مردانگی کی موت ہے، اس سے جرأت اور بہادری جاتی رہتی ہے۔"

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری[1]

عشق

عشق اور محبت رازِ حیات اور سرمایۂ زندگی ہے۔ مذہب کی بنیاد بھی عشق ہے۔

[1] ملفوظاتِ اقبال

اور کارِ دُنیا کا وسیلہ بھی یہی ہے۔ راہِ عشق مصائب و مشکلات سے لبریز ہے۔ مگر عاشق ان تکالیف کو راحت سمجھتا ہے اور منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اپنی جستجو جاری رکھتا ہے۔ جس کو عشق کا سرمایہ نصیب ہو گیا، اس نے سب کچھ پا لیا۔ دین بغیر عشق کے مکمل نہیں ہوتا۔ عشق سرِ دین ہے۔ سالکِ راہ اسی سیڑھی سے بارگاہِ خداوندی تک رسائی پا سکتا ہے:۔

زندگی را شرع و آئین است عشق　　اصلِ تہذیب است دین، دین است عشق
ظاہرِ او سوزناک و آتشیں　　باطنِ او نورِ ربّ العالمیں
از تب و تابِ درونش علم و فن　　از جنونِ ذوفنونش علم و فن
دین نگردد پختہ بے آدابِ عشق　　دین بگیر از صحبتِ اربابِ عشق

خودی کی تکمیل و پائندگی کیلئے بھی عشق لازمی و لابدی ہے۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبّت می شود پائندہ تر　　زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از محبّت اشتعالِ جوہرش　　ارتقائے ممکناتِ مضمرش
فطرتِ او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیاموزد ز عشق

عشق جسم و روح، ظاہر و باطن سب پر حاکم ہے۔ اس میں بے پناہ قوتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کی تفصیل خود علامہ کے قلم سے معلوم کیجئے۔

. . . .　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانہ کی رَو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دمِ مصطفیٰ　　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود　　عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

از محبت جذبہ ہا گردد بلند　　ارج می گیرد ازو نا ارجمند
بے محبت زندگی ماتم ہمہ　　کاروبارش زشت و نامحکم ہمہ
عشق صیقل می زند فرہنگ را　　جوہرِ آئینہ بخشد سنگ را
اہلِ دل را سینۂ سینا دہد　　با ہنرمنداں یدِ بیضا دہد
پیشِ او ہر ممکن و موجود مات　　جملہ عالم تلخ و او شاخِ نبات
گرمیِ افکارِ ما از نارِ اوست　　آفریدن جاں دمیدن کارِ اوست
عشق مور و مرغ و آدم را بس است　　عشق تنہا ہر دو عالم را بس است
دلبری بے قاہری جادوگری است　　دلبری با قاہری پیغمبری است

ہر دو را در کارہا آمیخت عشق
عالمے در عالمے انگیخت عشق

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق
آبِ حیواں تیغ جوہر دارِ عشق
از نگاہِ عشق خارا شق شود
عشقِ حق آخر سراپا حق شود

عشق شبخونے زدن بر لامکاں
گور را نادیدہ رفتن از جہاں
زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست
قوتش از سختیِ اعصاب نیست
عشق با نانِ جویں خیبر کشاد
عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کلۂ نمرود بے ضربے شکست
لشکرِ فرعون بے حربے شکست
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر
ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است
کارِ او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبیں
ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
لازمان و دوش و فردائے ازو
لامکان و زیر و بالائے ازو

ایسا عاشق جو ان بے پناہ قوتوں کا مالک اور ایسی یکتا صفات سے متصف ہو سکے، صرف وہ ہو سکتا ہے جو توحید اور رسالت کے اسرار کو پا جائے۔ جب حبِّ خدا اور محبتِ رسولؐ اس کے دل میں جاگزیں ہو جائیں گی، تو اس کو یہ عشق نصیب ہو جائے گا۔ دین کا تکملہ بغیر عشق کے نہیں ہوتا اور نہ دُنیا کی مشکلات بغیر اس کے حل ہو سکتی ہیں۔ تاریخ اسلام کا پہلا ورق ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ یہی عشق تھا جس نے کمزوروں کو طاقتور، جاہلوں کو عالم، غریبوں کو

صاحبِ تخت و تاج اور مشرکوں کو جن و ملک سے افضل بنا دیا تھا:۔

عاشقی توحید را بر دل زدن | وانگہے خود را بہر مشکل زدن
کاروانِ شوق بے ذوقِ رحیل | بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟ | این شعاعِ آفتابِ مصطفےٰ است
زندۂ تا سوزِ او در جانِ تست | این نگہ دارندۂ ایمانِ تست
باخبر شو از رموزِ آب و گِل | پس بزن بر آب و گِل اکسیرِ دل

دل زدین سرچشمۂ ہر قوت است
دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است

ڈاکٹر یوسف حسین صاحب روحِ اقبال میں لکھتے ہیں:۔

"مقاصد کی لگن کے لئے اقبال نے عشق کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا ولولہ انسان کی فطرت میں ابلا پڑتا ہے اور جس کے بغیر اس کا معنوی ارتقا ادھورا رہتا ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے۔ اقبال عشق کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے اور اکثر اوقات اس کو عقل جزوی کا مدِمقابل بنا دیتا ہے۔ عشق سے اس کی مراد تخلیقی ذوق و وجدان ہے جو تکمیلِ ذات کے لئے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا ہے، اور ہر قسم کے موانع پر، چاہے وہ فطری ہوں یا عمرانی غلبہ پاتا ہے۔ یہ شدتِ احساس کی حالت ہے جو نہایت ہی پُراسرار طریقے پر انسانی شخصیت کو لازوال بنا دیتی ہے۔ اس کی خصوصیات تخلیقِ مقاصد اور پیہم آرزو میں۔ عشق جتنا گہرا اور مقاصد کی لگن جتنی شدید ہوگی، اتنا

ہی انسان اپنے میں تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا کر سکے گا اور راہِ طلب و عمل میں آگے بڑھتا جائے گا۔"

علم و عقل عشق کی گہرائیوں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ ان کا موازنہ علامہ کی زبانی سنئے:-

علم بر بیم و رجا دارد اساس — عاشقاں را نے اُمید و نے ہراس
علم ترساں از جلالِ کائنات — عشق غرق اندر جمالِ کائنات
علم را بر رفتہ و حاضر نظر — عشق گوید آنچہ می آید نگر
علم پیماں بستہ با آئینِ جبر — چارۂ او چیست غیر از جبر و صبر
عشق آزاد و غیور و ناصبور — در تماشائے وجود آمد جسور

عقل او را سوئے جلوت میکشد — عشق او را سوئے خلوت میکشد
عقل ہم خود را بدیں عالم زند — تا طلسمِ آب و گِل را بشکند
می شود ہر سنگِ رہ او را ادیب — می شود برق و سحاب او را خطیب
چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست — لیکن او را جرأتِ رندانہ نیست
پس زترسِ را چوں کورے رود — زم زم نک صورتِ مورے رود
تا خرد پیچیدہ تر بر رنگ و بوست — می رود آہستہ اندر راہِ دوست
کارش از تدریج می یابد نظام — من ندانم کے شود کارش تمام
می نداند عشق سال و ماہ را — دیر و زود و نزد و دُورِ راہ را
عقل در کوہے شگافے میکند — یا بگردِ او طوافے میکند

کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود
دل سریع السّیر چوں ماہے بود

بندۂ مومن

(بندۂ مومن یا مردِ حُر ایک ہی فرد کے دو نام ہیں۔ فقر اور عشق کے امتزاج سے جو ہئیتِ ترکیبی بنتی ہے، وہی بندۂ مومن ہے۔ اس کا وجود توحید و رسالت کی معرفت اور شریعت و طریقت کے علم و ادراک سے قائم ہے۔ اُس کا ایک قدم زمین پر ہوتا ہے تو دوسرا عرشِ آسمانی پر۔ تدبیر و تقدیر اس کے اشاروں پر عمل کرتی ہیں۔ وہ عبدیّت کے درجہ پر فائز ہو کر نیابتِ خداوندی اور صفاتِ ملکوتی بیک وقت حاصل کر لیتا ہے۔ رازِ کُن فکان بھی وہی ہے اور اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا مصداق بھی اس کی ذات ہے۔

اس مردِ مومن کی شان علامہ اقبال علیہ الرحمۃ حلیم پاشا کی زبانی بیان کرتے ہیں:—

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو
مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو

ہر زماں اندر تنش جانے دگر
ہر زماں اورا چو حق شانے دگر

نیز علامہ جمال الدین افغانی کی زبان سے کہلواتے ہیں:—

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق

زشت و خوب و تلخ و نوشینش زحق

نیز فرماتے ہیں:۔

ہمچناں از خاک خیزد جانِ پاک | سوئے بے سوئی گریزد جانِ پاک
در رہِ او مرگ و حشر و حشر و مرگ | جُز تب و تابے ندارد ساز و برگ
در فضائے صد سپہر نیلگوں | غوطہ سہیم خوردہ باز آید بروں
می کند پرواز در پہنائے نور | مجلسش گیرندہ جبریل و حُور

تا ز مَا زَاغَ الْبَصَر گیرد نصیب
بر مقامِ عَبْدُہٗ گردد رقیب

بندۂ مومن کی پہچان اور اس کے خواص کیا ہیں؟ علامہ اقبال مولانا گرامی مرحوم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مُسلم وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوّتِ نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہرِ موسویت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھُو جائے تو بَرد و سلام بن جائے۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے۔ عدم بُود کو کھا جاتا ہے۔ پستی بلندی میں سما جاتی ہے۔ مگر جو قوّت جامعِ اضداد ہو، اور محلّل تمام تناقضات کی ہو اُسے کون جذب کرے۔ مُسلم کو موت نہیں چھُو سکتی، کہ اس کی قوّت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے . . . . . . مُسلم حنیف جذباتِ متناقض یعنی قہر و محبّت اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے، اور اس کا دائرۂ اثر اخلاقی تناقضات تک

ہی محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے پھر مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت کا اور ابراہیمیت کا کیونکر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے البتہ اس زمان و مکان کی مقیّد دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی قوتِ جاذبہ ذوقی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک کفِ پا سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذرّوں کو کبھی پامال کیا تھا۔"[1]

ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است
اصل ایں حکمت ز حکمِ اُنظُر است

بندۂ مومن ازو بہروز تر
ہم بہ حالِ دیگراں دل سوز تر

علم چوں روشن کند آب و گلش
از خدا ترسندہ تر گردد دلش

مردِ حُر محکم ز وِردِ لَا تَخَفْ
ما بمیداں سر بجیب او سر بکف

مردِ حُر از لَا اِلٰہ روشن ضمیر
می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

مردِ حُر چوں اُشتراں بارے بُرد
مردِ حُر بارے بُرد خارے خورد

پائے خود را آں چناں محکم نہد
نبضِ راہ از سوزِ او بر می جہد

جانِ او پایندہ تر گردد ز موت
بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت

صیدِ مومن ایں جہانِ آب و گل
باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل

حل نشد ایں معنیٔ مشکل مرا
شاہیں از افلاک بگریزد چرا

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے کہ جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کُلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
اُنہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجُود اُنہی کا طوافِ بُتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زنّاری

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مُسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اُس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

آپ نے دیکھا مردِ مومن کی تخلیق کن اجزا سے ہوتی ہے۔ اس کی

دلسوزی، روشن ضمیری، تحمل، ہمت، قلندری اور رواداری شریعتِ حقّہ کی پابندی سے نشو و نما پاتی ہیں۔ اسی لئے وہ آزاد فطرت کسی دنیوی طاقت سے خوف نہیں کھاتا۔ اور مشکلات کبھی اس کے لئے سدِّ راہ ثابت نہیں ہوتیں۔ اس میں وہ حرکت اور سوز پوشیدہ ہے جو موت کے بعد بھی آسودگی قبول نہیں کرتا۔ سوزِ دوام اور سیرِ مدام اس کے مشرب میں واجبات میں سے ہیں۔ حلاّج کی زبانی اسی نکتہ کو بیان کرتے ہیں:۔

با مقامے در نمی سازیم و بس | ما سراپا ذوقِ پروازیم و بس
ہر زماں دیدن تپیدن کارِ ماست | بے پر و بالے پریدن کارِ ماست

اور سُنیئے:۔

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست | بے جمالِ لایزال آسودہ نیست
ابتدا پیشِ بتاں افتادگی | انتہا از دلبراں آزادگی
عشق بے پروا و ہر دم در رحیل | در مکان و لامکاں ابن السبیل

کیشِ ما مانندِ موجِ تیز گام
اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

مومن کو حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے، وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتا ہے، اُس کو موت کی تمنّا ہوتی ہے۔ اِس لئے وہ اُسے راہِ شوق کی آخری منزل جانتا ہے اور یہ شہادت اُسے کوئے دوست میں پہنچا دیتی ہے:۔

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد | زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سُنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست — ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

مردِ مومن کی قوتِ بازو اور شوکت و جلال کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ وہ آسمان و زمین کو پلٹ سکتا ہے۔ تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ غرض کوئی چیز بھی اُس کے قبضہ و اختیار سے باہر نہیں ہوتی :-

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خود حریمِ خویش را ابراہیم خویش — چوں ذبیح اللہ در تسلیمِ خویش
پیش او نہ آسماں نہ خیبر است — ضربتِ او از مقامِ حیدر است
ایں ستیزہ دیدم پا کش کند — محکم و ستّار و چالاکش کند

جناب عبدالواحد صاحب لکھتے ہیں "ہم نے آپ سے دریافت کیا کہ فوق البشر کی کیا تعریف ہے؟ کہنے لگے۔ ہر صحیح مومن فوق البشر ہے۔ اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں" لے

حُبِّ رسُولؐ

مدارج عشق طے کرنے، فقر کی حقیقت پہچاننے اور مومن بننے کے لئے اتباعِ رسُولؐ لازم ہے۔ اتباع بغیر محبّت کے نہیں ہوتا جس سے محبّت اور قلبی تعلّق نہ ہو۔ اُس کی پیروی جھوٹے دعوے کی مانند ہے۔ یہ کاغذی پھُول کی مثال ہے جس کا رنگ دیرپا نہیں ہوتا، اور جس میں بُو بالکل نہیں ہوتی۔ تقلید اسی وقت درست ہوتی ہے۔ جب اس کی محرّک محبّت ہو۔ اگر عشق بانی ہے، تو پیروی بھی مکمّل ہوگی، اور اس کا پھل بھی بہترین ظاہر ہوگا۔

مومن بغیر محبّتِ رسولؐ کے نہ دُنیاوی ترقّیات حاصل کرسکتا ہے اور نہ رُوحانی مدارج پر فائز ہوسکتا ہے۔ اور اگر وُہ حُبِّ رسُولؐ اور اس کی بنا پر اتّباعِ رسُولؐ میں راسخ ہے تو دین و دُنیا اس کے ادنیٰ خادموں میں شامل ہیں۔ آنحضرت صلعم کی محبّت کا یہ حکم خود قرآنِ پاک نے واضح کردیا ہے "جب تک اپنی آل اولاد اور مال و دولت سے زیادہ حضورؐ سے محبّت نہ ہو ایمان کامل نہیں ہوتا" فرمانِ خدا ہے۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ قرآن و حدیث میں محفوظ ہے۔ اس پر عمل کرنا ہر محبِّ رسُولؐ پر فرض ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے اپنی تصنیفات میں اتّباعِ رسُولؐ اور اتباعِ قرآن پر بہت زور دیا ہے۔ یہ مضمون پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی قندِ مکرّر کے طور پر کچھ دیکھئے کہ رُوح کا تزکیہ اور باطن کا تصفیہ اسی پر منحصر ہے۔ یہی نہیں بلکہ عالمِ ظاہر پر بھی اسی کا پرتو اور عکس ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ نے خلوت گزینی اختیار کی تاکہ ہماری بہبُود کے لئے آئین ...

ضوابط مقرر فرمائیں۔ شب بیداریاں کیں تاکہ ہم خوابِ عشرت میں گزر اوقات کر سکیں۔ عبادتیں اور مجاہدے کئے۔ تاکہ ہمیں فتح و ظفر نصیب ہو۔ عالم ظلمت کفر و شرک سے تاریک تھا۔ اُس کو منور کیا۔ غلاموں اور عورتوں کو مظلومیت اور پستی و نکبت سے نکال کر احرار کی صف میں مساویانہ جگہ عطا کی۔ اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کی تاکہ دینِ براہیمی کو محکمی و استواری نصیب ہو۔ ایسے رحمۃ للعالمین اور دلسوز ہمدردِ بنی نوع کی علوِ شان کا حال سُنئے:۔

در دلِ مُسلم مقامِ مصطفےٰ است — آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
طور موجے از غبارِ خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد — کاسب افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمیں تیغِ او — قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دُنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

یہی ذاتِ گرامی صفاتِ مسلمان کا واحد مقتدا اور نصب العین ہے۔
اور اس رحمتِ عالم کی محبت و تکمیلِ مومن کا فریضۂ حیات ہے کہ اسی محبت میں

اس کی زندگی اور کامرانی کا راز پوشیدہ ہے :۔

چوں گلِ صد برگ مارا بو یکیست — اوست جانِ ایں نظام و او یکیست
سرِ مکنونِ دلِ او ما بدیم — نعرۂ بیباکانہ زد افشا شدیم
شورِ عشقش در نےِ خاموشِ من — می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
من چہ گویم از تولّایش کہ چیست — خشک چوبے در فراقِ او گریست
ہستیِ مُسلم تجلّی گاہِ او — طورہا بالد زگردِ راہِ او
پیکرم را آفرید آئینہ اش — صبحِ من از آفتابِ سینہ اش
در تپید متّصل آرامِ من — گرم تر از صبحِ محشر شامِ من
ابرِ آذار است و من بستانِ او — تاکِ من نمناک از بارانِ او
چشم در کشتِ محبّت کاشتم — از تماشا حاصلے برداشتم

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اُسوۂ حسنہ

سرکارِ دو عالم صلعم کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ حضورؐ نے مکارمِ اخلاق کی جو تعلیم دی ہے۔ اسے دُنیا کے بہترین مفکرین و مصلحین نے معیاری درس اور اعلیٰ نمونہ مانا اور سمجھا ہے۔ آنحضرتؐ کی سیرت کا مطالعہ اس لئے ہمارے واسطے اور زیادہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آج مسلمانوں کی پستی و نکبت کا بہت بڑا سبب یہی ہے۔

کہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید تو درکنار، ہم کو ان امور سے واقفیت تک نہیں ہوتی جن کی تعلیم و تبلیغ میں سرکارؐ نے اپنی پوری زندگی صرف فرما دی۔ رونے اور ماتم کرنے کا مقام ہے کہ ہم دوسرے فلسفیوں اور مفکروں کے اقوال کو لائحہ زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرت اِن تمام مسائل پر جن کے لئے ہم دوسروں کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلاتے ہیں، ہماری رہنمائی فرما گئے ہیں۔ اور آپؐ کے اعمال و اقوال ہماری تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی مشکلات کا صحیح حل پیش کر کے ہماری مشکل کشائی کے لئے تیار ہیں۔

ہر کہ از سرِّ نبی گیرد نصیب — ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب
در دلِ مُسلم مقامِ مصطفےٰ است — آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
ہستیِ مُسلم تجلّی گاہِ اُو — طورہا بالد ز گردِ راہِ اُو

بندۂ مومن، صاحبِ فقر اور عاشقِ صادق کے سامنے صرف ایک ہی دستور العمل ہوتا ہے، اور وہ آنحضرتؐ کا اُسوۂ حسنہ۔ ایسا شخص اپنی ذات کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام مِلّت کے لئے مُوجبِ نجات ہوتا ہے۔

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست — مِلّتے را می بَرد تا کوئے دوست

اس کی ہمّت دشواریوں سے نہیں گھبراتی۔ وہ قوّت کے مظاہرہ سے بوقتِ ضرورت گریز نہیں کرتا۔ ناتوانی اور ذلّت سے اُسے عار ہوتا ہے، اور وہ شرافت مجسّم اور انسانیت و مروّت کا پُتلا نظر آتا ہے۔ اقبالؔ ایسے ہی بندۂ حق بنانے کی تبلیغ کرتے اور مِلّت کو اسی برگزیدگی پر پہنچانے کے لئے سرگرم نظر آتے ہیں، اسی لئے کہتے ہیں :-

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اطاعت :۔

طاعتِ خدا اگر اس نیّت سے کی جائے کہ ہم کو اس کا صلہ ملے گا تو اس میں طاعت کی روح باقی نہیں رہتی۔ جزا تو حاصل ہو جائے گی۔ مگر وہ لذّت و سرور جو بے غرض اطاعت سے حاصل ہوتا نصیب نہ ہوگا۔ اصل اطاعت وہی ہے جو صدق و خلوص کے ساتھ بغیر غرض و غایت کے کی جائے، اس کی جزا اور صلہ انسانی وہم و گمان سے بالاتر ہوتا ہے۔ اِس کے لئے مردِ باخُدا کی صحبت ضروری ہے بغیر کسی بندۂ حق کی رہنمائی کے یہ ذوق نہیں پیدا ہوتا ؛

طاعتے سرمایۂ جمعیتے ــــ ربطِ اوراقِ کتابے ملتے
تا توانی گردن از حکمش مپیچ ــــ تا نہ پیچد گردن از حکمِ تو ہیچ

زندہ رود (اقبال) فلک عطارد پر سیّد جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح سے ملاقات کرتا ہے۔ اس وقت یہ ارواح نماز ادا کر رہی ہیں تو کہتے ہیں

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنّت است

ضبطِ نفس :۔

اپنے نفس کو قابو میں کرنا اور اس پر غلبہ پانا سالکِ راہ کا اوّلیں فرض ہے۔ جب تک انسان کو اپنے اوپر قابو نہیں ہوتا، وہ دوسروں کی قید و بند سے آزاد نہیں ہو سکتا ؛۔

نفس تو مثلِ شتر خود پرور است | خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف | تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں | می شود فرماں پذیر از دیگراں

مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است | بو تراب از فتح اقلیمِ تن است
در جہاں ہر کس تیغ از کرّاری است | آبروئے مرد از خود داری است
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب | باز گرداند ز مغرب آفتاب
ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست | چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست

حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش | تا مئے روشن خوری از تاکِ خویش
خاک گشتن مذہبِ پروانگی است | خاک را أب شو کہ ایں مردانگی است

حفظِ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب | حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب
حاکمی در عالمِ بالا و پست | جز بحفظِ جان و تن ناید بدست

صبر:—

ہر مشکل اور ہر مصیبت میں صابر رہنا اور پیشانی پر شکن تک نہ آنے دینا مومن کا شیوہ ہے۔ ہر بلا و آفت کو وہ خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے اور اُف تک نہیں کرتا۔ جاوید نامہ میں اہرمن جب یوں ورغلاتا نظر آتا ہے:—

تکیہ بر میثاقِ یزداں ابلہی است | بر مرادش راہ رفتن گمرہی است

زہرہا در بادۂ گلفام اوست | ارّہ و کرم و صلیب انعام اوست

تو روح زرتشت جواب دیتی ہے:۔

از بلاہا پختہ تر گردد خودی | تا خدا را پردہ در گردد خودی
مردِ حق بیں جز بحق خود را ندید | لا الٰہ می گفت و در خوں می تپید
عشق را در خوں تپیدن آبروست | ارّہ و چوب و رسن عیدین اوست
در رہِ حق ہر چہ پیش آید نکوست | مرحبا نامہربانی ہائے دوست

حق گوئی و بیباکی:۔

(مردِ مومن ہمیشہ راستباز، حق گو، نڈر اور بیباک ہوتا ہے۔ اس کو کوئی خطرہ راہِ حق سے نہیں روک سکتا۔ وہ وہی کام کرتا اور وہی بات کہتا ہے جو حق ہوتی ہے، خواہ اِس راست گوئی کی بدولت اسے کچھ ہی مصیبت کیوں نہ برداشت کرنی پڑے یہ صداقت و حق گوئی اُسے وہ طاقت بخش دیتی ہے جس کے سامنے تخت و تاج سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مومن کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ خوفِ خدا خوفِ غیر اللہ کو اس کے پاس بھی نہیں آنے دیتا:۔

آئینِ جوانمردی حق گوئی و بے باکی | اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مردِ حر محکم ز وِردِ لا تخف | ما بمیداں سر بجیب او سر بکف
علم چوں روشن کند آب و گلش | از خدا ترسندہ تر گردد دلش
با توانائی صداقت توام است | گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرح رمز حق و باطل قوت است

امانت :-

اِنسان دُنیا میں خدا کا خلیفہ اور امین بنا کر بھیجا گیا ہے۔ وہ دُنیا و مافیہا سب سے اعلےٰ و برتر ہے۔ اگر اس کو اپنے اس تفوّق و برتری کا احساس نہیں یا اگر وہ اپنے کو اس کا اہل نہیں ثابت کر سکتا تو یہ اس کی جہالت و نادانی ہے۔ اسی لئے اس کو کلامِ مجید میں ظَلُوْم و جَھُوْل کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ بندۂ مومن اس راز سے واقف ہوتا ہے، اور اسی لئے کائنات اس کی فرماں پذیر ہو جاتی ہے :-

اے ز آدابِ امانت بے خبر — از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموزِ زندگی آگاہ شو — ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو
چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند

خدمتِ خلق :-

مومن کی نظر میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ یکساں اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہ سب کو ہمدردی اور دوستی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی کو دُکھ میں مبتلا دیکھتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہے۔ کسی پر آفت آتی ہے تو لرز جاتا ہے اور جب تک اس کی

تکلیف کو دُور نہ کر لے، اُس کو سکون اور چین نہیں آتا۔ اس کی زندگی کا مقصود ہی خدمتِ خلق ہوتی ہے۔ وہ سرکارِ دو عالمؐ کی تقلید میں سب کے دُکھ درد کا شریک ہو کر ان کی مدد کرنا اپنے آپ پر فرض جانتا ہے، اور اس خدمت کا کوئی عوض نہیں چاہتا۔ یہ خدمت بنی نوع ہمیشہ مومن کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ افسوس کہ اب اور مکارمِ اخلاق کے ساتھ یہ صفت بھی ہم میں سے ناپید ہوتی جارہی ہے:۔

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق

طبعِ روشن مردِ حق را آبروست — خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اوست

خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است — مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

کسبِ حلال:۔

اسلام نے حلال و حرام کے امتیازات قائم کر دیئے ہیں، اور سختی سے کسبِ حلال پر قانع رہنے کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ زمانہ سخت نازک ہے۔ خداوندانِ مغرب نے جن کو دُنیا نے تہذیب و تمدّن کا دیوتا سمجھ رکھا ہے حلال و حرام کا فرق اُٹھا دیا ہے:۔

او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است و کارش ناتمام

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد — دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است

پردۂ آدم دری سوداگری است

اس کا نتیجہ ہے کہ موجودہ عالم حقیقی تہذیب، صحیح مذہب اور عقل و دانش سے بے بہرہ نظر آتا ہے۔ جب تک یہ نظام درہم برہم نہ کر دیا جائے، دنیا سچی ترقی کا راستہ نہیں پا سکتی:-

این بنوک این فکر چالاک یہود نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد این نظام دانش و تہذیب و دین سودائے خام

اسلام نے حلال و حرام کی پہچان کے لئے واضح اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ ان کی پیروی دین و دنیا کی استواری کا باعث بنتی ہے۔ اس لئے اسی راہ پر گامزن ہونا ضروری ہے:-

تا نہ دانی نکتۂ اکلِ حلال بر جماعت زیستن گردد وبال
علم و حکمت زاید از نانِ حلال عشق و رقت آید از نانِ حلال

صرفِ خیر:-

جس طرح کسبِ مال کے لئے شریعت نے اصول مقرر کئے ہیں، اسی طرح بذلِ مال کے لئے بھی آئین معین کر دیئے ہیں۔ اگر انسان میں حُبِّ مالی پیدا ہو جائے تو وہی مال وبال بن جاتا ہے۔ اور اگر تنگدستی میں بھی وہ احکامِ خدا کے مطابق صرف کرتا ہے تو اس کی مفلسی بھی نعمت ہے۔ قرآن مجید نے صرفِ مال کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ بندہ و آقا، زردار و نادار سب کے لئے یکساں منفعت بخش ہیں۔ مگر زرکش اور زرپرست کے لئے اسلام کوئی رعایت نہیں پیدا کرتا اور اس طبقہ کا سخت مخالف ہے۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن — کس نداند لذّتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ — آدمی درّندہ بے دندان و چنگ
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

نکتہ ہا از پیرِ رومم آموختم — خویش را در حرفِ او وا سوختم
"مال را گر بہرِ دیں باشی حمول — نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ گوید رسول"
گر نداری اندریں حکمت نظر — تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر
از تہی دستاں کشادِ امتاں — از چنیں منعم فسادِ امتاں
خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد — آبروئے دخترِ مزدور برد
در حضورش بندہ می نالد چو نے — بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے
نے بجامش بادہ و نے در سبوست — کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

ضرورتِ شیخ

علامہ اقبالؒ خود اپنے والد سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ آپ کو

اولیائے کرام سے بے حد عقیدت تھی۔ سفر میں جاتے تو مشائخ عظام اور صوفیائے کبار کے مزاراتِ مقدسہ پر حاضری دیتے۔ اپنے عہد کے مشائخ و اولیا سے آپ مخلصانہ و نیاز مندانہ ملاقات کیا کرتے تھے۔ حکیم سنائی رح، حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت محبوب الٰہی رح کے مزارات پر آپ جس عقیدت سے حاضر ہوئے ہیں اس کی یادگار آپ کی تصنیفات میں محفوظ ہے۔ اقبال نے ان بزرگوں سے استفادہ بھی فرمایا ہے، اور ان کے ملفوظات اپنی زبان سے پیغام کی صورت میں ہم سب تک پہنچائے ہیں۔ مولانائے رومؒ سے استفاضہ اور اُن کی تعلیمات سے استفادہ کے تذکرہ سے تو علامہ کی تصنیفات بھری پڑی ہیں، یہ سب باتیں اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ اقبال ارشاد و استرشاد کے سلسلہ کو ضروری جانتے ہیں۔ لیکن آپ عصرِ حاضر کے عام مشائخ کی طرف سے کافی بدگمان ہیں۔ آپ نے اپنی تصنیفات میں اس مضمون کی وضاحت کر دی ہے "جاوید سے" کہتے ہیں:-

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ — ہے اس کی نہاد کافرانہ

دربارِ شہنشہی سے خوشتر — مردانِ خدا کا آستانہ

لیکن یہ دَورِ ساحری ہے — انداز ہیں سب کے جادوانہ

سرچشمۂ زندگی ہوا خشک — باقی ہے کہاں مۓ شبانہ

خالی ان سے ہوا دبستاں

تھی جن کی نگاہ تازیانہ

آپ اس امر سے واقف ہیں کہ مردانِ خدا کی ایک نظر جو کام کر سکتی ہے وہ کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا:-

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر　　خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر
ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر　　مست می گردد باندازِ دگر

از دم بادِ سحر میرد چراغ
لالہ زاں بادِ سحر مے در ایاغ

اس لئے باوجود اس اعتراف کے کہ مردانِ خدا کم یاب ہیں۔ آپ نصیحت فرماتے ہیں کہ تلاش و جستجو جاری رکھو۔ اور کوئی مرشد مِل جائے تو اس کا وجود غنیمت جانو۔ اسی کے ساتھ آپ "جاوید سے" یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی مردِ باخدا نہ ملے تو جو تعلیماتِ تصوّف تم تک باپ دادا سے آئی ہیں اُن پر کاربند رہو، اور مولانائے رومؒ کے درس کو اپنا رہنما بنا لو۔ آپ کو اقرار ہے کہ مردانِ حق اس زمانہ میں بھی مفقود نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اس لئے ذوقِ طلب سے تھک کر بیٹھنا ہرگز جائز نہیں بلکہ تلاش و تفحص میں سرگرم رہنا لازمی ہے :-

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز　　دین و دولت قمار بازی
ناپید ہے بندۂ عمل مست　　باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر　　جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا　　اللہ کی شانِ بے نیازی

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں　　در بدن غرق است و کم داند ز جاں
چوں بدن از قحط جاں ارزاں شود　　مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیابد جستجو آں مرد را　　گرچہ بیند رو برو آں مرد را

تو مگر ذوقِ طلب از کف مدِہ — گرچہ در کارِ تو اُفتد صد گرہ
گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر — از اَب و جد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومیؒ را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم
ملّت از وے وارثِ مُلکِ عظیم

تسلیم و رضا

شریعت و طریقت کی رُو سے مومن پر لازم ہے کہ تسلیم و رضا اختیار کرے۔ جو کچھ اس پر گزرے اور اچھی بُری جو حالت بھی ہو اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

یہ امر ہے بھی عین مطابق فہم۔ بہت سے اسباب و جوارح ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور اس لئے بعض افعال و احوال کی ترتیب ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسے موقع پر اگر صبر و سکون سے کام لیا جائے اور تسلیم و رضا اختیار کی جائے تو عموماً نتائج ان قیاسات سے بہت مختلف ہوتے ہیں، جو بادی النظر میں قائم کر لئے جاتے ہیں:-

خدا شرّے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

جب عبد اپنا کام معبود کی سپرد کر کے اس کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اس راز و نیاز کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے :-

مردِ مومن با خدا دارد نیاز　　　با تو ما سازیم تو با ما بساز

تسلیم و رضا کا راستہ امن و سکون کا راستہ ہے۔ یہی اسلام کا بنا بنایا زرّیں اصول ہے اور اسی پر مسلمان ہمیشہ عامل رہا ہے۔ اس نظریہ کا مفہوم بے عملی اور کسالت ہرگز نہیں ہے۔ عمل تو مومن کی جان اور ایمان ہے۔ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا۔ اس طرح قوائے عملی اور حیات میں اضمحلال نہیں پیدا ہوتا بلکہ اور زیادہ تحریک حاصل ہوتی ہے :-

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا　　　پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا　　　ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند　　　مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے　　　اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

زندگی کا استحکام اسی قانون کی پابندی سے ہے :-

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست　　　موت نیرنج و طلسم و سیمیاست

نبوت کی تعلیم بھی یہی ہے :-

عزم و تسلیم و رضا آموزدش　　　در جہاں مثلِ چراغ افروزدش
من نمی دانم چہ افسوں می کند　　　روح را در تن دگرگوں می کند

اور شریعت کی نکتہ شناس فطرت نے بھی اسی کو دستور العمل قرار دیا ہے :-

حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست　　　بیخِ او اندر ضمیرِ مصطفےٰ است

از جدائی گرچہ جاں آید بلب
وصل او کم جو رضائے او طلب

مصطفیٰ داد از رضائے او خبر
نیست در احکامِ دین چیزے دگر

تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریاست
فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست

تسلیم و رضا کا مرتبہ بلند اور بے حد بلند ہے۔ ہر ایک کی ہمت نہیں کہ وہاں تک رسائی حاصل کر سکے لیکن بندۂ مومن کی دسترس سے یہ رتبۂ عالی دُور نہیں ہے:-

کارِ ما غیر از امید و بیم نیست
ہر کسے را ہمتِ تسلیم نیست

کارِ مردان است تسلیم و رضا
بر ضعیفاں راست نایداین قبا

اس مرتبہ کو پانے والوں کو شیریں ثمر نصیب ہوتے ہیں۔ ہمارے اسلاف اس راز سے واقف تھے اور اس لئے تسلیم و رضا پر عامل و کاربند۔ اقبال بھی اس لئے اسی رتبہ کے حصول کی تعلیم دیتے ہیں:-

در رضائے حق فنا شو چوں سلف
گوہرِ خود را بروں آر از صدف

در ظلامِ ایں جہانِ سنگ و خشت
چشمِ خود روشن کن از نورِ سرشت

تقدیر

مسئلہ تقدیر کے غلط افہام و تفہیم نے مسلمانوں کی تقدیر ہی بدل دی ہے ہمارے علما و صوفیہ اس کے کافی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس کے مفہوم سے واقف نہ تھے۔ وہ تقدیر کے صحیح معنی ضرور جانتے تھے۔ مگر انہوں نے

جس طرح اس مسئلہ کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس نے عامیوں کے دل و دماغ پر بدترین اثر ڈالا۔

اگر انسان کا عزم و حوصلہ اس کی تقدیر کو بنانے والا ثابت نہ ہو، تو یہ دُنیا عالمِ اسباب و علل نہیں رہتی، اور وہ بندہ بے دست و پا رہ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ امر خلافِ بداہت ہے۔ ایک بات اگر اپنے اسباب و نتائج اور ابتدا و انتہا کے تمام جزئیات کے ساتھ علمِ خدا میں محفوظ ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں، کہ علمِ خدا ہمارے عمل کو اپنا پابند بنا دیتا ہے۔ علم اور عمل، قیاس اور فعل کا یہ فرق ایک معمولی بات ہے، جس سے ہر باہوش واقف ہے۔ دینِ فطرت کی تعلیم تو یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، اور وہ اپنے عزم و ہمت سے بلکہ بعض حالات میں صرف ایک جنبشِ ابرو اور اشارۂ انگشت سے تقدیر کو بدل سکتا ہے:۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسلام نے ایمان کے بعد عمل سے زیادہ کسی شے پر زور نہیں دیا۔ قرآن کے صفحات اس کے شاہد ہیں۔ عمل کی اس شد و مد کے ساتھ تبلیغ کرنا خود بتاتا ہے کہ تقدیر کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جسے آج کل کے بے عمل مسلمان حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ مسلمان کی شان تو یہ ہے:۔

ہے اس کا مقدّر ابھی ناخوش ابھی خورسند — اِک آن میں سَو بار بدل جاتی ہے تقدیر
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند — تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مگر ہم نے خود ہی اپنے آپ کو غلط راستہ پر ڈال رکھا ہے:۔

تن بتقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

علامہ تقدیر کے مسئلہ کو یوں حل کرتے ہیں :-

اے کہ گوئی، بُودنی ایں بُود، شُد — کارہا پابندِ آئیں بُود، شُد
معنیِ تقدیر کم فہمیدۂ — نے خودی را نے خدا را دیدۂ
مردِ مومن با خدا دارد نیاز — "باتو ما سازیم تُو با ما بساز"
عزمِ او خلاقِ تقدیرِ حق است — روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست — خاکِ او با سوزِ جاں ہمراہ نیست

جاوید نامہ میں جب زندہ رود تقدیر کی بابت یہ خیال ظاہر کرتا ہے :-

سائل و محروم تقدیرِ حق است — حاکم و محکوم تقدیرِ حق است
جُز خدا کس خالقِ تقدیر نیست — چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

تو حکیم مریخی اس عقدۂ مشکل کا اس کو حل بتاتا ہے اور ہماری کج فہمی پر ماتم کرتا ہے :-

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تُو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست
ارضیاں نقدِ خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی، اُفتندگی تقدیرِ تُست — قلزمی، پایندگی تقدیرِ تُست
ہر زماں سازی ہماں لات و منات — از بُتاں جوئی ثبات اے بے ثبات؟

تا بجود نا ساختن ایمانِ تُست　　عالمِ افکارِ تو زندانِ تُست
رنج بے گنج است تقدیرِ این چنیں　　گنج بے رنج است تقدیرِ این چنیں
اصل دیں این است گر اے بے خبر　　می شود محتاج از و محتاج تر
وائے این دینے کہ خواب آرد ترا　　باز در خوابِ گراں دارد ترا

سحر و افسون است یا دین است ایں؟
حبِ افیون است یا دین است ایں؟

حلاج کی زبانی مسئلۂ تقدیر کا حل یہ بیان کرتے ہیں :-

نقشِ حق داری جہاں نخچیرِ تُست　　ہم عنانِ تقدیر با تدبیرِ تُست

"ندائے جمال" آتی ہے تو تقدیر کی گتھی یوں سلجھاتی ہے :-

ہر کہ اورا قوتِ تخلیق نیست　　پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیبِ خود نبرد　　از نخیلِ زندگانی بر نخورد

مردِ حق! برندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش

"ارمغانِ حجاز" میں رومی نے راہب کی زبان سے مسلمانوں کے غلط عقیدہ کی بابت کیا خوب کہا ہے :-

بہ رومی گفت با من راہبِ پیر　　کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را　　ترا تقدیر و ما را گشت تدبیر

اسی لیے علامہ یہ تلقین کرتے ہیں :-

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جبر و اختیار

مسئلہ جبر نے بھی مسلمانوں کو عظیم الشان نقصان پہنچایا ہے۔ اکثر فلاسفہ وصوفیہ انسان کو بندۂ مجبور مانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اکابرین صوفیہ میں سے مولانا روم نے اس غلط عقیدہ پر سخت احتجاج کیا ہے اور طرح طرح کے دلائل سے انسان کا مختار ہونا ثابت کیا ہے۔

روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہم اپنے اعمال و افعال اپنے اختیار کے مطابق کرتے ہیں۔ خواہش، نفرت، محبت، غصہ، ندامت وغیرہ سب جذبات ہمارے ہی ارادہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ مختاری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ قرآن شریف میں خدا نے عملِ خیر کی تعلیم و ترغیب دی ہے۔ اگر بندہ مجبور محض ہوتا تو اس کی کیا ضرورت تھی۔ اسباب ظاہر کائنات عالم کے وجود سے وابستہ ہیں۔ خدا نے بھی ان ظاہری اسباب کو حاصل اور فراہم کرنے کی تلقین فرمائی ہے، تو کیا انسان کے مختار ہوئے بغیر یہ ہدایت درست ہو سکتی ہے؟

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

اینکہ فردا آں کنم یا ایں کنم — ایں دلیل اختیار است اے صنم

واں پشیمانی کہ خوردی از بدی — ز اختیار خویش گشتی مہتدی

جملہ قرآں امر و نہی است و وعید — امر کردن سنگ مرمر را کہ دید

ہیچ دانا، ہیچ عاقل ایں کند — با کلوخ و سنگ خشم و کیں کند

غیر حق را گر نباشد اختیار — خشم چوں می آیدت بر جرم دار

چوں ہمیں خائی تو دنداں بر عدو | چوں ہمی بینی گناہ و جرم او
ہیچ خشمے آید بر چوب سقف
ہیچ اندر کین او باشی تو وقف!

در اصل صداقت جبر و اختیار کے بین بین ہے۔ انسان صرف اس معنی میں مجبور ہے کہ خلاقِ عالم اس کے اعمال و عزائم کا بھی خالق ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ہر بندہ مختارِ مطلق ہے۔ اس کے اعمال و افعال خود اسی کے عزم و ہمت کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ امر و نہی اور اطاعت و فرمانبرداری کے شرعی احکام اسی لئے حق و صداقت پر مبنی ہیں۔ علاّمہ اقبال کہتے ہیں:۔

فاش می خواہی اگر اسرار دیں | جز با عماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی دین تو مجبوری است | ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است
بندہ تا حق را نہ بیند آشکار | بر نمی آید ز جبر و اختیار
تو کہ در فطرت خود غوطہ زن | مرد حق شو برظن و تخمیں متن

تو ہم از بار فرائض سرمتاب | برخوری از عندہٗ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار | می شود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرماں پذیری کس شود
آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

بندۂ مومن کا جبر کیا چیز ہے؟ اقبال کی زبان سے سنئے:۔

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ | لرزد از نیروئے او ابلیس و مرگ

جبر دینِ مردِ صاحب ہمت است — جبر مرداں از کمالِ قوت است

پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر — جبر مردِ خام را آغوشِ قبر

جبرِ خالدؓ عالمے برہم زند

جبرِ ما بیخ و بُنِ ما برکند

گلشنِ رازِ جدید میں آپ نے اس مسئلہ کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

چہ می پرسی چہ گون است و چہ گون نیست — کہ تقدیر از نہادِ او برون نیست

چہ گویم از چگون و بے چگونش — برون مجبور و مختار اندرونش

چنیں فرمودہ سلطانِ بدرؑ است — کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است

تو ہر مخلوق را مجبور گوئی — اسیرِ بندِ نزد و دور گوئی

ولے جاں از دمِ جاں آفرین است — بچندیں جلوہ ہا خلوت نشین است

ز جبرِ او حدیثے درمیان نیست — کہ جاں بے فطرتِ آزاد جاں نیست

شبیخون بر جہانِ کیف و کم زد — ز مجبوری بہ مختاری قدم زد

سید الطاف حسین صاحب لکھتے ہیں "میں نے کہا۔ ایک پریشانی ہے جسے رفع کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہیے؟ ۔ میں نے عرض کی "نکلسن نے عربوں کی ادبی تاریخ میں قرآن شریف کی دو آیتوں کا انگریزی ترجمہ کر کے ثابت کیا ہے کہ ان کے معانی میں کامل تضاد ہے۔ ایک آیت کا مطلب ہے کہ انسان جو چاہے کرے اور دوسری کا یہ کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آیات مجھے یاد نہیں مگر ان کے معانی قریب یہی ہیں"۔ فرمانے لگے "جب نکلسن نے کتاب شائع کی تھی، تو میں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اُسے لکھا تھا کہ یہ تضاد کی بکواس کیسی۔ جسے

کم تضاد کہہ رہے ہو وہ حقائقِ زندگی کے عین مطابق ہے۔" میں نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! میں نہیں سمجھا کہ حقائقِ زندگی کے مطابق ہونے سے آپ کی کیا مُراد ہے؟" کہنے لگے "کیا ہر انسان خود کو بعض لمحات میں مختارِ کامل اور بعض میں بالکل مجبور محسوس نہیں کرتا؟" میں نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے "تو بس یہی میرا مطلب ہے۔ حقیقت کوئی یک رنگ چیز نہیں بلکہ ایک مختلف الالوان مرکب ہے۔" میں نے پوچھا "قبلہ! اس میں کیا مصلحت ہے کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ کیوں نہ ہمیں بالکل مجبور یا مختار بنایا گیا؟" مسکرا کر فرمانے لگے "اس کی مصلحت سے تو وہی واقف ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ البتہ انسانی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ آدمی اپنی مجبوریوں پر غالب آتا رہے۔ احوالِ زندگی کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی تقدیر تک پہنچ رہا ہے۔"[1]

وحدت الوجود

"حکمائے یورپ کہتے ہیں کہ عالم میں تین چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔ مادہ، قوت، عقل۔ یہ عقل تمام اشیاء میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح انسان کے بدن میں جان۔ اسی عقل کا اثر ہے کہ تمام سلسلۂ کائنات میں ترتیب اور نظام پایا جاتا ہے۔ غرض تمام عالم ایک شخص واحد ہے، اور اس شخص واحد میں جو عقل ہے وہی خدا ہے۔ جس طرح انسان باوجود متعدد الاعضا ہونے کے ایک شخص واحد خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح عالم باوجود ظاہری تعدد اور تجزیہ کے شے

[1] ملفوظاتِ اقبال

واحد ہے، اور جس طرح انسان میں ایک ہی عقل ہے، اسی طرح تمام عالم کی ایک عقل ہے اور اسی کو خدا کہتے ہیں[1]۔"

خواجہ میر دردؒ فرماتے ہیں کہ "وحدت وجود کے فقط یہ معنی ہیں کہ موجود بالذات صرف وہی ہے اور یہ معنی نہیں کہ واجب اور ممکن کی ماہیت ایک ہے، اور عبد اور معبود ایک دوسرے کا عین ہیں ...... وحدت شہود کے معنی یہ ہیں کہ ذات واجب کے بغیر موجودات ممکنہ کا وجود نہیں ہو سکتا اور موجودات اسی ایک ذات کے نور سے موجود ہیں .... کیفیت اور حال کے اعتبار سے دونوں کا مقصود ایک ہی ہے یعنی قلب کا ماسوا کی گرفتاری سے آزاد کرنا۔ پس اگر کوئی ان دونوں کیفیات میں سے کسی ایک یا دونوں سے مشرف ہو جائے تو ایک ہی بات ہے ..... خدا قائم اور موجود بالذات ہے اور موجودات خارج میں ہے نہ کہ وجود کلی طبیعی کی طرح ان کے ضمن میں ہیں۔ حق یہ ہے کہ وجود باری بنفس خود قائم ہے مع اپنی صفات کے جو اس کے کمالات ہیں، اور موجودات ممکنہ کے پیدا ہونے سے اس کی ذات میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا، ان کے نابود ہونے سے کوئی کمی نہیں ہوتی[2]۔"

"فلسفیوں نے وحدت فی الکثرت کو بگاڑ کر یا تو اسے حلول بنا دیا ہے یا اتحاد۔ بعض کہتے ہیں خدا ایک غیر فانی اور ابدی حقیقت ہے اور وحدت فی الکثرت کی رو سے فانی اور عارضی عالم خدا میں جذب ہو جاتا ہے یہی اتحاد ہے یعنی یہ کہ حقیقت باری کے لحاظ سے عالم ایک فریب شہود ہے۔ بعض دوسروں کا خیال ہے

---

[1] سوانح مولانا روم مصنفہ علامہ شبلی مرحوم ٭ [2] نظریہ توحید از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

کہ سارا عالم ہی وحدت ہے تو خدا عالم میں مل کر غائب ہو جاتا ہے۔ اور وحدت فی الکثرت حلول بن کر رہ جاتی ہے۔ امام غزالی رح نے تصوف کے اس نظریۂ وحدت فی الکثرت کی حمایت کرتے ہوئے فلسفہ کی اس تشریح اتحاد و حلول کا رد کیا ہے:-

"وگروہے ازاینجا غلط کردہ اند۔ و ایں معنی را بحلول عبارت کردہ اند۔ وگروہے باتحاد۔ و ایں ہم چناں بود کہ کسے ہرگز آئینہ ندیدہ باشد و دراں نگرد، صورت خود بہ بیند پندارد کہ وے در آئینہ فرود آمدہ یا پندارد کہ آں صورت خود صورت آئینہ است کہ صورت آئینہ خود آنست کہ سرخ و سپید شود اگر پندارد کہ در آئینہ فرود آمد ایں حلول بود، و اگر پندارد کہ آئینہ خود صورت او باشد ایں اتحاد بود، و ہر دو غلط باشد بلکہ ہرگز آئینہ صورت نشود و صورت آئینہ نگردد۔" (کیمیائے سعادت)

مطلب یہ ہے کہ دو جماعتیں ہیں جو صوفیہ کے اس عقیدے کو اتحاد اور حلول سے تعبیر کرتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی نے آئینہ نہ دیکھا ہو اور اس میں اپنی صورت دیکھ کر کہے کہ وہ آئینے کے اندر سما گیا ہے۔ اسی کو حلول کہتے ہیں۔ دوسرا شخص اپنی صورت آئینے میں دیکھے اور سمجھے کہ آئینہ ہی اس کی صورت ہے اسی کو اتحاد کہتے ہیں، اور دونوں خیالات غلط ہیں۔ امام غزالی رح نے اس کے بعد اصل حقیقت یہ بتائی ہے کہ جب صوفی کے دل سے تمام چیزوں کی معرفت دور ہو جاتی ہے تو تمام چیزیں اس کے نزدیک بمنزلہ "نیست" کے ہیں، اور جب اپنے سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے تو اپنے حق میں بھی وہ نیست ہو گیا، اور جب حق تعالے اور ذکر حق تعالیٰ کے سوا کچھ نہ رہا تو جو فانی تھا وہ ختم ہو گیا اور جو باقی تھا وہ رہ گیا

یہ ہے وحدت فی الکثرت کی حقیقت۔[۱]

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ کائنات ذاتِ خدا سے علیحدہ نہیں بلکہ اسی کے مظاہر کا نام عالم ہے۔ قرآن کی آیات بھی اسی حقیقت پر شاہد ہیں هُوَ الْاَوَّلُ، هُوَ الْاٰخِرُ، هُوَ الظَّاهِرُ، هُوَ الْبَاطِنُ۔ دُنیا ذاتِ باری کی مختلف صورتوں کا نام ہے۔ موجود صرف وہی ہے۔ یہ تعدد محض اعتباری و فرضی ہے۔ اقبال بھی وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اپنے اندازِ بیان میں اس مسلک کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں مگر جوش میں آ کر اصل حقیقت بھی کہہ جاتے ہیں:۔

گفت آدم؟ گفت از اسرارِ اوست — گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست

در وجودِ او نہ کم بینی نہ بیش — خویش را بینی ازو او را ز خویش

جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست — کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است — فراقِ ما فراق اندر وصال است

چند مقامات پر اقبال نے اس حقیقت کو زیادہ وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے:۔

جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو — یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو

عیش از عیشش غمِ تو از غمش — زندہ از انقلابِ ہر دمش

واحد است و بر نمی تابد دوئی — من ز تابِ او من استم تو توئی

خویش دار و خویش باز و خویش ساز — نازہا می پرورد اندر نیاز

نقش گیر اندر دلش او می شود — من ز ہم می ریزد و تو می شود

---

[۱] ملخص از انتخاب دیوانِ شمس تبریز رح

من از رمز انا الحق باز گویم
دگر با هند و ایران راز گویم

مغی در حلقهٔ دیر این سخن گفت
حیات از خود فریبے خورد و "من" گفت

خدا خفت و وجود ما ز خوابش
وجود ما نمود ما ز خوابش

مقام خفت و بیداری و چار سو خواب
سکون و سیر و شوق و جستجو خواب

دل بیدار و عقل نکته بین خواب
گمان و فکر و تصدیق و یقین خواب

ترا این چشم بیدارے بخواب است
ترا گفتار و کردارے بخواب است

چو او بیدار گردد دیگرے نیست
متاع شوق را سوداگرے نیست

. . . .

خودی را حق بدان باطل مپندار
خودی را کشت بے حاصل مپندار

خودی چون پخته گردد لازوال است
فراق عاشقان عین وصال است

. . . .

بخود گم بہر تحقیق خودی شو
انا الحق گوے و صدیق خودی شو

"رسالت" کے عنوان کے ذیل میں "سرکار دو عالم صلعم" کے مرتبہ کی توضیح میں جو اشعار درج کیے جا چکے ہیں۔ ان کو بھی پڑھئے اور حقیقت کو پانے کی کوشش کیجئے۔

سیاست

دین و سیاست

مفکرین کے لئے یہ مسئلہ کافی پیچیدہ رہا ہے کہ سیاست مذہب سے جدا ہے یا اس میں شامل ہے۔ اکثر حکماء کی رائے ہے کہ سیاست اور دین دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر یہ رائے غلط ہے۔ وہ مذہب مذہب ہی نہیں جو انسان کی مکمل اصلاح اور تربیت نہ کر سکے۔ جس قدر تہذیبِ اخلاق ضروری ہے، اسی قدر تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن لازم ہے۔ ظاہری اور مادی دُنیا کی فلاح و بہبود کے لئے ان دونوں کا علم اور پھر اس کے مطابق عمل واجب ہے۔ روح جسم سے وابستہ ہے۔ اس لئے روحانی تزکیہ کے ساتھ جسمانی تصفیہ اور باطن کی ترقی کے ساتھ ظاہر کی اصلاح ضروری ہے۔ جن ادیان نے صرف صفائے باطن اور ترقیِ رُوح کا سبق پڑھایا، وہ بھی اسی طرح ناقص اور ناپائدار تھے۔ جس طرح وہ مذاہبِ باطلہ جنہوں نے صرف مادی ترقیات اور ظاہر کے نشو و نما کا سبق دیا، اور باطن اور روح کی طرف سے بے اعتنائی برت کر ان کو نظر انداز کر دیا۔ مغرب اور عالمِ عیسویت آج اسی غلطی کے شکار ہیں۔ کلیسا و سیاست کو دو متضاد اور متناقض اشیاء سمجھنے کی بدولت مغرب کی سیاست خلل و فساد کا منبع بن گئی ہے۔ جس طرح درخت بغیر جڑ کے نشو و نما نہیں پا سکتا۔ اسی طرح سیاست بغیر اصولِ دین کے پائدار نہیں رہ سکتی۔ اقبال کا نظریہ بھی یہی ہے۔ سیاستِ مغرب پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں:-

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں　　کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد | فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اُن کی | تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسا کے سفیر

اسلام نے اِس عقدۂ مشکل کا حل یہ بتایا ہے کہ دین اور سیاست کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ آنحضرت صلعم کی زندگی دُنیا کے عمل کا واحد معیار ہے۔ سرکارِ دوعالمؐ دین و دنیا کے یکساں شہنشاہ تھے، اور آپؐ نے ان دونوں کے امتزاج کو عملی صورت میں پیش کر کے تمام دُوسرے نظریوں کے بُطلان کو بخوبی ثابت فرما دیا ہے۔ مسلمانوں نے کبھی اس اصُول پر شک نہ کیا، اور ان کی تیرہ سَو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان جب تک اِس قانونِ الٰہی پر کاربند رہے، ترقی اُن کے قدم چومتی رہی۔ یہ نئی روشنی کی نحوست ہے کہ مسلمانوں کے اس عقیدہ میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے، اور وُہ اپنے زرّیں اصُول کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے کشکولِ گدائی پھیلاتے، اور ان کے پس خوردہ کو من و سلویٰ جان کر اُدھر ہاتھ بڑھاتے ہیں۔

جب مریدِ ہندی پیرِ رومی کے سامنے اپنی یہ مشکل پیش کرتا ہے :-

آسمانوں پر مرا فکرِ بلند | مَیں زمیں پر خوار و زار و دردمند
کارِ دُنیا میں رہا جاتا ہوں مَیں | ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں مَیں
کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں؟ | ابلہِ دُنیا ہے کیوں دانائے دیں؟

تو پیرِ رومی جواب دیتا ہے :-

آنکہ بر افلاک رفتارش بود | بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

اور زیادہ وضاحت سُنیئے :-

کلیسا کی بُنیاد رہبانیت تھی | سماتی کہاں اس فقیری میں میری

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

گلشنِ رازِ جدید میں اس مسئلہ کو اقبال نے اور بھی توضیح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ماسوا کے طلسم کو توڑ ڈالو۔ خودی کا عرفان حاصل کرو۔ خدا کی معرفت طلب کرو۔ جب اس طرح دونوں عالم تمہارے فتراک میں آجائیں اور تم پر تسخیرِ آفاق آسان ہو جائے تو :—

خنک روزے کہ گیری ایں جہاں را — شگافی سینۂ آسماں را
گذارد ماہ پیشِ تو سجودے — برو پیچی کمند از موجِ دودے
دریں دیرِ کہن آزاد باشی — بتاں را بر مرادِ خود تراشی
بکف بردن جہانِ چار سو را — مقامِ نور و صوت و رنگ و بو را
فزونش کم کم او بیش کردن — دگرگوں بر مرادِ خویش کردن
برنج و راحتِ او دل نہ بستن — طلسمِ نہ سپہر او شکستن

فرو رفتن چو پیکاں در ضمیرش | ندادم گندم خود با شعیرش

شکوهِ خسروی این است ، این است

ہمیں ملک است کو توام بدین است

نظامِ سلطنت

ملوکیت و استبدادیت خلل و فساد کی جڑ سمجھی گئی ہے۔ اِسی لئے نظامِ سلطنت ہمیشہ رنگ بدلتا رہا ہے۔ جمہوریت کو اس مشکل کا حل سمجھا گیا تھا۔ مگر موجودہ جمہوری نظام بھی سبھی ناقص ثابت ہوئے، اور حکماء نے ان کو بھی دُنیا کا مشکل کشا نہ مانا۔ علامہ اقبال بھی اِن سب نظاموں کو ناقص اور مضر سمجھتے اور بتاتے ہیں، اور سختی سے اِن آمرانہ و قاہرانہ اصُولوں کی مذمت کرتے ہیں جن پر استبدادیت اور جمہوریت کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ ملوکیت سے اجتناب و احتراز کی تعلیم دیتے ہیں:۔

ہم ملوکیت بدن را فربہی است | سینۂ بے نُور او از دل تہی است

مثل زنبورے کہ بر گل می چرد | برگ را بگزارد و شہدش برد

شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں | بر جمالش نالۂ بلبل ہماں

از طلسم رنگ و بُوئے او گزر | ترک صُورت گوے در معنی نگر

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است

گُل مخواں او را کہ در معنی گِل است

فرعون کی زبان سے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں:۔

اے جہانداراں سوئے من بنگرید | اے زیاں کاراں سوئے من بنگرید
وا نئے قومے از ہوس گردیدہ کور | می برد لعل و گہر از خاک و گور
پیکرے کو در عجائب خانہ ایست | بر لب خاموش او افسانہ ایست
از ملوکیت خبر ہا میدہد | کور چشماں را نظر ہا میدہد
چیست تقدیر ملوکیت؟ شقاق | محکمی جستن ز تدبیر نفاق
از ید آموزی زبوں تقدیر ملک | باطل و آشفتہ تر تدبیر ملک

باز اگر بینم کلیم اللہ را
خواہم از وے یک دل آگاہ را

فرعون کی اس داستان کو سن کر مولانا رومؒ کی زبان سے مزید تبصرہ فرماتے ہیں:-

حاکمی بے نور جاں خام است خام | بے ید بیضا ملوکیت حرام
حاکمی از ضعف محکوماں قوی است | بیخش از حرمان محروماں قوی است
تاج از باج است و از تسلیم باج | مرد اگر سنگ است می گردد زجاج

فوج و زندان و سلاسل رہزنی است
او ست حاکم کز چنیں ساماں غنی است

علامہ جمال الدین افغانی کی زبان سے کہلواتے ہیں:-

غیر حق چوں ناہی و آمر شود | زور ور بر ناتواں قاہر شود
زیر گردوں آمری از قاہری است | آمری از ما سوا اللہ کافری است
قاہر آمر کہ باشد پختہ کار | از قوانیں گرد خود بندد حصار

جرّہ شاہیں تیز چنگ و زود گیر | صعوہ را در کار ہا گیرد مشیر
قاہری را شرع و دستورے دہد | بے بصیرت سرمہ با کورے دہد
حاصلِ آئین و دستورِ ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

اور دیکھئے:۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ المُلُوکَ | سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر | پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز | دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

عصرِ حاضر کی جمہوریت کو بھی اقبال ملوکیت کی لعنت سے مماثل پا کر اس کی مخالفت میں آواز بلند کرتے ہیں:۔

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ | مُردہ تر شُد مُردہ از صُورِ فرنگ
حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد | از اُمم بر تختۂ خود چیدہ نرد
شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر | ہر زماں اندر کمینِ یک دگر
فاش باید گفت سرِّ دلبراں | ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں
دیدہ ہا بے نم ز حُبِّ سیم و زر | مادراں را بارِ دوش آمد پسر
وائے بر قومے کہ از بیمِ ثمر | می بر دنم را ز اندامِ شجر
تا نیارد زخمہ از تارش سرود | می کشد نازادہ را اندر وجُود

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام | جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ——— تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق ——— طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں ——— یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

متاع معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی ——— ز موراں شوخی طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

ملوکیت اور جمہوریت دونوں میں جبر و تشدد کے سوا کچھ نہیں حصول زر اور ہوس مال ان کا ایمان ہوتا ہے اور محکوم رعایا کو خواب سے بیدار نہ ہونے دینا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جوع الارض کے لئے جنگ کرنا ان کے نزدیک ادنیٰ بات ہے۔ اقبال سختی سے اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اقوام غالب کو اس تعدی پر متنبہ کرتے ہیں:۔

گفت شیخ "این ز حق سلطان ماست" ——— آنکہ در پیراہن شاہی گداست
حکمران مہر و ماہ و انجم است ——— شاہ ما مفلس ترین مردم است
دیدہ بر خوان اجانب دوخت است ——— آتش جوعش جہانے سوخت است
قحط و طاعون تابع شمشیر او ——— عالمے ویرانہ از تعمیر او
خلق در فریاد از ناداریش ——— از تہی دستی ضعیف آزاریش

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انساں کارواں او رہزن است

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام
می کند تاراج را تسخیر نام

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیرِ جوع او دو نیم

آتشِ جانِ گدا جوعِ گدا است
جوعِ سلطاں مُلک و مِلّت را فنا است

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

اٹلی کو ابی سینیا پر حملہ آور پا کر کہا تھا :-

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

ہونے کو ہے یہ مُردۂ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش

پیرِ کلیسیا یہ حقیقت ہے دل خراش

اِس سلسلہ میں یہ امر بھی لائقِ ذکر ہے کہ اقبال جنگ کے سخت خلاف ہیں۔ علامہ مرحوم نے اپنے خط میں جو آپ نے پروفیسر ظفر احمد صدیقی ایم اے (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو موصوف کی نظم کے جواب میں لکھا تھا جنگ کے نظریہ پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ خط علی گڑھ میگزین کے اقبال نمبر میں شائع ہو چکا ہے ضروری حصّہ یہاں نقل کرتا ہوں :-

" . . . . مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین

کے لئے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خود کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ . . . . "

"معترض کا یہ کہنا کہ اقبالؔ اس دورِ ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے۔ مَیں جنگ کا حامی نہیں ہوں۔ نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معیّنہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رُو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور اُن کو گھروں سے نکالا جائے مسلمان کو تلوار اُٹھانے کی اجازت ہے[1]

[1] مَیں نے حکمِ جہاد کے مسئلہ کو اپنی تصنیف "سرکارِ دو عالم" میں ذرا وضاحت سے لکھا ہے۔ وہاں سے یہ مختصر تفصیل نقل کرتا ہوں:-

"اسلام کو آئے چودہ سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مکّہ میں مسلمانوں نے جس قدر تکلیفیں اُٹھائیں ان کا ذکر ہو چکا۔ مدینہ میں ان کو ستانے کی جو سازشیں کی گئیں، اُن کا حال آگے آتا ہے، مگر اب تک مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ جب قریش نے مدینہ میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور برسرِ جنگ ہوئے تو جہاد کی اجازت ملی۔ اس اجازت کی مصلحت خود خدا نے بتا دی۔ جہاد کے لئے جو حکم سب سے پہلے نازل ہوا وہ "سورۂ حج" میں موجود ہے۔ اس میں خود اس بات کی صراحت ہے کہ مسلمان لڑائی کے لئے تیار ہوئے تو وہ لڑائی جارحانہ نہ تھی بلکہ مدافعانہ اور حفاظتِ خود اختیاری کے لئے تھی۔ خدا نے فرمایا کہ "تم کو لڑائی کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ تم مظلوم ہو اور تم کو صرف خدا کی پرستش کے جرم میں وطن سے نکلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادتگاہیں اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔" یہ آخری بات بتاتی ہے کہ جہاد کے حکم میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے یہود اور دیگر اقوام سے جو معاہدے مذہبی آزادی اور امنِ عامہ کے لئے کئے تھے اور قریش جن کو پامال کرنے کے درپے تھے، ان کی حفاظت کی جائے کیونکہ جب کوئی قوم معاہدہ کا پاس کرنے والی نہ رہے گی تو مذہب اور عبادتگاہوں کی کون حفاظت کریگا۔ اسی لئے جہاد کی دوسری آیت میں بھی خدا نے یہی حکم دیا کہ "صرف ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑنے آئیں"۔ اس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسلمان جنگجو نہ تھے بلکہ ان کو لڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ (سرکارِ دو عالم ص ۸۸-۸۹)

(۲) حکم۔ دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۹: ۴۹[1] میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں (Collective Security) کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اگر گزشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دُنیا میں جمعیتِ اقوام کو بنے ہوئے آج کئی صدیاں گزر گئی ہوتیں۔ جمعیتِ اقوام جو زمانۂ حال میں بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے، کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں کسی اور جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس دین کی اشاعت کے لئے تلوار اُٹھانا بھی حرام ہے . . . ."

---

[1] پارہ ۲۶۔ سورۂ الحجرات، پہلا رکوع، نویں آیت۔ پوری آیت اور اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ وَ اِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ (ترجمہ) "اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں باہم صلح کرا دو۔ لیکن اگر ایک دُوسرے پر تعدّی کرے تو اس جماعت سے جو تعدّی کرتی ہے قتال کرو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اگر وہ رجوع کر لے تو دونوں میں عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرا دو۔ بے شک خدا تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔

اس آیت کا مقتضا صراحتہً یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے افراد باہمی اخوت و محبت کی بنیاد پر مظلوم بھائیوں کی مدد کرنے پر مامور من اللہ ہیں۔ ایسے نزاعی امور میں سمجھوتہ اور صلح کرا دینے کا حکم شدت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ایک جماعت بغی و عُدوان پر ہی آمادہ ہو تو اس کے خلاف جہاد فرض ہے۔ اگر وہ جماعت پھر بھی حکمِ خدا کے سامنے سر جھکا دے تو لڑائی سے ہاتھ کھینچ کر مصالحت کرا دینا ضروری ہے۔ اگر اُمتِ مسلمہ اس حکمِ خداوندی کو یاد رکھتی تو ہرگز موجودہ تشتت و افتراق کی نوبت نہیں آسکتی تھی۔

اِس خط کے آخری ارشادات کی تشریح خواجہ عبدالوحید صاحب کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں :- "باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو شروع ہوگئی۔ میں نے پوچھا کہ جہاد جارحانہ ہونا چاہیئے یا دفاعی۔ فرمانے لگے کہ عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بوقتِ ضرورت جارحانہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی قوم کی بد اخلاقی اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہوجائے تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ بزورِ شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے چنانچہ سلطان شہید ٹیپو رہ نے مالابار کے غیر مسلم وحشی باشندوں سے کہا تھا کہ تم لوگ بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کردو۔ ورنہ میں بزورِ شمشیر تمہیں کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا۔"[1]

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر　　مرگِ پورِ مرتضیٰؓ چیزے دگر

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است　　جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است

جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست　　ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت　　جنگ را رہبانی اسلام گفت

کس نداند جز شہید این نکتہ را

کو بخونِ خود خرید این نکتہ را

علامہ اقبال جس سلطنت کے قائل و معترف ہیں اور جس کو دُنیا کے پُرامن نظم و نسق کا واحد وسیلہ جانتے ہیں۔ اس کی تفصیل بھی دیکھئے۔

اسلامی نظریۂ سلطنت قرآن سے ماخوذ ہے :-

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　من بجز عبرت ندیدم از فرنگ

[1] ملفوظاتِ اقبال

اے بتقلیدش اسیر آزاد شو — دامن قرآں بگیر آزاد شو

قرآن کہتا ہے: لَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ (حکومت میں کوئی خدا کا شریک نہیں)۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں)۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں کی اور زمین کی حکومت خدا ہی کی ہے)۔ اَلَا لَهُ الْحُکْمُ (آگاہ رہو کہ حکومت خدا ہی کی ہے۔)

اقبال اپنے انگریزی خطبات میں لکھتے ہیں "اسلام بحیثیت ایک نظام سلطنت کے اس اصول (یعنی توحید) کو انسانوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لئے ہے، نہ کہ بادشاہ اور تاج کے لئے۔ اور چونکہ خدائے تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس ہے۔ اس لئے اس کی وفاداری اور فرماں برداری کا دراصل یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی اعلیٰ فطرت کی فرماں برداری کرتا ہے۔" (صفحہ ۱۴۰)

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

سید الطاف حسین صاحب ملفوظاتِ اقبال میں لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر صاحب نے اسلامی نظامِ سیاسی پر اظہارِ خیالات کی ابتدا کرتے ہوئے کہا کہ انسان ایک فردِ یکتا یا گوہر یکتا ہے جس کی ترکیب روح اور مادے سے ہوئی ہے۔ لہٰذا ہر وہ نظامِ حکومت جو محض انسان کی جسمی یا مادی ضروریات کو پورا کر سکے انسان کی تشفی نہیں کر سکتا، اور نہ ہی نوعِ انسانی اس نظام کے وضع کردہ راستے پر گامزن ہو کر ارتقائی سیادت سے بہرہ اندوز ہو سکتی ہے۔ اسلام دین و سیاست میں تفریق اسی لئے روا نہیں رکھتا کہ انسان کی ہیئت ترکیبی ان ہر دو عناصر کے امتزاج کی متقاضی

ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت نہ جمہوریت ہے نہ ملوکیت Aristocracy ہے اور نہ Theocracy ہے۔ بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزّہ ہے۔" [1]

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام اورا نہ اوکس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقل خودبیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف — وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

خدا اور قرآن کے بتائے ہوئے اس نظام میں کوئی فرد دوسرے کا غلام نہیں ہوتا۔ خیر و شر، جزا و سزا، رسم و راہ، آئین و اصول سب کا مرکز احکامِ خداوندی ہوتے ہیں۔ افراد کو بے سبب تفوّق و مراعات حاصل نہیں ہوتے۔ خویش و بیگانہ سب کی فلاح و بہبود ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں ہوتی۔ ایسی سلطنت میں حاکم بھی وہی ہوتا اور ہو سکتا ہے جو "مردِ مومن" ہو اور جس میں "اسلامی فقر" پایا جائے، جو ان صفات سے مزیّن نہ ہو اسے اسلامی نظام میں کوئی اقتدار نہیں دیا جا سکتا۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا — یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

[1] ملفوظاتِ اقبال

اسلامی سلطنت کا حاکم، قوانینِ الٰہی کا محافظ اور حقوق عوام کا پاسبان ہوتا ہے، افراد کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترقی دینا جماعتوں کے حقوق اور مفاد کی نگہداشت کرنا اس کا معمول ہوتا ہے۔ انصاف، راستی، مساوات، محبت، اطاعت احکامِ خداوندی اور اتباعِ اُسوۂ رسول اس کے نصب العین ہوتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خطبۂ خلافت میں ارشاد فرمایا تھا: "اے لوگو! میں تمہارا امیر مقرر کیا گیا ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرنا، اور اگر میں بُرے کام کروں تو تم مجھے متنبہ کرنا۔ راستبازی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو کمزور ہو، وہ بھی میرے لئے قوی ہے جبتک کہ میں اس کا حق اس کو نہ دلوا دوں، اور قوی بھی کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے کمزور کا حق نہ لے لوں تم اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک کہ میں خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتا رہوں، اور جب میں خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم پر میری فرمانبرداری ضروری نہیں"۔

فاش گویم با تو اے والا مقام — باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اُولی الامرے کہ منکم شانِ اوست — آیۂ حق حجّت و برہانِ اوست
یا جواں مردے چو صرصر تند خیز — شہر گیر و خویش باز اندر ستیز
روزِ کیں کشور کشا از قاہری — روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

علّامہ کو افسوس ہے کہ ملّتِ اسلامیہ نے قرآن سے اعتصام نہ کیا۔ سیرتِ رسول کو خضرِ راہ نہ بنایا۔ خدا کی بتائی ہوئی راہوں سے تجاوز کیا، اور ملوکیت کا بُت جسے خود اسی نے توڑا تھا پھر بنا ڈالا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد — در ایاغ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

غلامی و آزادی

اسلام اور غلامی دو متضاد چیزیں ہیں۔ آنحضرت صلعم نے اپنے اقوال و اعمال سے تمیز بندہ و آقا قطعاً مٹا دی۔ مسلمان آزاد پیدا ہوتا ہے اور آزاد مرتا ہے غلامی کی نحوست ہرگز اس کو گوارا نہیں ہوتی۔ غلامی دین و دنیا سب کو مسخ کر دیتی ہے۔ جسم اور رُوح دونوں کی ترقیات مسدود ہو جاتی ہیں، اور غلام آقا کے سامنے اور محکوم حاکم کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگتا ہے، اس کی زبان، کردار، خیال، دماغ، ضمیر، سب بدل جاتے ہیں، اور وہ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح مالک کے اشاروں پر حرکت کرتا، سوچتا اور بولتا ہے۔

اقبالؔ نے اسی فطری و مذہبی حقیقت کو شد و مد کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ وہ غلامی کو مہذب دُنیا کی بدترین لعنت جانتے ہیں، اور آزادی کو انسان کا فطری

حق خیال کرتے ہیں۔ اِس لیئے اُن کی تعلیمات میں تبلیغِ حرّیت کا عنصر ہر جگہ پایا جاتا ہے
علاّمہ کے نزدیک غلامی انسان کے قلب وضمیر اور طبیعت وفطرت تک
کو بدل دیتی ہے اور اس لیئے اس سے بڑی کوئی لعنت اور نحوست نہیں ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہُوا ۔۔۔ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

از غلامی دل بمیرد در بدن ۔۔۔ از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی ضعفِ پیری در شباب ۔۔۔ از غلامی شیرِ غاب افگندہ ناب
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد ۔۔۔ این و آں با این وآں اندر نبرد
از غلامی مردِ حق زنّار بند ۔۔۔ از غلامی گوہرش ناارجمند

در جوانی تن ز جاں گردد تہی ۔۔۔ از تنِ بے جاں چہ اُمیدِ بہی
ذوقِ ایجاد و نمود از دل رود ۔۔۔ آدمی از خویشتن غافل رود
جبرئیلے را اگر سازی غلام ۔۔۔ بر فتد از گنبدِ آئینہ فام
کیش او تقلید و کارش آذری است ۔۔۔ نُدرت اندر مذہب او کافری است

در غلامی عشق و مذہب را فراق ۔۔۔ انگبینِ زندگانی بد مذاق
در غلامی عشق جز گفتار نیست ۔۔۔ کارِ ما گفتار ما را یار نیست
دین و دانش را غلام ارزاں دہد ۔۔۔ تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
گرچہ برلب ہائے او نامِ خدا است

قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست

غلام افراد اور غلام اقوام دینی و دنیوی معاملات میں ہر طرح ناقابلِ اعتبار ٹھہرتے ہیں۔ ان کا خیال و فکر ان کو گمراہی و ضلالت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اور ان کے اعمال و افعال تک اس غلامانہ ذہنیت کے ماتحت کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں

پھر دیکھ نہیں سکتے غلامی کی بصیرت — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے — غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم — کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
از غلامی لذتِ ایماں مجو — گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

غلام قوم کے لیڈر، حکماء، علماء، شعراء سب غلامی کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں، اور اس لئے ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ ملت کی آنکھوں سے اس پردے کو دور نہ ہونے دیں :۔

شاعر بھی ہیں پیدا، علما بھی حکما بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب — کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ | دیکھتے ہیں فقط اِک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید | قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیمِ الٰہی

ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام | حُریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دیں در رُبود | از وجودش ایں قدر دانم کہ بُود
ایں زخود بیگانہ ایں مستِ فرنگ | نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

. . . .

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر | از مقامِ او نداد او را خبر

اقبال کو حیرت ہے کہ انسان غلامی کیونکر قبول کرتا ہے جب کہ یہ امر خلافِ فطرت ہے۔ ایک مثال دے کر عبرت دلاتے ہیں:-

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد | گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است | من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

اسی لئے وہ غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں:-

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے | حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن | تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

آزادی میں اگر ہزاروں مصائب بھی جھیلنے پڑیں تو بھی آزادی کے لیے تکلیف دِہ اور صبر آزما سالہا سال اقبال کی نظر میں ایک لمحہ کی غلامی سے بہتر ہیں:-

شورہ بوم از نیشِ کژدم خارزار | مورِ او اژدر گزند عقرب شکار
صرصرِ او آتشِ دوزخ نژاد | زورقِ ابلیس را بادِ مُراد

آتشے اندر ہوا غلطیدۂ — شعلۂ در شعلۂ پیچیدۂ
آتشے از دُودِ پیچاں تلخ پوش — آتشے تندر غو و دریا خروش
در کنارش مارہا اندر ستیز — مارہا با کفچہ ہائے زہر ریز
شعلہ اش گیرندہ چوں کلبِ عقور — ہولناک و زندہ سوز و مُردہ نور

در چنیں دشتِ بلا صد روزگار
خوشتر از محکومیِ یک دم شمار

اقبال کو غلامی کی عبادت بھی موجبِ ننگ و عار نظر آتی ہے، اور وہ عبادت کو بھی مردانِ حُر ہی کے لئے مفید سمجھتے ہیں ا۔

تا غلامم در غلامی زادہ ام — ز آستانِ کعبہ دُور اُفتادہ ام
چوں بنامِ مصطفیٰؐ خوانم درُود — از خجالت آب می گردد وجُود
عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر — سینۂ تو از بتاں مانندِ دَیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بُو — از درُودِ خود میالا نامِ او"

عیدِ آزاداں شکوہِ مُلک و دیں — عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات — ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگِ اناالحق — آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست — خود مُردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

اقبال کی رائے میں آزادی ہی دینی و دنیوی فلاح بخشتی ہے۔ بندۂ آزاد علمی، عملی، فنی ہر قسم کی ترقیات کرنے کا اہل ہے۔ آزادی اس کے لیل و نہار کو بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتی ہے:۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

آزاد اور غلام کے موت و حیات تک کا معیار مختلف ہوتا ہے:۔

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام
مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام
ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ
زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست
مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

آزاد اور محکوم کا موازنہ علامہ کے الفاظ میں یہ ہے:۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت　　ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

اسی شدتِ احساس کے باعث اقبال کو افسوس تھا کہ وہ اس ملک میں کیوں پیدا ہوئے جہاں کے لوگوں کا ضمیر اس قدر بدل چکا ہے کہ وہ غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکالنے کا ارادہ بھی نہیں کرتے :-

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

قومیّت

قوم و ملّت کے نظریہ پر علامہ مرحوم نے اپنے اس معرکہ آرا مضمون میں جو مارچ ۱۹۳۸ء میں مختلف اخبارات میں شائع ہوا سیر حاصل تبصرہ فرمایا تھا۔ اس مضمون سے ضروری حصص اقتباس کر کے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

"میں نے . . . . لفظِ ملّت قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبان میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملّت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے میں نے اپنی تحریروں میں ملّت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے . . . .

"اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور اُن کی موجودہ اجتماعی ہئیتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے، تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقاید کا نام ہے، اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف "اسٹیٹ" ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ "دین" نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی اور پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے ایسا "دستور العمل" قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک "اُمت" کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔

کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے:۔

"ہم دلی از ہم زبانی بہتر است"

. . . .

"قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں اتّباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ "ملت" یا "اُمّت" وارد ہوا ہے۔ کسی خاص "قوم" کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا۔ اور یہ اتّباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ "ملت" نام ہے ایک دین کا، ایک شرع و منہاج کا۔ "قوم" چونکہ کوئی شرع دین نہیں، اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسّک کی ترغیب عبث تھی۔ کوئی گروہ ہو، خواہ وہ قبیلہ کا ہو، نسل کا ہو، ڈاکوؤں کا ہو، تاجروں کا ہو، ایک شہر والوں کا ہو، جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو، وہ محض گروہ ہے رجال کا یا انسانوں کا۔ وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے۔ قومِ نوحؑ، قومِ موسیٰؑ، قومِ لوطؑ لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اُس کی جانب بھی منسوب ہوگا مثلاً قومِ عاد، قومِ فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قومِ موسیٰ تھی وہاں قومِ فرعون بھی تھی قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ۔ لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا، وہاں وہ گروہ عبارت تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے، توحید تسلیم کرتے گئے، وہ اُس پیغمبر کی ملّت میں آ گئے، اُس کے

دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مُسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملّت کفّار کی بھی ہو سکتی ہے۔ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۔

" ایک قوم کی ایک مِلت یا اُس کا منہاج تو ہو سکتا ہے ۔لیکن مِلّت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام اور مِلل سے نکل کر ملّت ابراہیمیؑ میں داخل ہو گئے، ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ " قوم " سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اُمت کے لفظ سے۔

" ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک مَیں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مُسلمانوں کے لئے " اُمت " کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ . . . " قوم " رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت بہ اعتبار قبیلہ نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے ۔لیکن " ملّت " سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔گو یا مِلّت یا اُمت جاذب ہے اقوام کی۔ خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔

" عہدِ حاضر کے ہندوستان کے علمار کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ جو قرآن یا نبی اُمی صلعم کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا ۔بنی نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی ۔موحّد و مشرک ۔ اِس وقت سے لے کر دو ہی ملّتیں دُنیا میں ہیں، تیسری کوئی مِلّت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمیؑ اور دعوتِ اسمٰعیلؑ سے غافل ہو گئے ۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اِس ملّت کے بانیوں کی وُہ دُعا یاد

نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت اِن دونوں پیغمبروں نے کی تھی وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ۔

"کیا خدا کی بارگاہ سے "اُمّتِ مسلمہ" کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعی کا کوئی حصّہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ اُمّتِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملّت ہے اور وہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کی ہے۔

"اُمّتِ مُسلمہ" جس دینِ فطرت کی حامل ہے اس کا نام "دینِ قیّم" ہے۔ دینِ قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی تقویم ہے اُس گروہ کے امورِ معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ قرآن کی رُو سے حقیقی تمدّنی یا سیاسی معنوں میں "قوم" دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اِس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیرِ اسلام ہو نامقبول و مردُود ہے۔

"ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لئے قابلِ غور ہے کہ اگر "وطنیت" کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی؟ کیوں نہ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر معمولی ملّت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنا رکھا۔ اور کیوں نہ اُن کی دلجوئی کرتے رہے؛ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی

امور میں اُن کے ساتھ "قومیتِ وطنی" قائم رکھی؛ اگر اسلام سے مطلق آزادی مُراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس کہ آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبرِ خدا صلعم کے نزدیک اسلام "دینِ قیّم" اُمّتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ کر یا ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب اُمّتِ مُسلمہ کو بھی آزادی سے پھُولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطورِ مدافعت اُن سے نزاع درپیش آئی۔ محمدؐ (فداہُ ابی وامی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی، اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت بننے لگی، تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسُول اللہ صلعم کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ اُن کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب "اُمّتِ مسلمہ" یا "ملّتِ محمدیہ" بن گئے۔ پہلے وُہ "مُلک و نسب" کے گرفتار تھے، اب مُلک و نسب اُن کا گرفتار ہو گیا:

کسے کو پنجہ زد مُلک و نسب را | نداند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بُودے، محمدؐ | ندادے دعوتِ دیں بُولہب را

"حضُورِ رسالت مآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابُولہب یا ابوجہل یا کُفّارِ مکّہ سے یہ فرماتے کہ "تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک "وحدتِ عربیہ" قائم کی جا سکتی ہے"۔ اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ لیکن نبی آخرالزّماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔ نبوّتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک "ہیئتِ اجتماعیہ

انسانیہ" قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا، یا بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے اُن کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں "ابدیت" سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی۔ یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں پر پہنچنے تک معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دُور کرنے میں اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے اُن کو یک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے، وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ . . . .

. . . . . . "

. . . . انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا، خوں ریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا، کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن اور سلامتی پر مبنی ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ للعٰلمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خودساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے

پاک کر کے ایک ایسی اُمت کی تخلیق کی جائے جس کو اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ کا ارشاد صادق آ سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

" اس مضمون کو مَیں خاقانی کے ان دو شعروں پر ختم کرتا ہوں جن میں اُس نے اپنے ان معاصر حکمائے اسلام کو مخاطب کیا ہے، جو حقائق اسلامیہ کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں بیان کرنا فضل و کمال کی انتہا سمجھتے تھے۔ تھوڑے سے معنوی تغیر کے ساتھ یہ اشعار آجکل کے مسلمان سیاسی مفکرین پر بھی صادق آتے ہیں :۔

مرکب دیں کہ زادۂ عرب است داغ یونانش بر کفل منہید

مشتے اطفال نو تعلّم را لوح ادبار در بغل منہید"

اس توضیح سے معلوم ہو گیا کہ اقبال اس "ہئیتِ اجتماعیہ انسانیہ" کے قائم کرنے کی تبلیغ فرماتے ہیں، جو جغرافیائی حدود کی پابند نہیں، جو ہندوستان اور ایشیا، یورپ اور امریکہ ہی کا نہیں بلکہ تمام کائنات کا احاطہ کر سکتی ہے، اور جو اپنی ہمہ گیری کے باعث ہئیتِ اجتماعیہ کی تشکیل کا واحد حل ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ ہر جگہ "ملّتِ اسلامیہ" کے توسیع و استحکام اور بقا و دوام کے مبلّغ نظر آتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم کی ہجرت مدینہ سے یہ سبق کس خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں :۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد بر اساسِ کلمۂ توحید کرد

تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں مسجدِ ما شد ہمہ رُوئے زمیں

آنکہ در قرآں خدا اورا ستود آنکہ حفظِ جانِ او موعود بود

دشمناں بیدست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش

پس چرا از مسکنِ آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟

قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

معنیٔ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چوں فلک در شش جہت آباد شد

اسلام نے نسل و نسب اور ملک و رنگ کے امتیازات مٹا کر ایک "وحدتِ قومی" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ تمام ملتِ اسلامیہ باہم یک ذات و یک جہت ہے۔ اور یہ وہ اخوت ہے جس سے بہتر مثال آج تک تاریخِ عالم پیش نہ کر سکی۔ دیکھئے:-

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم

از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما

مستِ چشمِ ساقیٔ بطحا ستیم
در جہاں مثلِ مے و مینا ستیم

چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

برنسب نازاں شدن نادانی است
حکمِ او اندر تن و تن فانی است

ملتِ ما را اساس دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
پس ز بندِ این و آں وارستہ ایم

رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است — چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما — یک نما، یک بیں، یک اندیشیم ما
مدعائے ما مآلِ ما یکیست — طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم — یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ — وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ
فارغ از باب و ام و اعمام باش — ہمچو سلمانؓ زادۂ اسلام باش
گر نسب را جزوِ ملت کردۂ — رخنہ در کارِ اخوت کردۂ
عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتۂ عشق از نسب محکم‌تر است

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اُڑ گیا دُنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہگزر

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی، — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تُورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وُہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل، اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسُولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے مُلک و نسب پر انحصار
قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھُوٹا تو جمعیّت کہاں
اور جمعیّت ہُوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

یہ ہے وہ وحدتِ اسلامیہ اور ہیئتِ اجتماعیہ جس کی تبلیغ علامہ اقبال تمام عالم اور عام مسلمانوں کو کر رہے ہیں اور افراد کو بھی اسی جماعت میں شریک ہو جانے کی دعوت دیتے ہیں کہ ان کی ہیئتِ انفرادی بھی بغیر اس ہیئتِ اجتماعی کے برقرار نہیں رہ سکتی :-

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملّت است

تا توانی با جماعت یار باش رونقِ ہنگامۂ احرار باش

فرد می یابد ز ملّت انتظام ملّت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گُم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

وطنیّت

علّامہ مرحوم کے فاضلانہ "تاریخی" مقالہ سے جس کا اقتباس پچھلے صفحات میں درج ہو چکا ہے، "قومیت" کی بابت اسلام کا نظریہ واضح ہو گیا۔ علامہ بھی اسی اصول کی اشاعت کرتے تھے، لہٰذا "وطنیت" کا وہ نظریہ جس کی تبلیغ سیاستِ مغرب کی طرف سے ہوئی ہے، آپ اس کے شدید مخالف ہیں، اور اقوام و ملل کے حق میں اس کو سمِّ قاتل خیال کرتے ہیں، لیکن "وطنیت" کا یہ مفہوم کہ ہندی، عراقی، خراسانی، افغانی، المانوی، فرانسوی، رُوسی، مصری وغیرہ ہونے کے اعتبار سے ہر فرد کو اپنے وطنِ ولادت سے تعلّق اور نسبت ہے، اور اس لئے اس کو اپنے وطن کی خدمت کرنی چاہئے، اور قربانیوں سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ اس کے آپ قائل اور معترف ہیں۔ "ہندی ترانہ" لکھنے کے وقت بھی آپ کی رائے

یہی تھی، اور مارچ ۱۹۳۸ء میں وفات سے ڈیڑھ مہینہ پہلے جب آپ نے محوّلہ بالا مضمون سپردِ قلم کیا ہے، اس وقت بھی آپ کی رائے میں تغیر نہ ہوا تھا۔ "قومیت" اور "وطنیت" کے نظریوں کے اس اختلاف سے ناواقفیت کی بنا پر بعض ناقدین یا مخالفین نے علامہ کے الہاماتِ شعر میں تضاد و تناقض ثابت کرنا چاہا ہے حالانکہ یہ صورت ہرگز نہیں۔ مرتے وقت بھی آپ کو اپنے وطن سے وہی محبت تھی، جو اس سے چالیس برس قبل بعض "وطنی نظموں" کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔

"وطنیت" کے نظریہ کی بابت اقبال اپنے اسی مضمون میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، لکھتے ہیں:-

"............ میں نظریۂ وطنیت" کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں، جب کہ دُنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ "وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانہ کا اُلٹ پھیر بھی عجیب ہے۔ ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے، اب علما اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریے ان کے لئے جاذبِ نظر ہیں، مگر افسوس:-

تو نہ گرد کعبہ را رخت حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ارشاد کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"
قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایّام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصّہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ "وطن" کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ کل تک اہلِ برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں[1]۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے بعض نادان لوگ اس کی تائید میں حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَان کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں۔ بلکہ "وطن" ایک اصُول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا، اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصوّر ہے

---

[1] پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی بھی تو وطنی لحاظ سے جُدا ہو گئے۔ علامہ نے کس قدر صحیح کہا تھا ۔۔ "بود و باش کے لحاظ سے وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ"۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہم سب بجائے ہندوستانی کے پاکستانی کہلانے لگے ہیں ٭

چونکہ اسلام بھی بحیثیت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے، اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصوّر کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔"

اقبال نے "وطن" کے اس سیاسی تصوّر کو زہرِ ہلاہل جان کر سخت مخالفت کی ہے۔ اسی مضمون میں آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

". . . . . یورپ کا تجربہ دُنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس "وطن" کے تصوّر میں تلاش کی جائے۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اس انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دَور، اصولِ دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ۔ یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں؟ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف . . .

. . . . . زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے۔ مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں، بلکہ بہت سی اور قوتیں بھی ہیں جو اس قسم کی "قوم" کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً دین کی طرف سے بے پروائی، سیاسی روزمرہ مسائل میں انہماک اور علیٰ ہٰذا القیاس اَور دیگر مؤثرات جن کو مدبّرین اپنے ذہن سے پیدا کریں، تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوسکے . . . . . اگر ایسی قوم میں مختلف ادیان و ملل ہوں بھی تو رفتہ رفتہ وہ تمام ملّتیں مٹ جاتی ہیں، اور صرف "لادینی" اس قوم کے افراد میں وجہِ اشتراک رہ جاتی ہے۔ کوئی دینی پیشوا تو کیا ایک عام آدمی بھی جو "دین" کو انسانی زندگی کے لئے ضروری جانتا ہے نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورتِ حالات پیدا ہو۔ باقی رہے مسلمان، سو افسوس ہے

کہ ان سادہ لوحوں کو اس نظریہ وطن کے لوازم و عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین" اور "وطن" بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے یک جا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بر وقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو "لادینی" ہوگی، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی"

حضرتِ علامہ کے مضمون سے ان اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے، کہ آپ "وطنیت" کے سیاسی نظریہ کے مخالف کیوں ہیں، اور وطن کا وہ کون سا مفہوم ہے، جو آپ کو ہندوستان کی پستی و زبوں حالی پر آٹھ آٹھ آنسو رُلاتا ہے۔

"وطنیت" کے اس سیاسی تصوّر کی آپ نے انتہائی مخالفت فرمائی ہے:—

لردِ مغرب آں سراپا مکر و فن — اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت — دل نہ بندی با کلوخ سنگ و خشت
چیست دیں؟ برخاستن از روئے خاک — تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آں کہ گفت اللّٰہ ھُو
در حدودِ ایں نظامِ چار سُو

با وطن اہلِ وطن را نسبتے است — زانکہ از خاکش طلوعِ ملّتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر — نکتہ بینی ز مُو باریک تر

گرچہ از مشرق برآید آفتاب — با تجلی‌ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں — تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست — تا ہمہ آفاق را گیرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت "خاوری" است

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند — پیشِ پائے ایں بُتِ ناارجمند

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

اِس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حَرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

لیکن جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے ہم سب ہندوستانی ہیں[1]، اور اس لئے ہندوستان سے ہم سب کو محبت ہے۔ علامہ کی اس وطنی محبت کا ثبوت ان کی تصنیفات سے بخوبی ملتا ہے "ترانۂ ہندی" اور "قومی گیت" زبان زدِ خاص و عام

[1] حضرت علامہ کا نظریہ واضح کرنے کے لئے یہ الفاظ برقرار رکھنے مناسب ہیں، ورنہ اب ہم ہندوستانی کہاں پاکستانی ہیں۔

ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی نظموں میں جذباتِ وطنی جھلکتے ہیں۔ "وطنیت" کے اس جغرافیائی تصوّر کے لحاظ سے علاّمہ کو ملک کا درد اور دُکھ ہے۔ اور آپ اکثر ملک کی زبُوں حالی کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں

رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

سکھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں　　عبادت چشمِ ساغر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو　　کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

ممکن ہے معترض کو یہ خیال ہو کہ یہ اقبال کے ابتدائی دور کے اشعار ہیں اس لئے میں ابتدائی تصانیف کو نظر انداز کر کے جاوید نامہ اور مثنوی اقوامِ شرق و مسافر سے جو دورِ چہارم کے پختہ تخیّل کی نمایندگی کرتی ہیں چند مثالیں پیش کرتا ہوں"

باز گو از ہند و از ہندوستاں　　آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد　　آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم　　آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غمِ ما کن غمِ او را قیاس　　آہ از آں معشوق عاشق ناشناس

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن — ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است — زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است

اے ہمالہ! اے اٹک! اے رودِ گنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر — خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
زندگانی بر مرادِ دیگراں — جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں

. . . .

اُمتے کو آرزو نیشے نخورد — نقشِ او را فطرت از گیتی سترد

. . . .

ہندیاں با یک دگر آویختند — فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں — ثالث آمد از نزاعِ کفر و دیں

کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!

"روحِ ہندوستان" کی زبانی نالہ و فریاد کرتے ہیں:۔

شمعِ جاں افسرد در فانوسِ ہند — ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکے نا محرم از اسرارِ خویش — زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش

. . . .

آدمیت از وجودش دردمند — عصرِ نو از پاک و ناپاکش نژند

بگذر از فقرے کہ عُریانی دہد   اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد

الحذر از جبر و ہم از خوئے صبر   جابر و مجبور را زہر است جبر

ایں بہ صبر پیہمے خوگر شود   آں بہ جبر پیہمے خوگر شود

ہر دو را ذوق ستم گردد فزوں

ورد من یَا لَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن

وطن سے غدّاری اقبال کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ جعفر[۱] بنگالی اور صادق[۲] دکنی علامہ کی نظروں میں اسی لئے ناقابلِ عفو تقصیر کے مجرم تھے۔ فلک

[۱] میر جعفر نواب سراج الدولہ کا رشتہ دار اور اس کی فوج کا بخشی تھا۔ سراج الدولہ نواب علی وردی خاں کے بعد ۱۷۵۶ء میں بنگال کا نواب ہوا۔ اس وقت سراج الدولہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھا لیکن بالطبع نہایت بیدار مغز، شجاع، وطن پرست اور سچا مسلمان حکمران تھا۔ انگریزوں کی رفتار ترقی اور سیاسی کاوشوں اور سازشوں سے باخبر تھا، لیکن میر جعفر نے سازش کر کے رعایا کو نواب کا مخالف بنا دیا، اور خود اس کی جگہ نواب بن جانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے اس نے انگریزوں کی مدد حاصل کی اور ان کو بیشمار دولت دی۔ چنانچہ کلائیو نے ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ سے جنگ کی، نواب کو شکست ہوئی گرفتار ہوا اور خود میر جعفر کے بیٹے میرن نے نواب کو شہید کرا دیا۔ اس تدبیر سے میر جعفر نے بنگال کی حکومت حاصل کی۔ لیکن اپنی ناعاقبت اندیشی سے انگریزوں کا محکوم اور غلام بن گیا۔ سراج الدولہ کے خزانہ کو میر جعفر نے اس بیدردی سے لٹایا کہ صرف ایک کلائیو نے ۲۵ لاکھ روپیہ نقد اڑایا۔ صرف میر جعفر کی غدّاری کی بدولت انگریز صوبہ بنگال پر قبضہ پاکر دوآبہ میں داخل ہو گئے اور تمام شمالی ہندوستان پر حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

[۲] میر صادق سلطان شہید (ٹیپو سلطان) کا وزیر اعظم تھا۔ حیدر علی کے بعد ۱۷۸۲ء میں ٹیپو سلطان میسور کا مطلق العنان حاکم قرار پایا۔ یہ بادشاہ ہندوستان کے ان چند سلاطین میں سے گزرا ہے جو تاریخ عالم میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ٹیپو نہایت باہمت، شجاع، عاقبت اندیش، وطن پرست اور ہوشمند مسلمان بادشاہ تھا۔ انگریزوں کی ترقیات کو آزادی ہند پر ضرب کاری سمجھتا تھا۔ جب نپولین بوناپارٹ نے مصر پر حملہ کیا، تو یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ اب ہندوستان میں بھی داخل ہونا چاہتا ہے لاتی برصفحہ ۴۱۱

زحل پر آپ دیکھتے ہیں کہ عالم تیرہ و تار ہے۔ ہزاروں فرشتے گرز اور دُرّے لئے کھڑے ہیں۔ جن ارواحِ رذیلہ کو دوزخ تک قبول نہیں کرتا وہ یہاں عذاب میں گرفتار ہیں:

اندرونِ او دو طاغوتِ کہن　　روح قومے کشتہ از بہر دو تن
جعفر از بنگال و صادق از دکن　　ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن
ناقبول و نا امید و نامراد　　ملتے از کارِ شاں اندر فساد
ملتے کو بند ہر ملت کشاد　　ملک و دینش از مقامِ خود فتاد
می ندانی خطۂ ہندوستاں　　آں عزیزِ خاطرِ صاحبدلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز　　درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت　　ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت

در فضائے نیلگوں یک دم بایست
تا مکافاتِ عمل بینی کہ چیست

اس کے بعد آپ اس عذاب و عتاب کی تفصیل بیان کرتے ہیں جس

حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہندوستان میں انگریزوں کی سرگرمی اس وقت لارڈ ویلزلی کے ہاتھ تھی ٹیپو سلطان نے سرنگا پٹم میں "درخت آزادی" بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ نصب کیا اور انگریزوں کا زور توڑنے کے لئے فرانسیسیوں کا حلیف بن گیا۔ انگریز گھبرا گئے اور انہوں نے سلطان کو تنبیہ کی۔ یہ حریت کا علمبردار ان کی بھبکیوں میں نہ آیا۔ آخر لڑائی چھڑی۔ سلطان کو سرنگا پٹم میں محصور ہونا پڑا۔ سرنگا پٹم فتح کرنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔ بغیر بیرونی مدد کے بھی سلطان عرصہ تک بآسانی مدافعت کر سکتا تھا۔ لیکن میر صادق پہلے ہی سے لارڈ ویلزلی سے ساز باز رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا۔ اس وقت بھی اس نے خفیہ طور پر انگریزوں کی مدد کی کہ ان کو شہر میں داخل ہونا ممکن ہو گیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ٹیپو سلطان دادِ شجاعت دیتا مارا گیا، اور اس وطن فروش غدار قوم کی بدولت "آزادی کا یہ آخری درخت" کبھی اکھڑ گیا۔ ورنہ شاید آج ہندوستان کی تاریخ دوسری طرح لکھی جاتی۔

ہیں یہ دونوں "زرد رُو، عریاں بدن، آشفتہ مُو" مبتلا ہیں۔ اِس تشریح کو پڑھ کر انسان کانپ اُٹھتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"روحِ ہندوستان" کی زبانی اقبال کی محبتِ وطنی کی مزید شہادت دیکھئے۔

کے شبِ ہندوستاں آید بروز	مُرد جعفر، زندہ روح او ہنوز
تا رقیدِ یک بدن وا می دہد	آشیاں اندر تنِ دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا ساز باز	گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ او آئینِ او سوداگری است	عنتری اندر لباسِ حیدری است
. . . .	. . . .
جعفر اندر ہر بدن ملّت کش است	ایں مُسلمانے کہن ملّت کُش است
خند خنداں است و با کس یار نیست	مار اگر خنداں شود جز مار نیست
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم	ملّت او از وجودِ او لئیم
ملّتے را ہر کجا غارت گرے است	اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از رُوحِ جعفر الاماں

الاماں از جعفرانِ ایں زماں

غدّارِ ملّت کو موت بھی پناہ نہیں دیتی۔ کہتی ہے:۔

گفت جاں سرّے نے اسرارِ من است	حفظِ جان و ہدمِ تن کارِ من است
جاں ز شستے گرچہ بنا ارزد باد و جَو	اے کہ از من ہدمِ جانِ خویش اہی برو

ایں چنیں کارے نمی آید ز مرگ

جانِ غدّارے نیا ساید ز مرگ

پھر کہتے ہیں کہ غدار کو اور کہیں بھی آسودگی نصیب نہیں ہو سکتی۔

اے ہوائے تند! اے دریائے خوں
اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!

اے نجوم! اے ماہتاب! اے آفتاب!
اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!

اے بتانِ بیض، اے تُرکانِ عرب!
اے جہانے در بغل بے حرب و ضرب!

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا ست
بندۂ غدّار را مولا کجاست؟

اشتراکیت

اشتراکیت (سوشلزم) اور اشتمالیت (کمیونزم) کا سب سے بڑا رہنما کارل مارکس تھا۔ یہ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۳ء میں اُس نے وفات پائی۔ ۱۸۴۸ء میں اُس نے اپنا مشہور "اعلان" شائع کیا۔ جس نے یورپ بھر میں تہلکہ برپا کر دیا۔ اور ۱۸۶۷ء میں اُس کی مشہورِ آفاق کتاب "سرمایہ" شائع ہوئی۔

مارکس کے اساسی اصول یہ ہیں:۔

۱۔ معاشرت انسانی کے تمام واقعات کا سرچشمہ مادّی حالات ہیں۔ قانون، مذہب، فلسفہ، سیاست سب اسی کا مظہر ہیں۔ اِسی لئے تاریخ کی مادی تشریح اس کے نزدیک لازمی ہے۔ اس کے کردار و عادات و خیالات تک مادی و معاشی حالات کے ماتحت ترتیب پاتے ہیں۔ اِس لئے وہ مادی اسباب کو سب کچھ سمجھتا ہے۔

۲۔ سرمایہ داری کا نظام سخت مہلک ہے۔ صرف چند بڑے سرمایہ دار اپنے اجارے قائم کرکے تمام دولت پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور دیگر افراد کو ان کے حصّہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ نظام قانونِ مساوات سے متضاد اور اس لئے ناقابلِ قبول ہے۔

۳۔ سرمایہ دار اور مزدور میں اسی لئے جنگ رہتی ہے، سرمایہ دار مزدور کو اپنا دست نگر اور غلام بنا لیتا ہے۔ وہ اس کی بے روزگاری اور بھوک میں صرف اس لئے اس کی مدد کرتا ہے کہ اس کی غلامی کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کرے۔ آخر مزدور میں شعور اور احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور آخرکار عذاب کا باعث ہو جاتا ہے۔

۴۔ زمینداری اور سرمایہ داری دونوں غریبوں اور بیکسوں کا خون چوسنے والی تحریکیں ہیں، اس لئے اِن دونوں کا استیصال لازم ہے۔

۵۔ دولت کی موجودہ تقسیم کے نظام کے ماتحت چیزیں نفع حاصل کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں، استعمال کے لئے نہیں۔ بعض چیزیں زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جیسے مکان، لباس، خوراک وغیرہ۔ بعض سے مفید کام لئے جاتے ہیں، جیسے سڑک، ریل، تعلیم وغیرہ، اور بعض لغو اور بیہودہ کاموں میں لائی جاتی ہیں جیسے قمار بازی، فحاشی، بدکاری وغیرہ۔ سرمایہ اِن چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن سے زیادہ نفع ہو۔ اِس سے بحث نہیں ہوتی کہ بنی نوع کو کس چیز کی زیادہ ضرورت ہے۔ نفع کی تلاش کے باعث سرمایہ دار طاقتوں میں رقابت شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس بلا و مصیبت کا حل صرف اشتراکیت ہے۔

اشتراکیت کو عملی صورت میں لانے کے لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ موجودہ

معاشی نظام کو ملیا میٹ کر دیا جائے۔ یعنی نفع کے خیال سے قطع نظر کر کے ضرورتِ انسانی کے لحاظ سے اشیاء پیدا کی جائیں۔ پھر یہ کہ زمین اور سرمایہ کی انفرادی ملکیت کا اصول توڑ دیا جائے۔ سب چیزیں حکومت کی ملک ہوں اور ضرورت و احتیاج کے اعتبار سے اُن کو افراد میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر شخص بغیر کوئی کام اور محنت کیئے ضروری وسائل نہیں حاصل کر سکتا۔ "جیسا کرے گا ویسا پائے گا" کے اصول پر افراد میں تقسیم مال کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ اشتراکیت کی آزادی و ترقی کی بنیاد معاشی آزادی ہے۔ یہ بغیر تشدد اور انقلاب کے قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہی سبب ہے کہ روس میں لاکھوں کی تعداد میں انسان قتل ہوئے، اور اب بھی آئے دن جبر و تشدد اور قتل و حبس کا سلسلہ شدت سے جاری ہے۔

اشتراکیت کی اس تحریک و نظام کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لادینی بڑھتی ہے مذہب کی تحقیر و تضحیک کی جاتی ہے۔ خوشحالی مفقود ہو جاتی ہے۔ ایک عجیب قسم کی بے کیفی و بے رنگ یکسانیت قائم ہوتی ہے۔ انفرادی آزادی غائب ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جو پہلے سرمایہ داری کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اب خداوندانِ اشتراکیت کی بنائی ہوئی مشینوں کا بے حس اور بے شعور کل پرزہ بن جاتا ہے۔ پروپاگنڈہ کا دیوتا ان سے سجدے کراتا ہے، اور وہ اس کے محتاج بندے بن جاتے ہیں۔ اشتراکیت ظاہری اور بیرونی دُنیا پر نظر ڈالتی ہے۔ داخلی اور نفسیاتی عناصر سے اُس نے کبھی بحث نہیں کی۔ حالانکہ انسان اور اس کے حالات کی تکمیل داخلی و خارجی دونوں قسم کے اثرات و حیات سے ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اشتراکیت اکثر جزئیات واقعات میں نوعِ انسانی کی رہنمائی کا مقصد پورا نہیں کر سکتی۔ ایک کا دُوسرے پر

جبر و تشدد ہرگز عقلِ سلیم کے نزدیک قابلِ معافی نہیں۔ سرمایہ محنت پر، قوی ضعیف پر، امیر غریب پر، حاکم محکوم پر یا ایک قوم دوسری قوم پر جو ظلم کرے وہ ہرگز جائز نہیں مگر یہ بھی یقینی ہے کہ امتیازات کا فلسفہ بالکل نیست و نابود کر دینا خلافِ فطرت ہے۔ کائنات کی عملی زندگی میں غالب و مغلوب، توانا و ناتواں، بلند و پست کا فرق و امتیاز خود فطرت کا قائم کردہ ہے۔ خود روس کو دیکھ لیجئے، جو اشتراکیت و اشتمالیت کا ہر دوا اور بنارس ہے کہ وہاں بھی باہمہ دعوائے مساوات و یکسانیت یہ امتیازات آج بھی باقی ہیں۔ ان امتیازات کی بنیاد اشتراکیت نے مادیت اور لادینی پر رکھی ہے۔ اگر یہی بنیاد و اساس دین اور روح ہوں تو مشکل حل ہو جاتی ہے اور وہ پائدار اخوت و مساوات پیدا ہوتی ہے جو ہر خلل و فساد اور ظلم و جبر سے خالی اور محفوظ رہتی ہے۔ اسلام نے اسی "ہیئتِ اجتماعی" کا نظریہ پیش کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک اس سے بہتر کوئی نظریہ سامنے نہ آیا۔ اشتراکیت آج جس مظلومی و بے بسی کی مدد کے لئے میدان میں اتری ہے۔ اسلام ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اسی اعلان کو ببانگِ دہل عالم کے کانوں تک پہنچا چکا ہے۔ پھر اشتراکیت سے زیادہ اور بہت زیادہ مضبوط و مستحکم اساس کے ساتھ۔

اشتراکیت کو اسلام کے ساتھ ایک دور کی اور بھونڈی سی مشابہت ہے اسی لئے ناقص تعلیم رکھنے والے مسلمان اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ اگر وہ اسلام کے نظریات پر غور کریں۔ تو ان کو معلوم ہو جائے کہ جو چیز وہ دوسروں سے مانگتے ہیں۔ اس سے بہتر اور مکمل تر خود ان کے گھر میں موجود ہے۔ علامہ اقبال کو اشتراکیت سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اگر وہ ضعیف کو ابھارنا، محکوم کو سنوارنا، اور مزدور کو بنانا

چاہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام اِن اصُولوں کا حامی اور مبلغ ہے، نہ یہ کہ اشتراکیت سے ان کو اتفاق ہے۔ وہ اشتراکیت کے سخت مخالف ہیں اس لئے کہ اشتراکیت بے دینی کی تبلیغ کرنا چاہتی ہے، اور مذاہب کے استیصال کی قائل اور اس پر عامل ہے۔ کارل مارکس مذہب کو افیون کہتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال کو احساس ہے کہ وہ شے جس کی بنیاد نفی پر قائم کی جائے ہرگز پائدار نہیں ہو سکتی۔ جس طرح جسم اور مادّہ بغیر رُوح کے ناپائدار ہوتا ہے، اسی طرح بغیر دین کی رُوح کے جسمِ دنیا کا نظام استوار نہیں ہو سکتا۔

ہمچناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
رُوس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لَا آید بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لَا سلاطیں، لَا کلیسا، لَا اِلٰہ
فکرِ او در تُند بادِ لَا بماند — مرکبِ خود را بسوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لَا نیاساید حیات — سُوئے اِلّا می خرامد کائنات
لَا و اِلّا سازو برگِ اُمتاں — نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لَا سُوئے اِلّا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لَا پیشِ نمرودے بزن
ایں کہ می بینی نیرزد با دوجو — از جلالِ لَا اِلٰہ آگاہ شو

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لَا ست

جملہ موجودات را فرماں رواست

کارل مارکس کی آواز سنیئے، اور اشتراکیت کی رُوح کا جلوہ دیکھئے:-

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی، یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دُنیا کو اب گوارا، پرانے افکار کی نمائش

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش، مریز و کجدار کی نمائش

جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

بلشویک کا مزید حال سنئے:-

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب
خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات

ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور
وہی کہ حفظِ چلیپا کو جانتے تھے نجات

یہ وحی دہریتِ روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سُود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار

اندیشہ ہُوا شوخیِ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہُوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

لیکن اشتراکیت ہیئتِ اجتماعیِ انسانی کا صحیح حل نہیں ہے، اس لئے علّامہ کو اس سے اختلاف ہے۔

صاحبِ "سرمایہ" از نسلِ خلیل   یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل[1]
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است   قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را   در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بُو از تن نگیرد جانِ پاک   جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس   بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است   بیخ او در دل نہ در آب و گل است

اس کے بعد ملوکیّت کی مذمّت کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں:۔

ہر دو[2] را جاں ناصبور و ناشکیب   ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج   درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست   آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل   ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

علامہ اقبال بنی نوع کی اس مشکل کا مشکل کشا بھی قرآنِ عظیم ہی کو پاتے ہیں، اور اس لئے اس کی طرف دعوت دیتے ہیں:۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

---

[1] یعنی کارل مارکس جس کی کتاب "سرمایہ" اِن "بیدینا" دینداروں کی مقدّس کتاب ہے۔
[2] یعنی اشتراکیت و ملوکیت۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان ‏ ‏ ‏ ‏ اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرف قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

حضرتِ علامہ نے ارمغانِ حجاز کی ایک نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں جمہوریت اور اشتراکیت کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ لمبی نظم ہے۔ صرف بعض ضروری حصے یہاں نقل کرتا ہوں:-

پہلا مشیر کہتا ہے:-

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ‏ ‏ ‏ ‏ جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو ‏ ‏ ‏ ‏ ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کرکے کہتا ہے:-

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام ‏ ‏ ‏ ‏ اب مجھے اُن کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز ‏ ‏ ‏ ‏ ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ ‏ ‏ ‏ ‏ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر ‏ ‏ ‏ ‏ جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج ‏ ‏ ‏ ‏ کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے

جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس اپنے سب مشیروں کو خطاب کرتا ہے۔ پانچویں مشیر کے خطرات کا خاص طور پر جواب دیتا ہے، اور پھر خود اپنا خطرہ بیان کرتا ہے:۔

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

یہ نظم ۱۹۳۶ء میں کہی گئی تھی۔ ابلیس کے لہو گرما دینے کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ ابلیس کو جو کد اسلام سے ہے وہی ابلیس اور مارکس اور لینن کے متبعین کو اقبال سے ہے۔ اسی لئے ان کی تنقید کا سب سے زیادہ ہدف اقبال اور اس کے نظریات ہوتے ہیں، اور وہ مسخ و تلبیس کے تمام ہتھیار استعمال کر رہے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی توجہ اقبال سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں، اور پھر ان کی تبلیغ جس کی بنیاد اسلام کی مخالفت اور بے دینی پر رکھی گئی ہے کارآمد ہو سکے۔

سرمایہ و محنت

اقبال سرمایہ داری کے شدید مخالف ہیں اور بے بس اور بےکس غریبوں اور مزدوروں کے بہترین حامی۔ آپ سرمایہ کو بنی نوعِ انسان کی گردن میں طوقِ لعنت سمجھتے ہیں۔ اور دولت کی اس غیر منصفانہ وجابرانہ تقسیم کے سخت دشمن ہیں۔ سرمایہ داروں نے غریب مزدور کی محنت کی بنیاد پر قصر تعمیر کرائے تعیّشات فراہم کیئے اور کیا کیا چین نہ اُڑائے۔ مگر وہ غریب وبیکس بندۂ مجبور روٹی روٹی کو محتاج اور ہر بلا و مصیبت کا آماجگاہ ہے۔ اِس ظلم و تشدد پر اقبال کا دل کڑھتا ہے، اور وہ درد اس ہمدردِ بنی نوع کی زبان سے یوں ادا ہوتا ہے :۔

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد — آبروئے دخترِ مزدور بُرد

در حضورش بندہ می نالد چو نے — برلبِ او نالہ ہائے پے بہ پے

نے بجامش بادہ و نے در سبوست — کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

سرمایہ دار اور مزدور کا "قسمت نامہ" سرمایہ دار کی زبانی بیان کرتے ہیں:

غوغائے کارخانۂ آہن گری زمن — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو

نخلے کہ شہ خراج بروی نہد زمن — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ازانِ تو

تلخابۂ کہ دردِ سر آرد ازانِ من — صہبائے پاک آدم و حوّا ازانِ تو

مرغابی و تدرو و کبوتر ازانِ من — ظلِ ہما و شہپر عنقا ازانِ تو

این خاک و آنچہ در شکمِ او ازانِ من
وز خاک تا بعرشِ معلیٰ ازانِ تو

مزدور کی زبانی اُس کے مصائب و آلام سُنئیے :-

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کیش — نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
ز خوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی — ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را — بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستاں ز گریۂ سحرم — شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

فریبی بحکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ — مرا خوئے تسلیم فرمودۂ
کند سحر را آبنایم اسیر — ز خار ابروتیشہ ام جوئے شیر
حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار و نا بردہ رنج
خطا را بحکمت مگرداں صواب — خضر را نگیری بدامِ سراب
بدوشش زمیں بارِ سرمایہ دار — ندارد گذشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہروزی از دستِ مزد — ندانی کہ این ہیچ کاراست دزد

پئے جرمِ او پوزشش آوردۂ
بایں عقل و دانش فسوں خوردۂ

مزدور اس ظلم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے :-

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم

مغاں و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گُل طرحِ دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تاکے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

علامہ مزدور کے مستقبل کو خوش آیند پاتے ہیں، اسے بیداری کا پیغام دیتے ہیں اور انقلاب کا اعلان فرماتے ہیں :-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش — اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے — سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ملکیّتِ زمین

موجودہ مہذّب دُنیا کی نظر میں زمینیں حکومت کی ملکیت ہوتی ہیں۔ بعض حکما کے نزدیک سلطنت نہیں بلکہ افراد زمین کے مالک ہوتے ہیں حالانکہ یہ دونوں نظریے غلط ہیں۔ اسلامی نظریہ ان دونوں سے علیحدہ ہے۔ اس کی رو سے زمین نہ بادشاہِ وقت کی ملکیّت ہے اور نہ افراد کی۔ صرف خدا اس کا مالک ہے، اس نے اپنے بندوں کو عارضی امانت کے طور پر قبضہ دے رکھا ہے۔ بندہ امین، قابض اور متصرّف ہوتا ہے، مالک نہیں ہوتا۔ اقبال بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ ثبوت دیکھئے:-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز — دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت — کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں

پُوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تُو — بولی مجھے تو ہے فقط اِس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دِہ خدایا! نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
صحبتش تا کے تو بود او نبود — تو وجود و او نمودِ بے وجود
تو عقابی طائفِ افلاک شو — بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

زمیں ہماری مِلک نہیں۔ لیکن یہ امانت اسی لئے ہم کو دی گئی ہے کہ ہم اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ ملکیّتِ زمین کے دعاوی باطلہ نے ارضِ خدا پر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ امانت میں خیانت کرنے کا یہی نتیجہ ہُوا کرتا ہے۔ اقبال سے تفصیل سنئے:۔

من نگویم در گذر از خاک و کُو — دولتِ تُست ایں جہانِ رنگ و بُو
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر — صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بہ کہسارش بزن — نورے از خود گیر و برنارش بزن
از طریقِ آذری بیگانہ باش — بر مرادِ خود جہانِ نو تراش

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست　　این متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

بندۂ مومن امیں، حق مالک است　　غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں　　قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ

دُودۂ آدم کَنَفسٍ وّاحِدَہ

ہمچناں ایں باد و خاک و ابر و کشت　　باغ و راغ و کاخ و کوے و سنگ و خشت

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست　　مردِ ناداں! ایں ہمہ مِلکِ خداست

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو　　چیست شرحِ آیۂ لَا تُفسِدُوا

ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد　　من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

کس امانت را بکارِ خود نبرد　　اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد

بُردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست　　داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست

گر تو باشی صاحبِ شے می سزد　　ور نباشی، خود بگو کے می سزد

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ　　تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست؟

آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست

جمعیّتِ اقوام

مہذّب دُنیا نے رنگ، نسل، نسب، ملک، وطن کے وہ دیوتا تراش

رکھے ہیں، جو ہر وقت فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائے رکھتے تھے۔ مختلف اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے لیگ آف نیشنز قائم کی گئی۔ تاکہ جنگ و جدال سے ممالک محفوظ رہ سکیں۔ مگر دُنیا کو معلوم ہے کہ وہ مواعید و دعاوی جن کا جمعیتِ اقوام کی بنیاد کے وقت اعلان کیا گیا تھا، سب غلط تھے۔ اس امن کی مُدّعی دیوی کے ہوتے ہوئے بھی، قوی ضعیف کو، اور حاکم محکوم کو نگلے ڈالتے ہیں، اور جُوع الارض کے لئے جو جسے چاہتا ہے ہضم کئے لیتا ہے۔ مگر لیگ آف نیشنز کوئی عملی اقدام کر کے اس سفاک دم اور چنگیزیّت کا استیصال اور روک تھام کرنے کی قابلیّت نہیں رکھتی ؎

علّامہ مُدت سے جمعیّتِ اقوام کی ناکارگی اور ہیچ میرزی کا اعلان کر رہے تھے۔ جمعیّت کے قیام کے بعد ہی آپ نے فرمایا تھا:۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کُہن ‏ ‏ ‏ دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

آپ کی یہ پیشینگوئی پوری اُتری، اور آپ کو کہنا پڑا:۔

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی ‏ ‏ ‏ حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

زندگانی ہر زماں در کشمکش ‏ ‏ ‏ عبرت آموز است احوالِ حبش

شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال | برّہ را کرد است بر گرگاں حلال
نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد | از کفن دزداں چہ امّید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن | صید تو ایں میش و آں نخچیر من

نکتہ ہا کو می نگنجد در سخن
یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

علامہ نے پھر پیشینگوئی فرمائی تھی کہ یہ مجلس زیادہ دِن قائم رہنے والی نہیں ہے۔ نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے | ڈر ہے خبر بد مرے مُنہ سے نہ نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن | پیرانِ کلیسا کی دُعا یہ ہے کہ ٹل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اُس وقت تو جمعیتِ اقوام ٹوٹ ٹوٹ کے سنبھلی اور سنبھل سنبھل کے ٹوٹی تھی۔ مگر ان اشعار کی الہامیت دیکھئے کہ آج یہ شعر بڑی بہن پر بھی ویسے ہی صادق آتے ہیں جیسے اس دن چھوٹی بہن کے حسب حال تھے۔

حقیقت میں ان جنسی، لونی، نسلی اور وطنی امتیازات کے قائم رہتے ہوئے اقوام میں باہم وحدت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جب تک ان ادنیٰ امتیازات کو مٹا کر کسی محکم اساس پر وحدتِ قومی کی بنا نہ ڈالی جائے، جنگ و فساد کا استیصال نہیں ہو سکتا۔ خاکِ مکہ سے یہی صدا ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے بلند ہوئی تھی۔ جمعیتِ آدم کا دوسرا کوئی حل اسلام کی قائم کردہ جمعیت کے سوا نہیں ہے۔ اسی دینی تصوّر کے

ماتحت رنگ، مُلک، نسب، نسل، وطن کے فرق دُور ہو کر ایک ملتِ آدم قائم ہوتی ہے، جسے کبھی تزلزل نہیں ہو سکتا۔

اس دَور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم؟

عورت

حکمائے مغرب عورت کے مسئلہ کو اب تک پورے طور سے حل نہیں کر سکے ہیں۔ مکمّل مساوات اور آزادیِ نسواں کو خود یورپ اب مضر سمجھ رہا ہے، اور بعض ممالک جرمنی وغیرہ میں اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہو چکا ہے۔ تہذیبِ جدید کی آزاد اور بے قید و بند عورت جس طرف جا رہی ہے، اس کا روشن خاکہ اقبالؔ نے جاوید نامہ میں پیش کیا ہے۔ فلکِ مریخ پر آپ کو ایک عورت نظر آتی ہے

اندراں میداں ہجومِ مرد و زن
درمیاں یک زن قدش چوں نارون

چہرہ اش روشن و لیکن بے نورِ جاں
معنیِ او بر بیانِ او گراں

حرف او بے سوز و چشمش بے نمے
از سرورِ آرزو نامحرمے

فارغ از جوشِ جوانی سینہ اش
کور و صورت ناپذیر آئینہ اش

بے خبر از عشق و از آئینِ عشق
صعوۂ رد کردۂ شاہینِ عشق

حکیم مریخی جو زندہ رود (اقبال) کے ہمراہ ہے، کہتا ہے کہ یہ عورت کرۂ مریخ کی نہیں ہے۔ فرزمرز اس کو یورپ سے چرا لایا تھا، اور اسے سکھا پڑھا کر اس سے نبوت کا دعویٰ کرایا ہے۔ اس کی دعوت یہ ہے :۔

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں | زیستن تا کے مثالِ دلبراں
دلبری اندر جہاں مظلومی است | دلبری محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما | مرد را نخچیرِ خود دانیم ما
مردِ صیادی بہ نخچیری کند | گرد تو گردد کہ زنجیری کند
خود گداز از بہائے او مکر و فریب | درد و داغ و آرزو مکر و فریب
گرچہ آں کافر حرم سازد ترا | مبتلائے درد و غم سازد ترا
ہم بر او بودن آزارِ حیات | وصل او زہر و فراقِ او نبات
مار پیچاں، از خم و پیچش گریز | زہرہایش را بخونِ خود مریز

از امومت زرد روئے مادراں

اے خنک آزادیِ بے شوہراں

وہ دجال کی بہن کہتی ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے کہ اب علم و فن نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ رحمِ مادر کے اندر کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر لڑکا یا لڑکی ہمارے منشا کے خلاف پیدا ہو تو اس کا قتل جائز ہے۔ اسی طرح کے اور کفریات بکتی ہے جو حیا و غیرت اور انسانیت و اخلاق سے بالکل متضاد و متنافر ہیں۔ اس کی تعلیمات سنئے :۔

وحیِ یزداں پے بہ پے آید مرا | لذتِ ایماں بیفزاید مرا

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن — می تواں دیدن جنین اندر بدن
حاصلے برداری از کشتِ حیات — ہر چہ خواہی از بنین و از بنات
گر نباشد بر مرادِ ما جنیں — بے محابا کشتنِ او عین دیں
در پسِ ایں عصر اعصارِ دگر — آشکارا گردد اسرارِ دگر
پرورش گردد جنیں نوعِ دگر — بے شبِ ارحام دریابد سحر
تا بمیرد آں سراپا اہرمن — ہمچو حیوانات ایّامِ کہن
لالہ ہا بے داغ و بادامانِ پاک — بے نیاز از شبنمے خیزد ز خاک
خود بخود بیروں فتد اسرارِ زیست — نغمہ بے مضراب بخشد تارِ زیست
آں چہ از نیساں فرو ریزد نگیر — اے صدف در زیرِ دریا تشنہ میر
خیز و با فطرت بیا اندر ستیز — تا ز پیکارِ تو حُر گردد کنیز

رستن از ربطِ دو تن توحیدِ زن
حافظِ خود باش و بر مرداں متن

اقبال عورت کی اس "ترقیِ جدید" کی رفتار اور اس کے مستقبل کو کس قدر بھیانک خیال کرتے ہیں۔ یہ تو سطورِ بالا سے معلوم ہو گیا۔ مگر پھر بھی آپ عورت کے مسئلہ پر کچھ کہتے ہوئے جھجکتے ہیں:۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش — مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ

آزادیٔ نسواں، کہ زمرّد کا گلوبند؟

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا | مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں | گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

علامہ کے اس "اعترافِ عجز" کے باوجود میری رائے میں علامہ نے اس مسئلہ کو اکثر جگہ اشاروں کنایوں میں اور بعض جگہ صراحت سے حل کر دیا ہے۔ آپ "زہر" کو "قند" سے ممتاز جانتے ہوئے بھی صرف "معتوب بننے" کے ڈر سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ مگر پھر بھی "شرافتِ زن" اور "فرنگی معاشرت کے فساد" کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکے اور "آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند" کا سوال قائم کر کے درپردہ جواب بھی سمجھا گئے۔ اس ابہام کی توضیح دیکھئے۔ کائنات میں عورت کی اہمیت بیان فرماتے ہیں:۔

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند | کائنات شوق را صورت گر اند
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات | فطرت او لوحِ اسرارِ حیات
آتش ما را بجانِ خود زند | جوہر او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکنات زندگی | از تب و تابش ثبات زندگی
شعلۂ کز وے شرر ہا خاستہ | جان و تن بے سوز او صورت نہ بست
ارج ما از ارجمندیہائے او | ما ہمہ از نقش بندیہائے او
حق ترا دادست اگر تابِ نظر | پاک شو قدسیت او را نگر

عورت کے لئے تعلیم کو اقبال ضروری جانتے ہیں۔ لیکن وہ تعلیم جو دین اور دینیات پر مبنی ہو۔ صرف دنیاوی تعلیم علامہ کے نزدیک موت ہے:

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

ایسی عورت جو دینی تعلیم میں کامل ہو "زندگی کا سوز" اور "شرف کا درِ مکنوں" ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

علامہ عورت کی تعلیم، آزادی، ترقی، شرف کے قائل ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ آپ مردوں کی "قوامیت" کے بھی معترف ہیں:

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور — کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تبِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

یورپ عورت کو جو بے معنی آزادی دے رہا ہے۔ اس سے آپ کو اختلاف ہے، اور ملت کے لئے اس تقلید کو سخت خطرناک سمجھتے ہیں:-

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ، ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ، مرد بیکار و زن تہی آغوش؟

واں تہی آغوش نازک پیکرے ، خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است ، ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت ، تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزاد پیش ، از حیا نا آشنا آزاد پیش
علم او بارِ امومت برنتافت ، بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

حضرت علامہ عورت کے حفظ و احترام کو اصل دین جانتے ہیں، اور اس کی برگزیدگی و شرف کو ترقی نوعی کا ذریعہ سمجھتے ہیں:-

نغمہ خیز از زخمۂ زن سازِ مرد ، از نیازِ او دوبالا نازِ مرد
پوششِ عریانیِ مرداں زن است ، حسنِ دلجو عشق را پیراہن است
عشقِ حق پروردۂ آغوشِ او ، ایں نوا از زخمۂ خاموشِ او

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات — ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ
مسلمے کو را پرستارے شمرد — بہرہ از حکمتِ قرآں نبرد
نیک اگر بینی امومت رحمت است — زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است — سیرتِ اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے — حرفِ اُمت نکتہ ہا دارد بسے
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں — زیرِ پائے اُمہات آمد جناں
ملت از تکریمِ ارحام است و بس — ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما — موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

بر دمد ایں لالہ زارِ ممکنات — از خیابانِ ریاضِ اُمہات
قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چُست
حافظِ رمزِ اخوت مادراں — قوتِ قرآن و ملت مادراں

اقبال کی رائے میں عورت کے لئے "اسوۂ کاملہ" ہے سیّدۃ النّسأ حضرت فاطمہ زہرا کی زندگی جس کی تقلید عورتوں کو کاملیت بخش سکتی ہے جنہیں علیہا السّلام کے شرف اور بزرگی کو بیان کرکے کہتے ہیں :-

سیرتِ فرزند ہا از اُمہات — جوہرِ صدق و صفا از اُمہات

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ　　　مادراں را اُسوۂ کامل بتولؓ

. . . .

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست　　　پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفےٰؐ ست
ورنہ گرد تربتش گردیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

پھر عورتوں کو نصیحت فرماتے ہیں :۔

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند　　　چشم ہوش از اُسوۂ زہراؓ مبند
تا حسینؓ شاخِ تو بار آورد　　　موسم پیشیں بگلزار آورد

جاوید نامہ میں علامہ مرحوم نے شرف نسا خانم کا حال بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد　　　ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد

شرفؔ نسا کی زندگی ہمارے لئے اس آخری دور میں بہترین مثال ہے اس کا معمول تھا :۔

لہ شرف النّسا بیگم نواب خان بہادر خاں کی بیٹی تھیں۔ جو شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں پنجاب کے گورنر تھے، ان کے والد یعنی شرف النّسا کے دادا نواب عبد الصمد خاں بھی بہادر شاہ بادشاہ کے عہد میں پنجاب کے گورنر رہ چکے تھے، اُنہوں نے ہی بندہ بہادر کے فتنہ کا استیصال کر کے اسے قید کیا تھا، شہر کے شمال میں اور شالامار باغ کے راستہ میں جہاں اب بیگم پورہ کا گاؤں آباد ہے۔ اس زمانہ میں یہاں نواب کے محلات تھے، نواب عبد الصمد خاں کی بیگم کی طرف منسوب ہو کر اس آبادی کا نام بیگم پورہ پڑ گیا ان دونوں نوابوں کی قبریں اب بھی یہاں موجود ہیں۔

شرف النسا بیگم نے محلات میں ایک چبوترہ بنوا رکھا تھا۔ سیڑھی لگی رہتی تھی۔ بیگم کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد روزانہ اس چبوترہ پر بیٹھ کر کلام مجید کی تلاوت کرتیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

تارِ قرآں پاک می سوزد وجود　　　　از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمر تیغ دو رو قرآں بدست　　　　تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز
اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

جب شرف النساء کے انتقال کا وقت قریب آیا تو ماں کو محبّت کی نگاہوں سے دیکھ کر وصیّت کی:-

برلبِ او چوں دمِ آخر رسید　　　　سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت "اگر از رازِ من داری خبر　　　　سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　　　کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس　　　　دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن　　　　تیغ و قرآں را جُدا از من مکُن
دل باآں حرفے کہ می گویم بنہ　　　　قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ
مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است"

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ایک مرصّع تلوار پاس رکھی رہتی۔ تلاوت ختم کر چکتیں تو قرآن پاک بند کر کے اس کے پاس تلوار رکھ کر نیچے آجاتیں۔ مرنے کے بعد وصیّت کے بموجب بیگم کو اسی چبوترہ پر دفن کیا گیا۔ اور قرآن شریف اور تلوار قبر پر رکھ دی گئی۔ بعد میں گنبد بھی بنا دیا گیا۔ دیکھنے والے گنبد کی اس قدر بلند کرسی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ آجکل یہ جگہ سرو والا مقبرہ کہلاتی ہے۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی خانہ جنگیوں کے زمانہ میں کسی سکھ سردار نے یہ سمجھ کر کہ یہاں کوئی خزانہ دفن ہے مقبرہ کو کھولا اور کچھ ہاتھ نہ آیا تو وہ کلام مجید اور مرصّع تلوار نکال لایا۔

عورتوں کے نام اقبال کا پیغام یہ ہے جو مذکورہ بالا دونوں مثالوں میں پوشیدہ ہے۔ یعنی عورت ملّت کے بقا و استحکام کی ذمہ دار ہے۔ تعلیم دین اور اسرار قرآن سے واقفیت اس کے لئے بغایت لازم ہے کہ اسی کی گود سے حامیانِ ملّت پرورش پا کر دنیا میں آئیں گے۔ اس میں ہمت، ولولہ، شجاعت، صداقت، جوشِ عمل وغیرہ محاسن ہونے چاہئیں تاکہ فرزندانِ قوم بھی مکارمِ اخلاق سے آراستہ ہوں۔ قوم کی فلاح و بہبود عورت سے وابستہ ہے۔ اگر وہ اس معیار پر پوری نہیں اُترتی اور اس فریضۂ حیات کو بجا لانے کی اہل نہیں ثابت ہوتی تو اقبال کی رائے یہ ہے کہ ؎

ایں گُل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملّت شُستہ بہ

آرٹ

خواجہ عبدالوحید صاحب علامہ اقبال کے نظریہ آرٹ کی بابت لکھتے ہیں:-

"آپ نے فرمایا کہ اگرچہ آرٹ کے متعلق دو نظریے موجود ہیں۔ اوّل یہ کہ آرٹ کی غرض محض حُسن کا احساس پیدا کرنا ہے، اور دوم یہ کہ آرٹ سے انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہئے۔ ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسان کی زندگی کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ اور اس لئے ہر وہ آرٹ جو زندگی کے لئے مفید ہو، اچھا اور جائز ہے، اور جو زندگی کے خلاف ہو، جو انسانوں کی ہمت کو پست اور ان کے جذباتِ عالیہ کو مُردہ کرنے والا ہو،

قابلِ نفرت و پرہیز ہے، اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیئے۔ . . . . . . آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لئے مُردہ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندو قوم کی تباہی میں اس کے فنِ موسیقی کا بہت حصّہ رہا ہے"۔

علاّمہ فرماتے ہیں:۔

گر ہُنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

شاعری، ڈراما، افسانہ، نغمہ، رقص، مصوری، نقاشی، تعمیر سب کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خودی کی حفاظت کریں اور اسے مستحکم بنائیں۔ اگر کوئی ہُنر تعمیرِ خودی کا جوہر نہیں رکھتا اور اسے ضعیف بناتا ہے تو وُہ دریا بُرد کئے جانے کے قابل ہے:۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہُنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اُن کی
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جناب پرنسپل سید عابد علی صاحب علامہ کی ایک محفل کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک صاحب نے کسی نئی تصنیف کا ذکر چھیڑا جس میں آرٹ کے فلسفے سے بحث کی گئی تھی۔ علامہ نے فرمایا: "ایک جرمن مصنف کہتا ہے کہ فلسفے کے نظام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ٹھوس وزنی، ان میں مغز زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے ذرا ہلکے۔ جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ہر ٹھوس چیز سے بیگانہ ہوجاتی ہیں۔" میں نے پوچھا: "آرٹ بھی ٹھوس اور ہلکا ہوسکتا ہے؟" فرمایا "ہوسکتا ہے۔ زوال پذیر اقوام میں آرٹ کا رس نچوڑ کر نہیں پیا جاتا۔ بلکہ چھلکے کی شکل بنا دی جاتی ہے، اور اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ آرٹ کی عظمت کا انحصار کس چیز پر ہے شکل پر یا مغز پر، علامہ نے ارشاد فرمایا کہ "یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔" . . . . . .

. . . . میں نے جرأت کرکے پوچھا کہ آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے جو محرکات ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ علامہ نے لیٹے لیٹے جواب دیا کہ "آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے۔ جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے، اس وقت تک آرٹ زندہ اور جاندار رہتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔" علامہ یہ کہہ کر چپ ہوئے تو نیاز ی صاحب

نے پوچھا کہ ان حالات میں کیا شاعری سب سے پہلے متاثر ہوتی ہے۔ فرمایا: ضروری نہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں سے، مغز سے، معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ چھلکے سے، شکل سے دل بستگی بڑھ جاتی ہے۔ یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے[1]۔

ایسے زوال پذیر اور غیر صحت مند آرٹ سے جو موت کی طرف رہنمائی کرے علامہ سخت متنفر ہیں، اور طرح طرح سے آپ نے اس کی مذمت کی ہے۔ مصوری کی بابت فرماتے ہیں:۔

هم چناں دیدم فنِ صورت گری ۔۔۔ نے براہیمی درو نے آذری
راہبے در حلقۂ دامِ ہوس ۔۔۔ دلبرے با طائرے اندر قفس
خسروے پیشِ فقیرے خرقہ پوش ۔۔۔ مردِ کوہستانی ہیزم بدوش
نازنینے در رہِ بت خانۂ ۔۔۔ جوگئے در خلوتِ ویرانۂ
پیرکے از دردِ پیری داغ داغ ۔۔۔ آنکہ اندر دست او گل شد چراغ
مطربے از نغمۂ بیگانہ مست ۔۔۔ بلبلے نالید و تارِ او گسست
نوجوانے از نگاہے خوردہ تیر ۔۔۔ کودکے بر گردنِ بابائے پیر

می چکد از خامہا مضمونِ موت
ہر کجا افسانۂ افسونِ موت

دوسرے فن بھی جز مصوری کی طرح کوئی مفید مقصد انجام نہیں دیتے بلکہ نغمۂ موت کے مانند ہوتے ہیں، ان کی بابت لکھتے ہیں:۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ۔۔۔ ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزا

[1] ملفوظاتِ اقبال

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں ‏ زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند ‏ کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ‏ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اسی طرح موسیقی کی بابت فرماتے ہیں:۔

نغمۂ او خالی از نارِ حیات ‏ ہمچو سیل افتد بدیوارِ حیات
از نئے او آشکارا رازِ او ‏ مرگ ایک شہر است اندر سازِ او
ناتوان و زار می سازد ترا ‏ از جہاں بیزار می سازد ترا

الحذر ایں نغمہ موت است و بس
نیستی در کسوت موت است و بس

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ نے فرمایا کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے۔ مسلمان جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی، اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا، اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے، جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد[1] اور دلی کی مسجد[2] قوت الاسلام بھی پیدا کرتی

[1] بیت المقدس کی مسجد عمرؓ۔ [2] حضرت قطب صاحبؒ کے مزار شریف کے قریب کی مسجد جس کا مینار "قطب صاحب کی لاٹ" کہلاتا ہے۔

ہے ۔ بہت عرصہ ہؤا جب میں نے مسجد قوت الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا ۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہؤا وہ مجھے اب تک یاد ہے ۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی، اور مغرب کا وقت قریب تھا ۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں ۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا ۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں ۔ اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا ۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا ۔ قصرِ زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے ۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا ۔ مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا ۔" پھر ایک تبسّم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا " میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا ۔ مگر جدھر نظر اٹھتی تھی ، دیوار پر ھُوَ الْغَالِبُ لکھا ہؤا نظر آتا تھا ۔ میں نے دل میں کہا ، یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے ۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو ۔" اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا ۔ تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " مسجد قوت الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی ۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آ گیا ہے اور در اصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے[۱]۔"

---

[۱] ملفوظاتِ اقبال ۔

فنونِ لطیفہ کا مقصد اور ان کی قوتِ اعجاز کا حال اقبال سے سُنئے :۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گُہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے — افلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے — ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے سحر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے — شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہُنر سے

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

آرٹ کو صحت مند زندگی کا نمائندہ ہونا چاہیئے۔ جس میں قوّت، شوکت، عظمت، توانائی اور سربلندی موجود ہو، جو اس قدر جاندار ہو کہ قوم اور ساری دُنیا کو جان بخشے۔ جس میں قوّت اور جلال کا عنصر حُسن کا توازن قائم کرے، جس میں موت کی نقش گری نہ ہو بلکہ جو حیات بخش ہو اور اس میں تعمیرِ خودی کا جوہر پایا جائے فرماتے ہیں :۔

یک زماں با رفتگاں صحبت گزیں — صنعتِ آزاد مرداں ہم ببیں
خیز و کارِ ایبک و سوری نگر — وانما خویش اگر داری جگر

خویش را از خود بروں آوردہ اند ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند

سنگ ہا با سنگ ہا پیوستہ اند روزگارے را بہ آنے بستہ اند

دیدن او پختہ تر سازد ترا در جہان دیگر اندازد ترا

نقش سوئے نقاش گرمی آورد از ضمیر او خبر می آورد

ہمت مردانہ و طبع بلند در دل سنگ ایں دو لعل ارجمند

اقبال ہنر میں وہ حسن و جمال چاہتے ہیں جس میں قوت اور جلال پنہاں ہو۔ وہ آگ چاہتے ہیں جس کا شعلہ تند و سرکش و بیباک ہو۔ وہ مستی و قوت پسند کرتے ہیں جس کے آگے افلاک سرنگوں ہو جائیں۔ انہیں وہ ہنر مرغوب نہیں جس میں ضرب کلیمی نہ ہو جو قوت نہ بخش سکے، جو خودی کے جوہر کی تربیت نہ کر سکے اور جو انقلاب پیدا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ شعر کے لئے کہتے ہیں:۔

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے جس سے متزلزل نہ ہوئی دولت پرویز

اقبال یہ ہے خارا تراشی کا زمانہ

از ہر چہ بآئینہ نماید بہ پرہیز

نیز فرماتے ہیں:۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

دل کیا ہے، اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے

جس روز دِل کی رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

سیاستِ مغرب

مغرب کی سیاست کے جال میں آج تمام عالم گرفتار ہے۔ یورپ کے نظریات کی بنیاد مادیت پر ہے۔ رُوح سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ مغرب کے تصوّرات سیاسی ایک طلسمِ فریب اور نیرنگِ سیمیا ہیں، جن کا ظاہر خوش نما و زیبا ہوتا ہے۔ مگر باطن بے حد کریہہ المنظر اور بھیانک ہے۔ مشرق اِس دامِ رنگ و بُو پر طائرِ نادان کی مانند گر رہا ہے۔ اِس لئے علامہ جیسے سیاسی مفکر اور معاشی مصلح کے لئے لازم تھا کہ وہ یورپ کے اس طلسماتی جال کے تار و پود بکھیر دیں، اور حقیقت کو آشکار کر دیں تاکہ کوتاہ بیں اور ناعاقبت اندیش اقوامِ مشرق اِس بازیگری سے دھوکا نہ کھائیں اور اپنے مستقبل کو بربادی کے غار میں گرنے سے بچالیں۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ
جامِ او روشن تر از آئینۂ اسکندر است

چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار
بادہ خواراں را نگاہِ ساقیش پیغمبر است

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل
عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارتگر است

در ہوایش گرمیِ یک آہِ بیتابانہ نیست
رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

سیاستِ مغرب دلفریب و خوش ادا معشوق ہے، مگر اس کے جفا و جور کے ڈھنگ نرالے ہیں، جو اپنے فدائی کو ہلاک و برباد کر کے دم لیتی ہے:۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

می کند بندِ غلاماں سخت تر — حریت می خواند او را بے بصر
گرمیِ ہنگامۂ جمہور دید — پردہ بر روئے ملوکیت کشید
سلطنت را جامعِ اقوام گفت — کارِ خود را پختہ کرد و خام گفت
در فضایش بال و پر نتواں گشود — با کلیدش ہیچ در نتواں گشود
گفت با مرغِ قفس "اے دردمند — آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ — او نباشد ایمن از شاہین و چرغ"
از فسونش مرغِ زیرک دانہ مست — نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست
حریت خواہی بہ پیچاکش میفت — تشنہ میر و بر نمِ تاکش میفت
الحذر از گرمیِ گفتارِ او — الحذر از حرفِ پہلو دارِ او
چشم ہا از سرمہ اش بے نور تر — بندۂ مجبور از و مجبور تر
از شرابِ ساتگینش الحذر — از قمارِ بد نشینش الحذر

از خودی غافل نہ گردد مردِ حر
حفظِ خود کن حبِّ افیونش مخور

اقبال کو سخت صدمہ ہے اس امر کا کہ مشرقی ممالک اپنی بے خبری میں تہذیبِ حاضر کے بنائے ہوئے طلسم میں پھنستے جا رہے ہیں اور وہ اس غفلت پر ماتم کناں نظر آتے ہیں: -

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق — عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار!
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار!
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

ترکانِ "جفا پیشہ" کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس — وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا — نبیِ عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے — مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

غرض یورپ کی چالیں بے پناہ ہیں اور اس کے منصوبے بے شمار۔

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ　　مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے　　بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مسولینی اپنے حریفوں اور معترضوں کو مُنہ توڑ جواب دیتا ہے، اور اس ابلہ فریب سیاست کی تہذیب کی پردہ دری کرتا ہے :۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جُرم؟　　بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
مَیں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں　　ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم　　تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں؟　　راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوبِ نَے کی آبیاری میں رہے　　اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تُم نے لُوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام　　تم نے لُوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لُوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے مَیں روا رکھتا ہوں آج

فرنگ کے سیاست دانوں نے اپنی جُوع الارض دُور کرنے کے لئے عجیب عجیب عذر تراش رکھے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک انتداب بھی ہے۔ اقبال کیا خوب اس ڈھول کا پول کھولتے ہیں :۔

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے　　نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں　　جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک رُوحِ ناشکیب و عمیق　　طریقۂ اَب و جد سے نہیں ہے بیزاری

جمہور وزیرک و پُردم ہے بیچارہ نبوی | نہیں ہے فیض مکاتب کا چشمۂ جاری

نظر وزان فرنگی کا ہے یہی فتویٰ

وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری

علامہ جانتے ہیں کہ مادیت کا پجاری ہونے کے باعث مغرب کائنات کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتا۔ اس عقدۂ مشکل کی کشود مشرق کے پاس ہے، سعد حلیم پاشا کی زبانی یہ راز سمجھاتے ہیں :-

غربیاں را زیرکی سازِ حیات | شرقیاں را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس | کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہم بر شود | نقشبندِ عالمِ دیگر شود

خیز و نقش عالمِ دیگر بنہ | عشق را با زیرکی آمیز دہ

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست | چشم شاں صاحب نظر دل مُردہ ایست

زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش | بسمل اُفتادند چوں نخچیرِ خویش

زندگی را سوز و ساز از نارِ تُست

عالمِ نو آفریدن کارِ تُست

مثنوی اقوامِ مشرق میں اس حقیقت کا اعلان مزید صراحت سے فرمایا ہے اور اپنا انقلابی پیغام زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے :-

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم | تا کند ضربِ تو دریا را دو نیم

داغم از رسوائیِ ایں کارواں | در امیرِ او ندیدم نورِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگاہ | اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

در حرم زاد و کلیسا را مرید — پردهٔ ناموس ما را بر درید
دامن او را گرفتن ابلہی است — سینهٔ او از دلِ روشن تہی است
اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد — صیدِ آہو با سگِ کورے نکرد
آہ از قومے کہ چشم از خویش بست — دل بہ غیر اللہ داد، از خود گسست
تا خودی در سینهٔ ملت بمرد — کوہ کاہے کرد و باد او را ببرد
گرچہ دارد لا الٰہ اندر نہاد — از بطونِ او مسلمانے نزاد
آنکہ بخشد بے یقیناں را یقیں — آنکہ لرزد از سجودِ او زمیں
آنکہ زیرِ تیغ گوید لا الٰہ — آنکہ از خونش بروید لا الٰہ
آں سرور آں سوزِ مشتاقی نماند — در حرم صاحب دلے باقی نماند
اے مسلماں اندریں دیرِ کہن — تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن
جہد با توفیق و لذت در طلب — کس نیابد بے نیازِ نیم شب
زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس

اقبال کا خطاب

اقبال کا پیغام جو تمام دنیا کے نام ہے پہلے تفصیل کے ساتھ آچکا ہے چونکہ اپنی تصنیفات میں علامہ نے جا بجا مختلف ممالکِ مشرق و مغرب سے خطاب کیا ہے جس میں ان کے حالات کے مطابق مخصوص نصیحتیں کی ہیں اور مشورے

دیئے ہیں۔ اِس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں علیحدہ بھی درج کر دیا جائے ہندوستان کی بابت آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ وطنیت کے عنوان کے ماتحت لکھ دیا گیا ہے۔ اِس لئے یہاں اس کی تکرار کی ضرورت نہیں ؂

مغرب سے

اقبالؔ نے سیاستِ مغرب پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ ابھی گزر چکا۔ یورپ کے احوال پر نظر ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مغرب کو چنگ و رباب، رقص و نشاط، لاطینی یا لادینی کے باعث قوت حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی طاقت کا راز علمی تحقیقات اور فنی ایجادات میں پوشیدہ رہا ہے :۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دختران بے حجاب
نے زسحرِ ساحرانِ لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است — نے فروغش از خطِ لاطینی است

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

لیکن عقل کبھی عشق کے بغیر تکمیل نہیں پا سکتی۔ آنکھ صرف گل و لالہ کے رنگ کو دیکھتی ہے۔ رنگ کے پسِ پردہ جو کچھ ہے وہ اِس کے ادراک سے باہر ہے۔ حکمت و فلسفہ بے پایاں ہی، مگر عشق و محبت سے اس کا دامن تہی ہے۔ بلکہ فلسفہ تو عشق کی راہ مارتا اور محبت کی تخلیق کے مانع آتا ہے۔ مگر حقیقت عشق ہی میں پوشیدہ ہے۔ عقل نے تحقیق و تدقیق سے دُنیا کو منقلب کر دیا۔ پانی میں آگ

لگادی۔ ریگ کو زر بنا دیا۔ مگر دلوں میں محبت کی اکسیر نہ پیدا کر سکی۔ لیکن موجودہ صُورت رہنے والی نہیں۔ عقل و حکمت کو بقا نہیں۔ پائداری صرف عشق کو حاصل ہے اس لئے علّامہ مغرب کو اس کی غفلت پر متنبہ کرتے رہتے ہیں اور مائدۂ عشق سے لقمہ چینی کی دعوت دیتے ہیں۔ پیامِ مشرق میں یہ پیغام بتفصیل مذکور ہے۔ مَیں جستہ جستہ اشعار منتخب کرکے درج کرتا ہوں:۔

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را این بجگر می زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است

چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ
آہ زاں نقد گراں مایہ کہ درباختۂ

. . . .

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

. . . .

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک
آں کہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است

دگر است آنکہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم
آں کہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است

دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے
ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

. . . .

وقت آنست کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و سر تازہ کنیم

. . . .

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم — چشمِ ہر ذرّہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز — شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم
کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم — پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک — بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

خرّم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

. . . .

مشرق سے

اقوامِ مشرق یورپ کی کورانہ تقلید میں گرفتار رہیں۔ وہ اس راز سے ناواقف ہیں کہ مغرب کی قوّتِ علم و فن میں مضمر ہے۔ مشرق اپنی تن آسانی کی بدولت صرف

لہوولعب کے وسائل واسباب کی پیروی کرنے لگتا ہے اور اس طرح اپنی زندگی پر ضربِ کاری لگا کر خود موت کو دعوت دیتا ہے :-

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب — باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب

. . . .

بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود — می برد از غربیاں رقص و سرود
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو — علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را — فطرتِ او در پذیرد سہل را

سہل را جُستن دریں دیرِ کہن
ایں دلیل آنکہ جاں رفت از بدن

اقبال اقوامِ شرق کو اس حماقت پر جو مُنتج بہ ہلاکت ہے، متنبہ کرتے ہیں اور مشرق کے ضمیر میں ایک انقلاب کو جلوہ گر پا کر اس کے مستقبل کی طرف سے اطمینان کا اظہار کرتے ہیں :-

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟ — باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید — شب گذشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برّہ ئے — ہر زماں اندر کمینِ برّہ ئے
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست — آدمیت را غمِ پنہاں ازوست
در نگاہش آدمی آب و گل است — کاروانِ زندگی بے منزل است



اس کے بعد فرماتے ہیں کہ مشکلاتِ انسان کا حل مشرق کے پاس موجود ہے، اور ایشیا کو نغمۂ بیداری سناتے ہیں:-

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو — مومنِ خود کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست — آبروئے خاوراں در دستِ تست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند — رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اہلِ حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

. . . .

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں یدِ بیضا برآر از آستیں
خیز و از کارِ امم بکشا گرہ — نشۂ افرنگ را از سر بنہ

نقشے از جمعیتِ خاور فگن
واستاں خود را ز دستِ اہرمن

علامہ اقوامِ مشرق سے صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ جب تک وہ فرنگ کے پنجہ سے آزاد نہ ہوں گی، جب تک ان کو درآمد و برآمد پر اختیار و قابو نہ ہوگا اور جب تک وہ صنعت و حرفت کو ترقی نہ دیں گی۔ ان کی نجات ناممکن ہے سودیشی کی تبلیغ اس سے زیادہ واضح کیا ہو سکتی ہے؛

آنچہ از خاکِ تو رست اے مردِ حر — آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند — خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر — چرب دستیہائے یورپ را نگر
قالی از ابریشمِ تو ساختند — باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسوں خورد — رنگ و آبِ او ترا از جا بُرد
وائے آں دریا کہ موجش کم تپید
گوہرِ خود را ز غواصاں خرید

اقبال کو مشرق کا مستقبل روشن و درخشاں نظر آتا ہے۔ یہ جہاں دوست، نامی عارفِ ہندی فلکِ قمر پر ملتا ہے۔ اس کی زبانی پیشگوئی فرماتے ہیں :-

گفت "ہنگامِ طلوعِ خاور است — آفتابِ تازہ او را در بر است
لعل ہا از سنگِ رہ آید بروں — یوسفانِ او ز چہ آید بروں
رستخیزے در کنارش دیدہ ام — لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام
رخصت بندد از مقامِ آذری — تا شود خوگر ز ترکِ بت گری
اے خوش آں قومے کہ جانِ او تپید — از گلِ خود خویش را باز آفرید
عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے

حضرت علامہ ایک اور عجیب و دلچسپ پیشینگوئی کرتے ہیں :-

پانی بھی مسخر ہے، ہوا بھی ہے مسخر — کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب — ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

افغان سے

علامہ دیکھتے ہیں کہ زندگی اور سیاست کے میدان میں افغانستان سب سے پیچھے ہے۔ حالانکہ افغانوں میں ہمت، شجاعت، حوصلہ، عزم، استقلال کسی چیز کی کمی نہیں۔ اِس لئے اُن کو اُکساتے اور اُبھارتے ہیں:۔

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندُستان
تُو بھی اے فرزندِ کہستاں، اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز!
جس نے اپنا کھیت نہ لوپا، وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اُونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تُند نہیں ہیں وہ کیسا طُوفان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قُربان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

افغان قبائل آپس میں متحد نہیں، اور آئے دن اُن میں خانہ جنگیاں اور باہمی نزاع ہوتے رہتے ہیں۔ اقبال ان کو وحدتِ قومی کی دعوت دیتے ہیں:۔

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سُوری نے — کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے اُنہیں نام وزیری و محسود — ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کہسار کی مُسلمانی — کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بُتوں کا زنّاری

وہی حرم ہے، وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری

خوشحال خاں خٹک[1] کی زبان سے یہی پیغام پہنچاتے ہیں:۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم — کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

[1] خوشحال خاں خٹک پشتو زبان کا مشہور وطن دوست شاعر تھا جس نے افغانستان کو مغلوں سے آزاد کرانے کے لئے سرحد کے افغانی قبائل کی ایک جمعیت قائم کی۔ قبائل میں صرف آفریدیوں نے آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔ اس کی تقریباً ایک سو نظموں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔ (حاشیہ بالِ جبریل)

مغل سے کسی طرح کمتر نہیں　　کہستاں کا یہ بچۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات　ق　وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اُڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

مغربی تہذیب یہاں پہنچی، اس ملک اور قوم کو بربادی کی جانب لے جانے کی۔ افغانستان پر بھی اس کی نظر ہے۔ اقبال اس کے عواقبِ بد کو جانتے ہیں اس لئے افغانوں کو متنبہ کئے دیتے ہیں:۔

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں اُلجھا تُو　　دارُو ہے ضعیفوں کا "لَا غَالِبَ اِلَّا هُوْ"
صیادِ معانی کو یورپ سے ہے نومیدی　　دل کش ہے فضا لیکن بے نافہ تمام آہُو

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں　　جو ہُوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری　　اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

افرنگ ز خود بے خبرت کرد، دگر نہ　　اے بندۂ مومن، تُو بشیری تُو نذیری

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے　　مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی کا نفس

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن　　قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے　　علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

خودی کے عرفان، خدا کی معرفت، جرأتِ رندانہ، حوصلہ مردانہ اور جوشِ عمل میں افغانیوں کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے:-

محرم خودی سے جس دم ہوا فقر — تو بھی شہنشاہ، میں بھی شہنشاہ
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش — جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے — اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو
فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند — شام اس کی ہے مانندِ سحر صاحبِ پرتو
وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی برکت سے — ٹپکے بدنِ مہر سے شبنم کی طرح ضو

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد — ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو — کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

جس کے پرتو سے منور رہی تیری شبِ دوش — پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغِ خاموش
مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانہ کا گلہ — بندۂ حر کے لئے نشترِ تقدیر ہے نوش

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی — بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی
جو سختیٔ منزل کو سامانِ سفر سمجھے — اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی — کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی

دُنیا ہے روایاتی، عقبیٰ ہے مناجاتی
در باز دو عالم را این است شہنشاہی

افغان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ کے لئے بندگی ننگ و عار ہے:-

باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظ بدن کے لئے رُوح کو کردوں ہلاک
اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک؟

اقبال کو افغان کے مستقبل سے بہت امیدیں ہیں، اور علامہ کی رائے میں اس غیور و جسور قوم کو ہرگز زوال نہیں ہے:-

کڑکا سکندر بجلی کی مانند
تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ
نادر نے لُوٹی دِلّی کی دولت
اِک ضربِ شمشیر افسانہ کوتاہ
افغان باقی، کہسار باقی
الحکم للہ، الملک للہ

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
رُوح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

یہ حسن و لطافت کیوں؟ وہ قوت و شوکت کیوں؟ — بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن — بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

افغانستان کی ترقی و زوال پر تمام ایشیا کا عروج و ادبار منحصر ہے۔ اس لئے افغانیوں پر سارے مشرق کی نگاہ لگی ہوئی ہے:-

آسیا یک پیکر آب و گل است — ملت افغاں در آں پیکر دل است
از فساد او فساد آسیا — در کشاد او کشاد آسیا
تا دل آزاد است آزاد است تن — ورنہ کاہے در رہ باد است تن
ہمچو تن پابند آئین است دل — مردہ از کیں زندہ از دیں است دل

قوت دیں از مقام وحدت است
وحدت ار مشہود گردد ملت است

ایران سے

پستی و ادبار کا ایک عرصہ گزر جانے کے بعد ایران خواب غفلت سے چونکا۔ انقلاب نے کئی پلٹے کھائے لیکن آخرکار رضا شاہ پہلوی کے عزم و استقلال نے ایران کی آزادی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اقبال اس سے خوش ہیں اور اقوام مشرق کے لئے رضا شاہ کو نمونہ بتاتے ہیں:-

آنچہ بر تقدیر مشرق قادر است — عزم و حزم پہلوی و نادر است

پہلوی آں وارثِ تختِ قباد ناخنِ او عقدۂ ایراں کشاد
نادر آں سرمایۂ دُرّانیاں
آں نظامِ ملّتِ افغانیاں

لیکن ایران نے جو ترقی و تہذیب کی راہ اختیار کی ہے، اس میں علامہ کو خطرات نظر آتے ہیں، اور آپ ایران کو آگاہ فرماتے ہیں:-

من فدائے آنکہ خود را دیدہ است عصرِ حاضر را بچشمِ سنجیدہ است
غربیاں را شیوہ ہائے ساحری است تکیہ جز بر خویش کردن کافری است

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق اُن کو آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

آنسوئے افلاک پر نادر شاہ سے زندہ رود کی ملاقات ہوتی ہے۔ اور نادر شاہ ایران کا حال دریافت کرتا ہے تو زندہ رود کہتا ہے کہ مدّتوں میں جا کر کہیں اب ایران خوابِ گراں سے بیدار ہوا تھا۔ لیکن مغرب کے بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ ملک و نسب کے دیوتا نے اس پر ایسی جادو کی چھڑی پھیری کہ اُسی کا پجاری بن گیا:-

بعد مدّت چشمِ خود بر خود کشاد لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ
کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب
روزگارِ او تہی از واردات از قبورِ کہنہ می جوید حیات

باوطن پیوست و از خود در گذشت   دل به رستم داد و از حیدر گذشت

نقش حیرت می پذیرد از فرنگ
سرگذشت خود بگیرد از فرنگ

ملّتِ ایرانیہ نے کبھی یہ غور نہ کیا کہ یہ راستہ صراطِ مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے دینِ مجوس ایک فرسودہ و کہنہ نظام تھا جو اپنی خامیوں کی بدولت قوم کے کام نہ بنا سکا، اور ملک کو تباہی و بربادی کی جانب لے گیا۔ وہ تو خدا کی رحمت ہوئی کہ ایران رومۃ الکبریٰ اور بابل کی مانند تباہ و برباد نہ ہو گیا۔ اور خاکِ عرب نے صحرا سے اٹھ کر اس کی رہنمائی کی اور سطوتِ رفتہ و شوکتِ گزشتہ اُسے از سرِ نو بخش دی ہے

پیر ہیٔ ایراں زمانِ یزدجرد   چہرہ او بے فروغ از خونِ سرد
دین و آئین و نظامِ او کہن   شید و تارِ صبح و شامِ او کہن
موج مے در شیشۂ تاکش نبود   یک شرر در تودۂ خاکش نبود
تا ز صحرائے رسیدش محشرے   آنکہ داد او را حیاتِ دیگرے
ایں چنیں حشر از عنایاتِ خداست   پارس باقی، رومۃ الکبریٰ کجاست؟
آنکہ رفت از پیکرِ او جانِ پاک   بے قیامت بر نمی آید ز خاک
مردِ صحرائی با یراں جاں دمید   باز سوئے ریگ زارِ خود رمید
کہنہ را از لوحِ ما بسترد و رفت   برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت

آہ احسانِ عرب نشناختند
از تَشِ افرنگیاں بگداختند

زندہ رود کی زبان سے ایران کی روح کے یوں مردہ رہ جانے اور طلسمِ مغرب میں اسیر ہو جانے کا حال سن کر حکیم ناصر خسرو علوی کی روح بیقرار ہو جاتی ہے اور ملّتِ ایرانی کو پیغام دیتی ہے :-

"دست را چوں مرکبِ تیغ و قلم کردی مدام | ہیچ غم گر مرکبِ تن لنگ باشد یا عرن
از سرِ شمشیر و از نوکِ قلم زاید ہنر | اے برادر ہمچو نور از نار و نار از نارون
بے ہنرداں نزدِ بیدیں ہم قلم ہم تیغ را | چوں نباشد دیں نباشد کلکِ آہن را ثمن
دیں گرامی شد بدانا و بناداں خوار گشت | پیشِ ناداں دیں چو پیشِ گاؤ باشد یاسمن
ہمچو کرپاسے کہ از یک نیمہ زو الیاس را
کرتہ آید و ز دگر نیمہ یہودی را کفن"

عرب

جب تک عرب اسلام کے آئین و نظام کی روح کو سمجھتے رہے اور اس اساس کو مضبوط پکڑے رہے۔ ان میں وحدت رہی۔ وحدت کی برکت سے وہ سارے عالم پر حکمرانی کرتے رہے۔ جبّاروں اور قہّاروں کو خدا نے ان کے ہاتھوں ملیامیٹ کر دیا۔ اور بحر و بر سب ان کے زیرِ نگیں آ گیا۔ تیغِ لا کی یہ سب کارفرمائیاں تھیں۔ "نقشِ غیر اللہ" دل میں نہ ہو تو پھر انسان کی قوّت کے سامنے ہر شے سر جھکا دیتی ہے۔

با تو میگویم ز ایّامِ عرب | تا بدانی پختہ و خامِ عرب
ریز ریز از ضربِ او لات و منات | در جہات آزاد از بندِ جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او | قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد

عالمے در آتشِ او مثلِ خس
ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس

اندریں دیرِ کہن پیہم تپید
تا جہانے تازۂ آمد پدید

بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست
ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست

اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند
از کنارِ جوئے او آوردہ اند

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

لیکن جب ملتِ عربیہ نے لردانِ فرنگی سے اعتصام کیا، اور اپنی خودی کو بھلا دیا، تو اُن کی وحدتِ قومی پارہ پارہ ہو گئی، اور وہی قوم جس نے سارے عالم کو تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا تھا، صفِ آخر میں جا پڑی اور دوسروں کی دست نگر بن گئی:۔

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد
سارباں را راکبِ تقدیر کرد

بانگِ تکبیر و صلوٰت و حرب و ضرب
اندراں غوغا کشاد شرق و غرب

اے خوش آں مجذوبی و دل بُردگی
آہ زیں دل گیری و افسردگی

کارِ خود را اُمتاں بُردند پیش
تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش

اُمتے بودی اُمم گردیدۂ
بزمِ خود را خود ز ہم پاشیدۂ

ہر کہ از بندِ خودی وارست مُرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست مُرد

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
رُوحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر

از فریب او اگر خواہی اماں اشترانش را ز حوض خود براں

حکمتش ہر قوم را بیچارہ کرد وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد

تا عرب در حلقۂ دامش فتاد

آسماں یک دم اماں اورا نداد

عرب کو اس کی شوکتِ رفتہ اور سطوتِ گزشتہ یاد دلا کر علامہ موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہیں، اور پستی و زبوں حالی کے اسباب پر تنبیہ فرماتے ہیں۔ مہدی سوڈانی کی روح عرب سے خطاب کرتی ہے:۔

گفت "اے روحِ عرب بیدار شو چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو

اے فواد، اے فیصل، اے ابنِ سعود تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود

زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت

خاکِ بطحا خالدے دیگر بزاے نغمۂ توحید را دیگر سرائے

اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر برنخیزد از تو فاروقے دگر؟

اے جہانِ مومنانِ مشک فام از تو می آید مرا بوئے دوام

زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر؟ تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر؟

بر مقامِ خود نیائی تا بکے؟ استخوانم در لحد نالد چو نے

از بلا ترسی حدیثِ مصطفیٰ است "مرد را روزِ بلا روزِ صفا است

ساربان یاراں بہ یثرب ما بہ نجد

آں حدی کو ناقہ را آرد بوجد

فلسطینی عرب سے کہتے ہیں:۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ / میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں / فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

ملّتِ عربیہ سے خطاب کرتے اور وحدت و بیداری و عمل کا پیغام دیتے ہیں

عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر / در بدن باز آفریں رُوحِ عمرؓ

قوّت از جمعیّتِ دینِ مبیں / دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں

تا ضمیرش رازدانِ فطرت است / مردِ صحرا پاسبانِ فطرت است

سادہ و طبعش عیارِ زشت و خوب / از طلوعش صد ہزار انجم غروب

بگذر از دشت و در و کوہ و دمن / خیمہ را اندر وجودِ خویش زن

طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز / ناقہ را سر دہ بمیدانِ ستیز

عصرِ حاضر زادۂ ایامِ تست / مستیٔ او از مئے گلفامِ تست

شارحِ اسرارِ او تو بودۂ / اوّلیں معمارِ او تو بودۂ

تا بفرزندی گرفت او را فرنگ / شاہدے گردید بے ناموس و ننگ

گرچہ شیریں است و نوشیں است او / کج خرام و شوخ و بیدیں است او

مردِ صحرا! پختہ تر کن خام را
بر عیارِ خود بزن ایام را

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار / اگر نہ ہو اُمرائے عرب کی بے ادبی

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمت کو   وصالِ مصطفوی، افتراق بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

ترکی سے

یورپ کا یہ "بیمار" صدیوں سے "مہلک امراض" میں مبتلا تھا جنگِ عظیم کے بعد اِن "امراض" نے "مرض الموت" کی شکل اختیار کر لی، اور دولِ یورپ کے طبیبوں نے "مرتے کو ماریں شاہ مدار" کے مصداق اس کی زندگی کو سپردِ موت کر دینا چاہا۔ مگر ترکی کے نوجوان سرفروشوں نے اتاترک (غازی مصطفےٰ کمال پاشا) کی سرکردگی میں امراض کا ایسا علاج کیا کہ ملّتِ ترکیہ کو تندرست و توانا اقوامِ دول کی صف میں لاکھڑا کیا۔ اُس وقت اُمّتِ مسلمہ کے بہی خواہوں کو غازیِ اعظم سے بہت اُمیدیں تھیں۔ علاّمہ مرحوم نے ۱۹۲۲ء میں اتاترک سے خطاب کر کے کہا تھا:—

اُمّیدے بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او   واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شرر باختہ رنگے بود است   نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم
نکتۂ عشق فرو شست ز دل پیرِ حرم   در جہاں خوار باندازۂ تقصیر شدیم
باد صحراست کہ با فطرتِ ما در سازد   از نفسہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم
آہ آں غلغلہ کز گنبدِ افلاک گزشت   نالہ گردید چو پابندِ بم و زیر شدیم
اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم   در بغل تیر و کماں کشتۂ نخچیر شدیم

"ہر کجا راہ و ہد اسپ بر آں تاز کہ ما

بارہا مات دریں عرصہ بتدبیر شدیم" (نظیری)

لیکن اتاترک نے اتحادیوں کے پنجہ سے رہائی کے بعد مغرب کی کورانہ تقلید کی، اور فوجی قوت کے ذریعہ ان ناعاقبت اندیشانہ اصلاحات کو رواج دیا۔ اس سے عالمِ اسلامی کے دردمندوں کو دُکھ پہنچا۔ اس لئے کہ اس "مجددیت" سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ یورپ کو خود جن باتوں کی مضرت کا احساس ہو چکا ہے انہی چیزوں کو ترکی اور ایران اختیار کر رہے ہیں۔ ان اللہ کے بندوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ قرآنِ پاک کی تعلیمات ان کی تمام مشکلات کا حل ہیں۔ یہ نعمت عظمےٰ ان کے پاس موجود ہے۔ پھر بھی یہ مغرب کی ملمع کاریوں پر رتجھے جاتے ہیں۔

آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد (حافظ)

علامہ اسی حقیقت کی جانب ترکوں کو متوجہ کرتے ہیں:۔

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا ۔۔۔ نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی ۔۔۔ کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن

زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

سعید حلیم پاشا کی زبانی فرماتے ہیں:۔

مصطفےٰ کو از تجدد می سرود ۔۔۔ گفت نقشِ کہنہ را باید زدود

نو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات ۔۔۔ گر ز افرنگ آیدش لات و منات

ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست ۔۔۔ تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست

سینۂ او را دمے دیگر نبود
در ضمیرش عالمے دیگر نبود

لاجرم با عالمِ موجود ساخت
مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت

طرفگیہا در نہادِ کائنات
نیست از تقلید تقویمِ حیات

زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور
جانش از تقلید گردد بے حضور

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است
ہر جہاں اندر بر او چوں قبا است

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

رُوس سے

کائناتِ عالم کے وجود کا راز صرف لا و الا میں پوشیدہ ہے۔ پہلے نفی ہے اور بعد کو اثبات۔ لیکن جب تک دونوں کا امتزاج نہ ہو یعنی جب تک نفی سے گزر کر مقامِ اثبات تک رسائی نہ ہو انسان کمال نہیں حاصل کر سکتا۔

نکتہ می گویم از مردانِ حال
امتاں را لا جلال الا جمال

لا و الا احتسابِ کائنات
لا و الا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون
حرکت از لا زاید از الا سکون

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

جو اقوام رمزِ لا الٰہ سے واقف ہوتی ہیں، اور ان میں خودی، خود داری، خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے، وہ عالم کو تہ و بالا کر دیتی ہیں۔ لا محکوم کو حاکم کے پنجہ سے اور غلام کو آقا کے چنگل سے آزادی بخشتا ہے:۔

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید — از گِلِ خود خویش را باز آفرید

پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات

از جنونش ہر گریباں چاک نیست — درخورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد — می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز — تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر — ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

لا مقامِ ضربہائے پے بہ پے — ایں غو رعد است نے آوازِ نے

ضربِ او ہر بود را سازد نبود

تا بروں آئی ز گردابِ وجود

ملتِ روسیہ نے نفی کے مقام تک رسائی پائی، اور تمام پرانے رسوم و قیود سے آزادی حاصل کی۔ لیکن وہ نفی جس سے اثبات لاحق نہ ہو۔ اور وہ لا جو الا سے بے بہرہ رکھے، موجبِ نجات نہیں بلکہ منجر بہلاکت ہے۔ یہی نکتہ اقبال نے روس کو سمجھانا چاہا ہے:۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

. . . .

. . . .

در مقامِ لا نیاساید حیات　　سوئے الّا می خرامد کائنات

لا و الّا سازو برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

یہی راز علامہ جمال الدین افغانی کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ملّتِ روسیہ پر واضح کردی ہے کہ رُوس ہمیشہ اقوامِ مشرق سے وابستہ رہا ہے۔ اِس لئے اس کو اپنی نجات کے لئے اب بھی مشرق سے ہی رجوع کرنا پڑے گا:۔

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی　　دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں　　قیصریت را شکستی استخواں
تا بر افروزی چراغے در ضمیر　　عبرتے از سرگذشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گزار اندر نبرد　　گردِ ایں لات و ہبل دیگر مگرد
ملّتے می خواہد ایں دُنیائے پیر　　آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر
باز می آئی سُوئے اقوامِ شرق　　بستہ ایامِ تو با ایامِ شرق
تو بجاں افگندۂ سوزِ دگر　　در ضمیرِ تو شب و روزے دگر
کہنہ شُد افرنگ را آئین و دیں　　سُوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں
کردۂ کارِ خداونداں تمام　　بگذر از لا جانبِ الّا خرام

در رگِ رازِ لا اگر جوئندۂ   تارۂ اثبات گیری زندۂ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اورا اساسِ محکمے؟

پھر فرماتے ہیں کہ وہ "اساسِ محکم" "صرف تعلیماتِ قرآن میں پوشیدہ ہے"
چونکہ یہ اشعار تفصیل سے پہلے نقل کر چکا ہوں، اِس لئے صرف چند متفرق شعر
پیغام کو مکمل کرنے کے لئے لکھتا ہوں:۔

داستاں کہنہ ششتی باب باب   فکر را روشن کُن از اُمّ الکتاب
جز بقرآں ضیغمی روباہی است   فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
مثل حق پنہاں وہم پیداست ایں   زندہ و پایندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیر ہائے شرق و غرب   سرعتِ اندیشہ پیدا کُن چو برق
آفریدی شرع و آئینے دگر   اندکے با نورِ قرآنش نگر

از بم و زیرِ حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

نژادِ نو سے

اقبالؔ کا تمام کلام ان کا پیغام ہے جس میں اُنہوں نے نژادِ نو ہی کو اپنا
اصلی مخاطب بنایا ہے۔ مگر "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر بعض اساسی امور
کو جن کی جانب علامہ نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے لکھتا ہوں:۔
آپ عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ خودی کے عرفان

ہیں معراجِ ارتقا کا راز پوشیدہ ہے۔ دورِ جدید کی رعنائیاں اپنی جانب مائل کر کے ہم کو راہِ راست سے بھٹکاتی ہیں۔ ہم کو اُن سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنا مقصد پیشِ نظر رکھ کر جادۂ مطلوب پر سرگرمِ طلب رہنا ضروری ہے:۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سُراغ خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

تن آسانی اور تن پروری، تنعم اور تعیش تعلیماتِ اسلام کے منافی ہیں

اسلام نے غنائے نفس کی تعلیم دی ہے۔ استغنا سے انسان میں حوصلہ اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ یاس ہمارے مشرب میں کفر ہے۔ فقر ہمارے لئے موجبِ فخر ہے اگر استغنا، ہمت، عزم، اُمید اور فقر کے بھولے ہوئے اسباق ہم کو تازہ ہو جائیں تو پھر زمانہ ہمارے اشاروں پر حرکت کرنے لگے گا:۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس قطعہ میں بھی انہی اصولوں کی جانب توجہ دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میری تعلیمات پر غور و خوض کرو، یہ تمہارے لئے موجبِ نجات ہیں۔ یورپ کی تقلید نہ کرو کہ یہ تباہی کا باعث ہے :-

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

جاوید نامہ کے آخر میں اپنی تمام تعلیمات اور پیغام کا خلاصہ خطاب بہ جاوید" (سخنے بہ نژادِ نو) کے عنوان سے درج فرمایا ہے۔ سب کا اندراج تو موجبِ اطناب ہو گا۔ جستہ جستہ اشعار جو تعلیمات کی جان ہیں ملاحظہ کیجئے :-

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر
سوختن در لا اِلٰہ از من بگیر (توحید)

لا اِلٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں

مہر و مہ گردد ز سوزِ لا اِلٰہ
دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ

ایں دو حرفِ لا اِلٰہ گفتار نیست
لا اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

زیستن با سوز او قہاری است | لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

. . . .

علم تا سوزے نگیرد از حیات | دل نہ گیرد لذتے از واردات (علم و عشق)
علم جز شرحِ مقاماتِ تو نیست | علم جز تفسیرِ آیاتِ تو نیست
سوختن می باید اندر نارِ حس | تا بدانی نقرہ خود را ز مس

. . . .

لذتِ سیر است مقصودِ سفر | گر نگہ بر آشیاں داری مپر (علو ہمت)
ماہ گردد تا شود صاحب مقام | سیرِ آدم را مقام آمد حرام
زندگی جز لذتِ پرواز نیست | آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور
رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور

سرِ دیں، صدقِ مقال اکلِ حلال | خلوت و جلوت تماشائے جمال (صدقِ مقال)
در رہِ دیں سخت چوں الماس زی | دل بحق بربند و بے وسواس زی (سخت کوشی)

. . . .

دیں سراپا سوختن اندر طلب | انتہایش عشق و آغازش ادب (ادب)
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست | بے ادب بے رنگ و بو بے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب | روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا | یادِ عہدِ مصطفےٰ[ص] آید مرا
از زمانِ خود پشیماں می شوم | در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم

ستر زن یا زوج یا خاکِ لحد
ستر مرداں حفظِ خویش از یارِ بد (ستر)

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است (بدگوئی)

آدمیت احترامِ آدمی
با خبر شو از مقامِ آدمی (رواداری)

آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن
بر طریقِ دوستی گامے بزن

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

. . . .

گرچہ باشی از خداوندانِ دہ
فقر را از کف مدہ از کف مدہ (فقر)

سوزِ او خوابیدہ در جانِ تو ہست
ایں کہن مے از نیاگانِ تو ہست

در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ
نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ (مال دنیا)

اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر
می شود از کثرتِ نعمت ضریر

کثرتِ نعمت گداز از دل برد
ناز می آرد نیاز از دل برد

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام
نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام

من فدائے آنکہ درویشانہ زیست (درویشی)
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

اقبال خود اپنی نظر میں

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

حضرت علامہ کا کلام ان کی انفرادیت و شخصیت اور ان کے تخیل و پیغام کا آئینہ دار ہے، اس لئے اس عنوان کے ماتحت اس کا احاطہ ناممکن ہے، ورنہ شاید بہت صفحات سیاہ کرنے پڑیں۔ پھر بھی آپ نے خود اپنی بابت اور اپنے کلام کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے کچھ اشعار خاص ترتیب کے ساتھ درج کرتا ہوں۔

اقبال نے اپنے مقام بلند کی جانب اکثر غزلوں مثنویوں اور قطعات میں توجہ دلائی ہے۔ اور اپنی خودی، عشق، شوق، سرمستی، درویشی، علوِ ہمت اور سیرِ دوام وغیرہ کی حقیقت واضح فرمائی ہے۔ "مشتے نمونہ از خروارے" ملاحظہ کیجئے

از دیرِ مغاں آیم بے گردشِ صہبا مست — در منزلِ لا بودم از بادۂ الا مست
دانم کہ نگاہِ او ظرفِ ہمہ کس بیند — کز دست مرا ساقی از عشوہ و ایما مست
وقت است کہ بکشایم میخانۂ رومی باز — پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست
ایں کارِ حکیمے نیست، دامانِ کلیمے گیر — صد بندۂ ساحل مست، یک بندۂ دریا مست
دل را بچمن بردم از بادِ چمن افسرد — میرد بہ خیاباں ہا ایں لالۂ صحرا مست
از حرفِ دل آویزش اسرارِ حرم پیدا — دی کافرکے دیدم در وادیِ بطحا مست
سینا ست کہ فاران است، یا رب چہ مقام است ایں؟

هر ذرهٔ خاکِ من چشمے است تماشا مست

درونِ سینهٔ ما سوزِ آرزو ز کجاست؟
سبو ز ماست ولے باده در سبو ز کجاست؟

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم
بہ ذرهٔ ذرهٔ ما درد جستجو ز کجاست؟

نگاهِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد
جنونِ ما ز کجا شورِ ہائے و ہو ز کجاست

انجم بہ گریباں ریخت، ایں دیدهٔ تر ما را
بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوقِ نظر ما را

ہر چند زمیں سائیم، برتر ز ثریا ئیم
دانی کہ نمی زیبد عمرے چو شرر ما را

شام و سحرِ عالم از گردشِ ما خیزد
دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر ما را

ایں شیشهٔ گردوں را از باده تہی کردیم
کم کاسہ مشو ساقی، میناے دگر ما را

شاہانِ جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست
ایں راہ گزر ما را، آں راہ گزر ما را

از مقامِ خود نمی دانم کجاست
ایں قدر دانم کہ از یاراں جداست

اندرونم جنگ بے خیل و سپہ
بیند آں کو ہم چو من دارد نگہ

بے خبر مرداں ز رزمِ کفر و دیں
جانِ من تنہا چو زین العابدینؓ

از مقام و راہ کس آگاہ نیست
جز نوائے من چراغِ راہ نیست

غرقِ دریا طفلک و برنا و پیر
جاں بساحل بردہ یک مردِ فقیر

برکشیدم پرده ہائے ایں وثاق
ترسم از وصل و بنالم از فراق

من فدائے ایں دلِ دیوانۂ
ہر زماں بخشد دگر ویرانۂ

چوں بگیرم منزلے گوید کہ خیز
مردِ خود رس بحر را داند قفیز

زانکہ آیاتِ خدا لا انتہاست
اے مسافر جادہ را پایاں کجاست؟

ہوائے خانہ و منزل ندارم
سرِ راہم غریبِ ہر دیارم

ازل تاب و تبِ پیشینۂ من
ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

میندیش از کفِ خاکے میندیش
بجانِ تو کہ من پایاں ندارم

ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقامِ خویش بر من فاش گشت

حرفِ شوق آموختم و اسوختم
آتشِ افسردہ باز افروختم

با من آہِ صبحگاہے دادہ اند
سطوتِ کوہے بکاہے دادہ اند

دارم اندر سینہ نورِ لا اِلٰہ
در شرابِ من سرورِ لا اِلٰہ

فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست
جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

از چشمِ ساقیِ مستِ خرابم
بے مے خرابم بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی
بینم نہ بینم در پیچ و تابم

در تلاشِ جلوہ ہائے پے بہ پے
طے کنم افلاک و می نالم چو نے

کیشِ ما مانندِ موج تیز گام
اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے رومؔ و تبریزؔ است

اقبال قبا پوشد در کارِ جہاں کوشد دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

کہاں سے تُو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

کیا صُوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے
کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک یا مَیں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے
بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

خودی نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف پُوچھو جو تصوّف کی تو منصُور کا ثانی

اقبال کو قوم و مِلّت کا غم ہے، اور اُنھوں نے اس کی مشکلات کا حل سوچنے میں بہت جگر کاوی کی ہے:-

آسیا آں مرز و بوم آفتاب غیر بیں، از خویشتن اندر حجاب

تاختم بر عالمِ افکارِ او   بر دریدم پردۂ اسرارِ او

درمیانِ سینہ دل خوں کردہ ام
تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما   اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام   تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما

تا آفتاب بے خبر زد زخاور   مانندِ انجم بستند خوابم

مُلک و مِلّت کو راہِ راست دکھانا اور پستی و مذلّت سے نکالنا اقبال کا

مقصدِ زندگی ہے:۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں   مجھے ہے حُکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

مقابلہ تو زمانے کا خُوب کرتا ہوں   اگرچہ مَیں نہ سپاہی ہوں نے امیرِ جنُود

مجھے خبر نہیں، یہ شاعری ہے یا کچھ اور   عطا ہُوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

عطا ہُوا خس و خاشاکِ ایشیا مجھ کو   کہ میرے شعلہ میں ہے سرکشی و بیباکی

مرے گلو میں ہے اِک نغمہ جبریل آشوب   سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کیلئے

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ۔۔۔ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمتِ عامِ خویش را ۔۔۔ بندِ نقاب برکشا ماہِ تمامِ خویش را
ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام ۔۔۔ خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ و شامِ خویش را

اگر ز میکدۂ من پیالہ گیری ۔۔۔ ز مشتِ خاک جہانے بیا نوائی کرد
چساں بہ سینہ چراغے فروختی اقبال ۔۔۔ بخویش آنچہ توانی بما توانی کرد

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست ۔۔۔ سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را
وقت برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام ۔۔۔ خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ ۔۔۔ عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

علامہ کا کلام خیال آرائی اور قافیہ پیمائی پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کے اشعار سر تا سر پیغام ہیں جن سے دُنیا کو بصارت و بصیرت حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر کوتاہ بیں اور نکتہ چیں کا کوئی علاج نہیں:۔

خزاں میں بھی کب آسکتا تھا میں صیاد کی زد میں ۔۔۔ مری غمّاز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی
اُلٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں ۔۔۔ حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں ۔۔۔ وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کجکلاہی

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

فکرِ رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق
پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشانِ شما
حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے
مرے سبو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل سے ہے جس کی قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرق ناک

فقیہہ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری — مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد
کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے — کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

بیا بمجلسِ اقبال یک دو ساغر کش — اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

بیا کہ دامنِ اقبال را بدست آریم — کہ او ز خرقہ فروشانِ خانقاہی نیست

بیا کہ من زِ خُمِ پیرِ رُوم آوردم — مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام، دانی کہ چیست؟
یک چمن گُل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم، طریقِ شاہبازی را

عیبِ من کم جوے و از جامم عیارِ خویش گیر
لذّتِ تلخابِ من بے جانِ غم فرسودنے

زبورِ عجم پڑھنے کی خاص ہدایت فرماتے ہیں:-

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم — فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

روحِ نادر کی زبان سے اپنی بات کہتے ہیں :-

سوختیم از گرمیٔ آواز تو
اے خوش آں قومے کہ داند راز تو

از غمِ تو ملّتِ ما آشناست
می شناسیم ایں نوا از کجاست

اے بآغوشِ سحابِ ما چو برق
روشن و تابندہ از نورِ تو شرق

یک زماں در کوہسارِ ما درخش
عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش

تا کجا در بندہا باشی اسیر
تو کلیمی راہِ سینائے بگیر

اقبال کی جہاں بیں نگاہیں جن اسرار کو فاش کرتی ہیں وہ اقوام و ملل کے لئے لائحۂ حیات ہیں :-

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں مَیں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں مَیں

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں مَیں

مَیں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

اک ولولۂ تازہ دیا مَیں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت سے ہیں خورسند

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تُو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

نظر آئے گا اُسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آگئی میسر مری شوخیٔ نظارہ

خاوراں از شعلۂ من روشن است — اے خنک مردے کہ در عصرِ من است

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

با مسلماناں غمے بخشیدہ ام — کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام

عشقِ من از زندگی دارد سراغ — عقل از صہبائے من روشن ایاغ

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی است — ز ما نگاہ طلب کیمیا چہ می جوئی

خدا سے دُعا کرتے ہیں :-

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست — یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

سیلم مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ — جولاں گہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا — با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گذاشتی — ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ

رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار — تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز
ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ

اے کہ من فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

با دلِ ما چہا کنی، تو کہ ببادۂ حیات — مستیِ شوق می دہی آب و گلِ پیالہ را

غنچۂ دل گرفته را از نفسم گره کشا　　تازه کن از نسیمِ من داغِ درونِ سینه را

از چمنِ تو رُسته‌ام قطرۂ شبنمے بہ بخش　　خاطرِ غنچه وا شود کم نشود ز جوئے تو

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز　　دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز
حکمت و فلسفه کردست گراں خیز مرا　　خضرِ من از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

تو بلوحِ سادۂ من همه مدعا نوشتی　　دگر آنچناں ادب کن که غلط نخواهم او را
بحضورِ تو اگر کس سخنے زمن سراید　　چه شود اگر نوازی به همیں که "دانم او را"

ایں دل که مرا دادی لبریز یقیں بادا　　ایں جامِ جہاں بینم روشن تر ازیں بادا
تلخے که فرو ریزد گردوں بسفالِ من　　در کامِ کہن رندے آں نہم شکریں بادا

من بسرودِ زندگی آتشِ او فزوده ام　　تو نمِ شبنمے بده لالۂ تشنه کام را

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

حق گوئی و راستبازی اقبال کا شیوہ ہے۔ صدقِ مقال میں وہ کسی سے خوف نہیں کھاتے:—

ہے میری بساط کیا جہاں میں | بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے | میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق | نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش | میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش | خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش | میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار | آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوقِ شکر خند

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک | مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے! | جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

اپنے شعر سے کہتے ہیں :-

ہے گِلہ مجھ کو تری لذّتِ پیدائی کا | تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش

شعلہ سے ٹوٹ کے مثلِ شررِ آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پُرسوز میں خلوت کی تلاش

اعلانِ حق کے جوش میں اقبال "سخن ہائے گفتنی" بھی کہہ گزرے :-

زبردنِ درگرشتم زدرونِ خانہ گفتم | سخنے نگفتنی را چہ قلندرانہ گفتم

درغزل اقبال احوالِ خودی را فاش گفت
زانکہ ایں نوکافر از آئینِ دیر آگاہ نیست

منکہ رمزِ شہر یاری با غلاماں گفتہ ام
بندۂ تقصیر وارم پیشِ سلطانم برید

بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت
بحیرتم کہ فقیہانِ شہر خاموش اند

لوگ اقبال کے کلام کو نہیں سمجھتے، اس کے اسرار کو نہیں پاتے، اور بے سبب اقبال کو موردِ طعن قرار دیتے ہیں:-

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

اقبال غزل خواں را کافر نتواں گفتن
سودا بد ماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

مگر اقبال اپنے نکتہ چینوں کے بھی شاکی نہیں ہیں:-

بُرا سمجھوں اُنہیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ مَیں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

اقبال کو کوئی محرمِ راز نہیں نظر آتا جو ان کا ہمنوا ہو:-

دریں میخانہ اے ساقی ندیدم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

من کہ دریاراں ندیدم محرمے
بر لبِ دریا بیا سودم دمے

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

مگر آخر میں آپ کو احساس تھا کہ آپ کی تعلیمات نے اثر کیا ہے، اور راز دار پیدا ہو چلے ہیں:۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گُل تیز تر — مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

چناں پیشِ حریمِ او کشیدم نغمۂ در دے — کہ دادم محرماں را لذّتِ سوزِ جدائی ہا

اقبال کو یقین تھا کہ ان کے وصال کے بعد ان کے اشعار حرزِ جاں بنائے جائیں گے:۔

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند — جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبال کا مزار بھی زیارت گاہِ عام و خاص بنا رہے گا:۔

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری — کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

اس عنوان اور اس کتاب کو علّامہ کی اس غزل پر ختم کرتا ہوں:۔

مثلِ شرر ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم — تن بہ تپیدن دہم بال پریدن دہم

سوز نوایم نگر ریزۂ الماس را — قطرۂ شبنم کنم خوئے چکیدن دہم

چوں ز مقامم بمود نغمۂ شیریں زنم — نیم شباں صبح را میلِ دمیدن دہم

یوسفِ گم گشتہ را باز کشودم نقاب — تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم

عشق شکیب آزما، خاک ز خود رفتہ را
چشمِ ترے داد و من لذّتِ دیدن دہم

بِسْمِ اللّٰهِ عَلِيْمِ الْغُيُوْبِ

۱۳۵۷ھ

مثنوی صلائے خودی

۱۳۵۷ھ

بہ تقلیدِ معانی اسرارِ خودی اقبال

۱۹۳۸ء

مع تحسینِ کلام و پیامِ عالم افروز اقبال

۱۳۵۷ھ

با تاریخ ہائے وصال

۱۳۵۷ھ

متاعِ کاسد از بے ہنر حامد حسن قادری

۱۳۵۷ھ

بر نظامی باد رحمت دمبدم — مثنوی را خواند قرآن عجم
من چہ گویم وصف آں روشن کتاب — "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

یہ مثنوی حضرت الحاج مولانا حامد حسن صاحب قادری، صدر شعبہ فارسی و اُردو سینٹ جانس کالج آگرہ نے میری فرمائش پر تصنیف کی تھی جس میں علامہ اقبال اور ان کے پیامِ خودی پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قادری صاحب نے اپنے قاعدے کے مطابق متعدد تاریخوں سے بھی اس کو مزین کیا ہے۔ تبرکاً پوری مثنوی مع عنوانات کے شامل کتاب ہے۔ قارئین لطف اندوز ہوں۔

جانِ قرآں در تن آں مثنوی است | معنی وحی است و لفظِ مولوی است
لیک از دورِ زمانِ بے ثبات | شد دگرگوں نظم بزمِ کائنات
چوں بقرنِ بستم آمد دورِ جام | میکشاں گشتند زاں مے تلخ کام
شد جہاں آبستنِ اقوامِ نو | ساقیٔ نو۔ بادۂ نو۔ جامِ نو
شرع و دیں، علم و عمل تغییر یافت | رنگ دیگرگوں کہن تصویر یافت
در سرشت آں آب نے ہم آں گِل نماند | آں سر و سودا و درد و دل نماند
ہم زمیں ہم آسمانے شد دگر | ایں جہاں گویا جہانے شد دگر

لاجرم نازل بشد الہامِ نو
بہرِ نو اقوام ایں ایّامِ نو

آمد اقبال و پیالے داد نو | بزمِ کہنہ را نظامے داد نو
بہ بنشہ آں کش چشمِ دل بینا بود | نشۂ آں مے کہ در مینا بود
دیدِ مسلم را کہ چہرش زرد شد | شد دلِ او ساکن و تن سرد شد
کارِ اصلاحش کجا آساں بود | جانِ میدن در تنِ بے جاں بود
آں ز گرمیٔ نفس اقبال کرد | آنچہ نتواں کرد کس اقبال کرد
آنچہ از رازی و غزالی نشد | آنچہ از سرسیّد و حالی نشد
کرد اقبال آنچہ از غالب نشد | آنچہ از عرفی و از طالب نشد
آنچہ از ایراں نشد از ہند شد | آنچہ از ملّا نشد از رند شد

لہ ماخوذ از شعر اقبال:-

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ | در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

آنچہ رومی گفت ہم اقبال گفت   لیک حسبِ حالِ عصرِ حال گفت
آنچہ نتواں گفت رومی گفت او   نو گہر در رشتۂ نو سفت او
آشکارا کرد اعجازِ خودی   مہر بشکست از خمِ رازِ خودی
گفت خود ہستی ز آثارِ خودی است   بے خبر مُسلم ز اسرارِ خودی است
ہست در مانے ملے بیمار نیست   وادرِ میخانۂ و میخوار نیست
آں مئے مرد افگن لشکر شکن   گشت[1] از قحطِ خریداری کہن

ایں کہ داد اقبال پیغامِ خودی
داد سرِّ وحی را نامِ خودی

نیست آں چیزے بجز تعیینِ ذات   یعنی احساسِ شرف بر کائنات
تا نسنجد پایۂ خود آدمی   تا نداند مایۂ خود آدمی
"احسنِ تقویم" خود را تا نہ دید   بر فلک تقدیمِ خود را تا نہ دید
تا نہ خود را از ملاک برتر نہاد   لامکاں را تا نہ زیرِ پر نہاد
تا نہ خود را داشت محکم تر ز کوہ   در شکوہ افزوں ز بحرِ پُر شکوہ
تا نہ روشن تر ز مہر و ماہ شُد   تا نہ از نورِ دلش آگاہ شُد
تا نہ خود را داند افضل از ہمہ   ویں[2] ہمہ را از دمِ خود دمدمہ

---

[1] غالب کے اس مصرعے سے ماخوذ ہے: "ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن"۔ پہلے مصرعے میں "مئے مرد افگن" بھی غالب ہی کی ترکیب ہے۔

[2] میں نے دانستہ یہ فارسی محاورہ، اردو محاورے "دم کا دمدمہ" سے اختراع کیا ہے۔ غالب نے بھی ایک اُردو کا محاورہ "تمہاری گرہ سے کیا جاتا ہے" فارسی میں ترجمہ کرکے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

گر تو مبادہ ز شکن طرہ مغول شود   دل ز آں تست از گرہ ما چہ می رود

کے شود ہستی او مقصود کن — کے شود مصداقِ اِنّی جاعلٌ
ماحیِ معبودِ باطل کے شود — حامیِ توحیدِ کامل کے شود
گہ پرستارِ مظاہر می شود — گاہ محکومِ عناصر می شود
چوں نداند عزّ و شانِ خویش را — بندہ گردد بندگانِ خویش را
آنکہ مہر از نورِ او بنمود چہر — ذرّہ داند خویشتن را پیشِ مہر
آنکہ دریا با وجودِ شوکتش — قطرہ باشد ز بہرِ ہمتش
من چہ گویم آں غلط اندیش را — قطرہ ہم می نداند خویش را
می وزد بادے دلش لرزاں شود — آید آبے دامنش ترزاں شود

چوں ہوائے او الٰہِ او بود[۱]
سخت کوتہ بیں نگاہِ او بود

می پرستد آنچہ اندر عالم است — دور تر از چشم و بالاتر ز دست
در پرستاری ازیں ہم بگذرد — جامۂ عقلش بدستِ خود درد
ترک گوید دانش و فرہنگ را — خود تراشد خود پرستد سنگ را
انجم و اشجار معبودِ ویند — آتش و ہم آب مسجودِ ویند
زن، زمیں، از زر، و ہم آسماں ویند — ہم دل و جاں بیخِ ایمانِ ویند
ملک و رنگ و خوں خداوندانِ او — از شمار افزوں خداوندانِ او

---

۱ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (کیا تم نے اس پر نظر کی جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔) سورۂ فرقان ۔ پارہ ۱۹، رکوع ۴۔

رفت از یادش چو پیمانِ الست
از شرابِ حبِّ باطل گشت مست

چوں خودی خویش را از دست داد — جیبِ دامانش بدستِ مست داد
دستِ باطل دامنِ حق چاک کرد — نورِ باطن را نہاں در خاک کرد
گشت چوں عرفانِ نفس از وے حجاب — رفت از دل ہم خودی وہم خدا

پس خودی چیزے بجز توحید نیست
دین و دُنیا را بجز ایں تمہید نیست

ہست تعیینِ خودی اعلانِ حق — یاد دار اعلانِ آں جانانِ حقؓ
نعرہ[1] چوں آں سرکشے رہ گردہ گم — زد لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَكُمْ
قَالَ لِلْفَارُوْقِ وحیٔ اللہ قُمْ — قُلْ لَنَا الْمَوْلٰی وَلَا مَوْلٰی لَكُمْ
لیکن ایں اعلائے حق آید بروں — زاں کہ پُر از ذوقِ حق گشتش دروں
گم چو شد فرقِ حق و باطل ازو — در دلِ او نے اَنَا ماند نہ ھُوْ
کے خدا ماند خودی شد گر فنا — از اَنَا ھُوْ است وہم از ھُوْ اَنَا

ایں پیامِ حق کہ سرِ اقبال داد
قوم را بارِ دگر اقبال داد

---

[1] جنگ احد میں لشکر کفار سے نعرہ بلند ہوا۔ لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَكُمْ (ہمارا مددگار عزّیٰ بُت ہے۔ تمہارے پاس کوئی عزّیٰ نہیں) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نعرہ سُن کر صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا ”کوئی شخص پکار دو: اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَكُمْ (اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں) تم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فوراً اُٹھ کر یہ نعرہ بلند کر دیا۔

گرچہ بسیار اند دیں را رہبراں — نیست ایں سر در حدیث دیگراں
گرچہ بسیار اند استادان شعر — بر نیامد ایں گہر از کان شعر
ایں نمی آید ز حرف دیگراں — ایں نمی گنجد بہ ظرف دیگراں
ہر دل و جاں قابل ایں درد نیست — کنز مخفی گنج یاد آورد نیست

بود راسخ حب حق در روح او
باد رحمت ہائے حق بر روح او

باد رحمت ہائے حق بر تربتش — آمد "المغفور" سال رحلتش
۱۳۵۷ھ

ہم[1] ز روئے داد در وحی کریم — گفت ہاتف عندہٗ اجرٌ عظیم
۴+۱۳۵۳=۱۳۵۷ھ

سال دیگر ہم ز قرآن مبین
گفت حامد لذۃ للشاربین
۱۳۵۷ھ

---

[1] روئے داد سے اشارہ کر کے (داد) کے حرف اوّل (د) دال کے چار عدد کا تعمیہ کیا گیا ہے۔